ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157 جلد:۷- شمارہ:۴ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵ء

سابق یو جی سی کیر لسٹیڈ بین الاقوامی پیر ریویوڈ ریفریڈ جرنل

سہ ماہی ——— دہلی

# تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا علمی، ادبی اور تحقیقی ترجمان

جلد: 7

شمارہ: ۴

اکتوبر تا دسمبر

۲۰۲۵

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

UGC Care Listed
International Peer Raviewed Refreed Journal

سہ ماہی دہلی

# تاریخ ادب اردو

(علم وادب اور تحقیق وتنقید کا ترجمان)

جلد: ۷ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵ء شمارہ: ۴

**مدیر**

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

**نائب مدیر**

محمد رمیض مصباحی

ریسرچ اسکالر: شعبہ اردو کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

**مینیجنگ ایڈیٹر:** ڈاکٹر محمد طالب

**ایسوسی ایٹ ایڈیٹر:** ڈاکٹر محمد بہلول

**تکنیکی وفنی معاون مدیر:** محمد شاہد رضا مصباحی

خط وکتابت / ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو، ۲۴۹۶/دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

2496 -,2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-110007

E-mail: editortau@gmail.com website: tareekheadabeurdu.com

Mobile No:+91-9968244001

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر / وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر / اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ "تاریخ ادب اردو" سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہو گا۔

## سرپرست اعلیٰ

پروفیسر ارتضیٰ کریم

پروفیسر راکیش کمار پانڈے

شعبہ علم طبیعات، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

## مجلسِ ادارت

| نام | تفصیل |
|---|---|
| پروفیسر ندیم احمد | شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی |
| پروفیسر محمد کاظم | شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی |
| پروفیسر ڈاکٹر احمد امتیاز | شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی |
| ڈاکٹر محمد محسن | شعبہ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی |
| پروفیسر محمد رضی الرحمن | صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور |
| پروفیسر محمد علی جوہر | شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ |
| پروفیسر محمد قمر الہدی فریدی | شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ |
| پروفیسر کوثر مظہری | شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی |
| پروفیسر عمران عندلیب | شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی |
| پروفیسر عذرا عابدی | شعبہ سماجیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی |
| ڈاکٹر سجاد احمد | شعبہ تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی |
| پروفیسر ڈاکٹر مشتاق عالم قادری | شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی |
| پروفیسر ڈاکٹر سیف الدین احمد | شعبہ تاریخ، دہلی یونیورسٹی، دہلی |
| پروفیسر ڈاکٹر بلرام شکلا | شعبہ سنسکرت، دہلی یونیورسٹی، دہلی |

| نام | تفصیل |
|---|---|
| پروفیسر آفتاب احمد آفاقی | شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس |
| پروفیسر ڈاکٹر شاہد رزمی | صدر شعبہ اردو، مونگیر یونیورسٹی، بہار |
| پروفیسر پرمود کمار بھارتی | شعبہ سنسکرت، میونسپل پی جی کالج، مسوری، اتراکھنڈ |
| ڈاکٹر قاضی نوید | صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، اورنگ آباد، مہاراشٹر |
| جناب قیصر رضا | ایجوکیشن آفیسر، حکومتِ جھارکھنڈ |
| محمد رفیع | ریاستی کنوینر، قومی اساتذہ تنظیم، بہار |
| مولانا محمد شاہد عادل قاسمی | پرنسپل، مدرسہ یتیم خانہ، اراریہ |
| ڈاکٹر مجیب احمد خان | کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی |
| ڈاکٹر ندیم احمد | کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی |
| ڈاکٹر عابد قریشی | شعبۂ اردو غازی یونیورسٹی، غازی خان |
| ڈاکٹر محمد سید علی | شعبۂ اردو غازی یونیورسٹی، غازی خان |
| پروفیسر ڈاکٹر عظمت رباب | شعبۂ اردو، فارویمن یونیورسٹی |
| پروفیسر ڈاکٹر فضیلت بانو | منہاج یونیورسٹی |
| پروفیسر ڈاکٹر شذرہ حسین شر | چیرپرسن، شعبۂ اردو جامعہ سندھ |

مجلس مشاورت

اندرون ملک

- پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود

دہلی یونیورسٹی / دہلی سے وابستہ شخصیات

- ڈاکٹر فیاض عالم
- شکیبہ عمر

پٹنہ یونیورسٹی (Patna University)

- ڈاکٹر محمد محمود عالم — شعبۂ فارسی
- ڈاکٹر محمد ابوالکلام آزاد — شعبۂ فارسی

جامعہ ملیہ اسلامیہ (Jamia Millia Islamia, Delhi)

- پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی

اراریا

- دین رضا اختر
- ڈاکٹر محمد شہزاد شمس

مونگیر(Munger)

- ڈاکٹر زین شمسی

پورنیہ(Purnea)

- محمد مولانا رضوان ندوی

امراوتی، مہاراشٹر (Amravati, Maharashtra)

- وسیم فرحت علیگ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی(AMU, Aligarh)

- پروفیسر جہانگیر احمد وارثی

لکھنؤ یونیورسٹی(Lucknow University)

- پروفیسر عباس رضانیر

کولکاتہ(Kolkata)

- ڈاکٹر نوشاد مومن

الہ آباد(Allahabad)

- ڈاکٹر دانش الہ آبادی

مظفر پور(Muzaffarpur)

- پروفیسر آلِ ظفر

## بیرون ملک

- ڈاکٹر ماجد مشتاق
- ڈاکٹر عبد العزیز ملک—شعبہ اردو
- ڈاکٹر سمیرا اکبر—شعبہ اردو

یونیورسٹی آف سرگودھا

- پروفیسر ڈاکٹر عامر سہیل—چیئرمین شعبہ اردو
- ڈاکٹر سمیرا اعجاز—شعبہ اردو

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز(NUML)، اسلام آباد

- پروفیسر ڈاکٹر عابد سیال—شعبہ اردو
- پروفیسر ڈاکٹر عنبرین تبسم
- پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم
- ڈاکٹر صائمہ نذیر—اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

- ڈاکٹر غزل یعقوب—شعبہ اردو

وفاقی اردو یونیورسٹی آف آرٹس، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد

- ڈاکٹر فہمیدہ تبسم—سربراہ شعبہ اردو
- پروفیسر ڈاکٹر وسیم انجم—شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

- پروفیسر ڈاکٹر صدف نقوی—سربراہ شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

- پروفیسر ڈاکٹر طارق محمود
- پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد
- پروفیسر ڈاکٹر پروین اختر کلو

- پروفیسر ضیاء الحسن
- ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی
- پروفیسر ثمینہ گُل
- عظمیٰ نورین
- ڈاکٹر ریحانہ کوثر—پاکستان
- فرزانہ اعظم لطفی
- عائشہ مسعود—صحافی، اسلام آباد

TR ترکی

- پروفیسر حلیل طوقار
- پروفیسر دُرمُش بلگر
- ڈاکٹر ذکائی کارداس—استنبول، ترکی

IR ایران

- ڈاکٹر محمد کیومرثی—تہران، ایران
- ڈاکٹر علی بیات

EG مصر

- پروفیسر احمد القاضی—مصر
- ڈاکٹر ہاجر قدری محمد—شعبہ اردو زبان و ادب، کالج آف ہیومینیٹیز، الازہر یونیورسٹی، قاہرہ

- ڈاکٹر ثمینہ صدیقی
- ڈاکٹر صوبیہ سلیم
- ڈاکٹر نازیہ ملک

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

- پروفیسر ڈاکٹر فرزانہ کوکب—چیئرپرسن شعبہ اردو
- ڈاکٹر محمد خاور نوازش
- ڈاکٹر محمد آصف
- ڈاکٹر شازیہ امبرین
- ڈاکٹر حمادر سول

ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

- پروفیسر ڈاکٹر نذر عابد—چیئرمین شعبہ اردو

جامعہ پشاور

- پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین—شعبہ اردو

اردو سائنس بورڈ، لاہور

- پروفیسر ڈاکٹر ناصر عباس نیئر—ڈائریکٹر جنرل اردو

دیگر ممتاز پاکستانی اہلِ علم

- پروفیسر یوسف خشک
- پروفیسر صوفیہ خشک

# قانونی مشیر

ایڈوکیٹ انیل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ (دہلی)

## زر تعاون

فی شمارہ:۱۰۰۰(ایک ہزار)روپئے خصوصی شمارہ:۳۰۰۰(تین ہزار) روپئے

سالانہ:(۱۵۰۰۰پندرہ ہزار)روپئے خصوصی تعاون:۲۵۰۰۰(پچیس ہزار)روپئے

**Bank Details:**

**PEACE INDIA FOUNDATION**

Account No. — **51521131001918**

IFSC Code — **PUNB515210**

**مالک، طابع وناشر: پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا** نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر "تاریخ ادب اردو"

۲۴۹۶/دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

# مشمولات


| نمبر شمار | عنوان | مقالہ نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| | اداریہ | پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا | 3 |
| 1 | سہیل عظیم آبادی کا افسانہ "الاؤ:" ایک جائزہ | ڈاکٹر محمد محسن | 5 |
| 2 | ڈنمارک میں اُردو زبان وادب: ایک طائرانہ نظر | محمد شعیب اسلم, ڈاکٹر فضیلت بانو | 16 |
| 3 | تاریخِ ادبِ اردو کا ایک تنقیدی مطالعہ | رمیض مصباحی، پروفیسر محمد یحییٰ صبا | 31 |
| 4 | تعلیم کی زبان یا زبان کی تعلیم؟------ | ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر پروین کمار سرجن | 38 |
| 5 | فارسی اور اردو مخطوطہ شناسی کے مسائل اور ان کا حل | ڈاکٹر نیلوفر حفیظ | 48 |
| 6 | منشی پریم چند کا افسانہ "نمک کا داروغہ" تاریخ کے پس منظر میں | ڈاکٹر محمد محسن | 102 |
| 7 | برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح اور فکری بیداری میں حالی کا کردار | محمد حبیب اللہ مسکان | 115 |
| 8 | خانقاہ شیخو شریف کی ادبی خدمات کا جائزہ | محمد ریاض القادری، ڈاکٹر شبیر احمد قادری | 135 |
| 9 | عہدِ حاضر میں سرزمینِ مدھیہ پردیش کے غزل گو شعراء: ایک جائزہ | عصمت خاتون | 168 |
| 10 | اردو غزل میں شاعر بطور ایک رومانی اجنبی | ڈاکٹر محمد سلیم | 189 |
| 11 | مجموعہ فصیلیں از انیس ناگی: علامتی و استعاراتی مطالعہ | ڈاکٹر فضیلت بانو ، پروفیسر ڈاکٹر حمیرا اشفاق | 200 |
| 12 | .....From Tradition to Transformation | Dr. Sajjad Ahmad | 210 |
| 13 | Cultural Mosaic of Awadh and Ratan Nath Sarshar | Muqeem Ullah Khan | 221 |
| 14 | .....Fostering Values and Inner Peace in | Professor Susmita Lakhyani | 227 |
| 15 | ..Dr. Ambedkar's Contribution to the Making | Sita Kumari (PhD Scholar) | 244 |
| 16 | .....Understanding School Choice: How Parents | Dr. Geeta Rai | 265 |
| 17 | ....Satire and Social Critique in Urdu Cinema: | Dr. Harshita Nogia | 281 |
| 18 | ...Mind Matters: Mental Health Literacy as a Pathway | Arman Fatma | 321 |
| 19 | Mahatma Gandhi National Rural Employment | Dr. Vishav Jyoti | 331 |
| 20 | Raj Darbhanga and the National Movement | Dr. Ajeet Kumar | 376 |
| 21 | Intoxication as sin and pleasure | Sumit Kumar | 388 |
| 22 | आज़ाद हिन्द फौज (आई.एन.ए.) और सुभाष चंद्र बोस | अजय कुमार | 400 |

# اداریہ

قارئینِ کرام!

تاریخ و ادب اردو کا تازہ شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ ہماری حقیر سی اللہ کا انوشن معوقی ہے کہ اس عالمی ادبی و تحقیقی سہ ماہی رسالے کی معیاری سطح کو مزید بہتر کیا جائے۔ اس میں قارئین کی قیمتی تجاویز اور تنقید یکساں ہماری کوشش کو مہمیز کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اپنی رائے، خطوط، ای میل، واٹس ایپ وغیرہ مؤدبانہ ذرائع سے ارسال کرتے رہیں۔

زیرِ نظر شمارہ ناول، شاعری، تنقید، تصوف، تعلیم، آزادئ نسواں، مدرسہ تعلیم اور روزبان وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے، جو قارئین کے لیے اس شمارہ کو خاص بناتا ہے۔

تاریخ ادبِ اردو ایک ادبی اور تحقیقی جرنل ہے، اس میں مختلف علوم و فنون پر مبنی تحریریں شامل کی جاتی ہیں، جو تحقیق پر مبنی، معلومات سے بھرپور اور فکری گہرائی کی حامل ہوتی ہیں، اس میں شامل تمام موضوعات تحقیقی عمق، معلوماتی وسعت اور فکری بالیدگی کے متحمل ہیں، جو قارئین کو اردو دنیا میں وقوع پذیر تغیرات اور ابھرتے ہوئے نئے رجحانات سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ قدیم اور کلاسیکی ادب کی روایت و معنویت سے بھی باخبر رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں نو وارد تحقیق، تلاش و جستجو اور حالیہ طریقہ کار کو فروغ دینا بھی اس جرنل کا مقصد ہے۔ اس جرنل میں تحقیقی و تجزیاتی مضامین، تراجم اور کتابوں پر تبصرے بھی شایع کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آرٹ، بشریات، ثقافتی علوم، فلم و میڈیا، اسٹڈیز، تاریخ، زبان، ادب، فلسفہ اور مذہبی علوم جیسے بین العلومی موضوعات پر مبنی مضامین کو بھی اس میں جگہ دی جاتی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو اُردو زبان کا ایک معیاری اور ادبی جرنل ہے۔ جس کے تحت فن و ادب کی گوناگوں اصناف، جیسے شاعری، افسانہ نگاری، مضمون نویسی، تحقیق، تنقید اور تبصرہ وغیرہ کو شائع کیا جاتا ہے۔

رسالہ "تاریخِ ادبِ اردو" کی امتیازی خصوصیت اس میں شامل تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا اعلیٰ معیار ہے، جو اس کے بانی مدیر پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی معلم کڑوری مل کالج کی انتھک محنت، گہری توجہ اور خلوصِ عمل کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے موصول ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین میں سے انتخاب کے وقت صرف معیار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ نگارشات کا غیر مطبوعہ ہونا اس لیے ضروری ہے تاکہ ایک ہی تحریر کی دوبارہ اشاعت سے بچا جاسکے۔ قلمکار کا تعلق خواہ کسی بھی جگہ سے ہو، قلمکار معروف ہو یا نووارد، اِس سے بالاتر ہو کر مضامین کی اشاعت کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

تاریخ ادبِ اردو ان جرنلز میں شامل ہے، جو عالمی ادب کو اعلیٰ معیار کے ساتھ اردو زبان میں پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور محنتی اسکالرز کو اپنے خیالات اور افکار کے اظہار کے لیے وسیع پیمانے پر پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ اس لیے سنجیدہ اسکالرز اور نئے قلمکاروں سے التماس ہے کہ غیر مطبوعہ نگارشات ارسال فرما کر "تاریخ ادبِ اردو" کو مزید معیاری بنائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

***

# سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''الاؤ'':ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد محسن
کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

## ملخص

زیرِ نظر مضمون بعنوان ''سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''الاؤ'':ایک جائزہ ہے۔یہ افسانہ ایک دیہی وزرعی مفلس، کمزور، مزدور طبقے کے دکھ ودرد کے جہات کا ہمہ گیر مطالعہ پیش کرتا ہے۔اس افسانے کا مقصد اردو ادب میں فکری رجحانات اور تخلیقی خصوصیات کا منظم انداز میں بیان کرنا ہے۔ مقالے کی ابتدا سہیل عظیم آبادی کی شخصیت وفن کے تعارف پر مشتمل ہے، جس میں سوانحی پس منظر، تعلیمی سفر، تدریسی خدمات، ادبی سرگرمیوں اور مطبوعات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور آخری ودوسرے حصے میں افسانے کا تجزیاتی مطالعہ اور خلاصہ اسلوب بیانی کے ساتھ خوبصورت لہجے میں پیش کیا گیا ہے۔

**کلیدی الفاظ:** سہیل عظیم آباد افسانہ الاؤ میدان پھگوا دلّو تہذیب ساتھی پٹنہ

اردو ادب کے دنیا کی نامور شخصیت سہیل عظیم آبادی کا اصل نام ''سید مجیب الرحمٰن'' اور صغر سنی کا اسم ''سید قادر حسین'' تھا۔ سہیل عظیم آبادی کا خاندان ایک اعلیٰ و معتبر ''سید'' خانوادے میں شمار کیا جاتا تھا، سید خاندان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل سے چلا آرہا ہے۔ جسے اسلامی نقطۂ نظر میں سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ سید مجیب الرحمٰن

شعر وادب کی دنیا میں ''سہیل عظیم آبادی'' کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔ چونکہ انھوں نے اپنی ادبی و تخلیقی زندگی کا آغاز فن ''شاعری'' کے صنف سے کیا تھا۔ اور ان کا تخلص ''سہیل'' تھا۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا پس یہ شعر وشاعری کا درخشاں و تابندہ ستارہ کچھ دنوں کے بعد ہی اردو ادب کے آفاقی شاعر جمیل مظہری کی ایماواشارے پر جلد ہی اردو فکشن کی طرف مائل ہو گئے، بعدہٗ وہ ہمیشہ ہمیشگی کے لیے فکشن کے ہو کر رہ گئے۔

اردو فکشن کے عظیم علم بردار سہیل عظیم آبادی کی ولادت ۱۹۱۱ء کو پٹنہ سٹی کے ایک زمیندار اور علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ لیکن ان کا آبائی گاؤں کا نام شاہ پور، بھدول، ضلع پٹنہ، ریاست بہار میں واقع ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی بد قسمتی یہ رہی کہ صرف ایک سال کی مدت میں ہی ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے ماں کی الفت ومحبت سے محروم ہو گئے۔ سہیل عظیم آبادی کی ماں کی وفات کے بعد ان کی ایامِ طفلی کی زندگی نانیہال میں گزری۔ نانیہال کے گاؤں کا نام سلیم پور ضلع گیا (بہار) میں ہے۔ جہاں ان کی پرداخت وپرورش خاص توجہ کے ساتھ تکمیل کو پہنچی اور نانیہال میں ہی ابتدائی تعلیم ایک مدرس کی نگرانی میں ہوئی۔ سہیل عظیم آبادی ابتدائی مرحلہ طے کرنے کے بعد حصول علم کی غرض سے پٹنہ تشریف لے گئے۔ یہاں پروان چڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے مظفر پور کے مشہور ''لنگرٹ سنگھ کالج'' میں داخلہ لیا۔ یہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آگے کی تعلیم جاری وساری رکھنے کے لیے وہ کلکتہ قیام پذیر ہوئے۔ کلک ازل کا مقصد کچھ اور ہی تھا کیونکہ علم الحساب میں کم نمبر ہونے کے سبب کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ہو سکا۔ کلکتہ میں قیام کے دوران انھوں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور ایک روزنامہ اخبار ''ہمدرد'' میں ایک اہم رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیے۔ علاوہ ازیں وہاں کے مختلف رسائل وجرائد سے منسلک رہے۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے شہر حیدرآباد (دکن) کا بھی سفر کیا۔ حیدرآباد میں ان کی وابستگی ہمیشہ اردو تحریک اور علمی فروغ کے حوالے سے رہی ہے۔ انھوں نے وہاں اردو کے مشہور ومعروف ناقد ومحقق نامور عالم مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کی سرپرستی میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں منہمک رہے۔ ان کی یہ خدمات حیدرآباد کے علمی وادبی ماحول سے متاثر تھی جہاں اردو زبان وادب کو خاص اہمیت حاصل تھی

۔ سہیل عظیم آبادی کو ان کی ادبی و تحریکی خدمات کی بنا پر حیدرآباد کے علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا لیکن جو شہرت و مقبولیت ان کو ریاست بہار سے حاصل ہوئی وہ کسی اور شہر سے نہیں ملی۔

سہیل عظیم آبادی پیشہ وارانہ زندگی کے دوران ایک مدت تک وہ چھوٹا ناگ پور میں بھی آباد رہے۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے متاثر تھے جس وجہ سے انھوں نے وہاں اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے انتھک کام کرتے رہے، اسی اثنا میں انھوں نے معاشرتی بے راہ روی پر کافی کچھ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ سہیل عظیم آبادی چھوٹا ناگپور میں تقریباً ۷ سال تک مقیم رہے اور وہاں انھوں نے اخبار اور رسائل و جرائد میں متعدد مقالے تحریر فرمائے اور کئی طبع زاد تصانیف بھی شائع ہوئیں۔

صحافت کی دنیا میں بھی سہیل عظیم آبادی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے ادب اور ثقافت کے فروغ کے لیے رسالہ ''تہذیب'' کی ابتدا پٹنہ سے کی، یہ ایک ماہنامہ جریدہ تھا اور اس کے علاوہ انھوں نے ایک روزنامہ اخبار ''ساتھی'' جاری کیا۔ ان کا یہ رسالہ اور اخبار اشاعت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کی ترقی، معاشرے کی اصلاح اور قوم کی فلاح و بہبودی ہو سکے۔ جن میں ہر طرح کے مضامین شائع کرتے تھے۔ وہ ہمہ وقت اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو ادبی اور ثقافتی زندگی کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان سرگرمیوں کے علاوہ سہیل عظیم آبادی ''آل انڈیا ریڈیو'' میں سرکاری ملازم تھے۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے دہلی اور سری نگر میں بھی اپنی زندگی کے اہم اوقات بسر کیے۔ لیکن انھیں یہ نوکری راس نہیں آئی کچھ عرصے کے بعد استعفیٰ دے کر ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پٹنہ واپس چلے آئے۔ انہوں نے تاحیات پٹنہ میں ہی رہ کر اپنی ادبی زندگی کو پوری لگن کے ساتھ جاری وساری رکھا۔ بالآخر اردو افسانہ کا روشن و منور مینار ۱۹۸۰ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

بہار کی تاریخ میں سہیل عظیم آبادی ادب کے وہ روشن چراغ ہیں جنہوں نے ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگوں سے بڑی جوش و خروش سے ملتے اور ان کے باریک مسائل پر غور و فکر کرتے تھے۔ اس عہد میں خاص طور پر بہار میں اونچ نیچ، بھید بھاؤ، امیری غریبی اور زمیندار مزدور کے مابین تعصب زوروں پر تھا لیکن سہیل عظیم آبادی کافی اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ وہ میل جول رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کے اہل خانہ ایام طفلی میں انھیں غریب و مفلس کے

بچوں کے ساتھ کھیل کود اور ان سے دوری اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ پھر بھی وہ اس کے برعکس چلا کرتے تھے اور مستقبل میں انھوں نے زمیندارانہ نظام کے ذریعے جو غریب لوگوں کا استحصال کیا جاتا تھا اس نظام کے سخت مخالف رہے۔ سہیل عظیم آبادی بچپن سے سماج کی تلخیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے افسانوی وادبی دنیا میں قدم رکھا تو سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کو اپنی تحریر کے ذریعے نشانہ بنایا۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اپنے افسانوں میں شہر کی انسانی زندگی کو جگہ دی وہیں دوسری جانب دیہات کے معاشرتی زندگی، کسان ومزدور اور متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی کو اپنے افسانوں میں بھرپور جگہ دی۔ اس طرح ان کے یہاں شہر اور دیہات کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔

اردو افسانے کی روایت میں منشی پریم چند کا ایک بڑا نام ہے، انھوں نے جس دیہی ورزعی روایت کو جنم دیا تھا اسی روایت سے بے حد متاثر ہو کر سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانہ نگاری کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ زندگی بھر اس روایت کے داعی وحامل رہے۔ اس کے علاوہ سہیل عظیم آبادی جس قلم کار سے مرعوب ہیں، ان میں سدرشن، علی عباس حسینی اور بیرون ملک کے فکشن نگار ٹالسٹائی، موپاساں اور چیخوف وغیرہ اہم ہیں۔

معلوم ہوتا ہے سہیل عظیم آبادی میر امن کے آفاقی شہرت یافتہ تخلیق داستان ''باغ وبہار'' سے بے حد متاثر تھے، اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں کی زبان وبیان کو نہایت سادہ وسلیس اور عام فہم رکھی۔ اس طرح انہوں نے عام انسانوں کی بول چال کی زبان کو ہی اپنے تخلیقی ادب میں نہایت ہی فنکارانہ انداز سے جگہ دی جو ان کے فنی محاسن کی بہترین وعمدہ مثال ہے۔

اردو افسانہ کے اہم معمار کرشن چندر سہیل عظیم آبادی کی زبان وبیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سہیل کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے، مصنوعی اور غیر فطری مکالمے کہیں نہیں ہیں، بہاری گاؤں اور اس کے افراد کی تصویر اس فنی صناعی اور چابکدستی سے کھینچتے ہیں کہ افسانے کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے بہت پرہیز کرتے ہیں اپنی تحریرات میں کم گو لیکن پُر گو ہیں۔ بہت کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اسے اُن کے انداز تحریر کا اعجاز سمجھنا چاہئے۔''

(الاؤ۔ مرتب مصطفیٰ کمال پاشا۔ صفحہ ۹۔۱۰ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

ہمارے معاشرے کا دستور و چلن رہا ہے کہ اکابرین نے آنے والی نئی نسلوں کو اپنی تحریروں کی روشنی میں وعظ و نصیحت کرتے آئے ہیں۔ اسی راہ وروش پر پس پردہ چلتے ہوئے سہیل عظیم آبادی نے بھی اپنے افسانوں کے ذریعے سماج و معاشرے کو ایک اخلاقی وانسانی پند و نصائح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو فکشن کی دنیا میں سہیل عظیم آبادی ایک ممتاز افسانہ نگار رہے ہیں۔ البتہ افسانے کی دنیا میں جس طرح منشی پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کے زمانے کو عہدِ زریں دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کی عظمت کو تا اردو دنیا یاد رکھا جائے گا۔

سہیل عظیم آبادی ترقی پسند تحریک سے ایک گہری وابستگی رکھتے تھے، ان کے تمام افسانہ اور ناول ان ہی نظریے کے زیر سایہ مزین ہیں۔ ''بے جڑ کے پودے'' ان کا ایک مشہور ناول ہے جسے ادبی حلقوں میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک اور ناول ''دھوپ چھاؤں'' ہے جو ان کی زندگی میں تو طبع نہیں ہو سکا، یہ ناول ایک طویل مدت تک غیر مطبوعہ مسودہ کی شکل میں موجود تھا لیکن تحقیق اور دریافت کے بعد یہ ناول جنوری ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آیا۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کلکتہ سے کیا اور ان کا افسانہ ''سحر نغمہ'' جو ایک ہفت روزہ اخبار ''اداکار'' میں شائع ہوا تھا۔ ان کے کل چار اردو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں ''چار چہرے ''(۱۹۳۴ء)، ''الاؤ''(۱۹۴۲ء)، ''نئے پرانے''(۱۹۴۴ء) اور ''آدمی کے روپ''(۱۹۷۴ء) ہیں۔ بہر کیف انھوں نے کل ۱۲۵ افسانے تحریر فرمائے۔

زیر بحث سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''الاؤ'' ہے جو ان کا سب سے مشہور افسانہ ہے جسے پریم چند کے افسانہ ''پوس کی رات'' کے طرز پر لکھا گیا تھا اس افسانے میں ''پوس کی رات'' کی طرح ہی گاؤں اور دیہات کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل و معاملات نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں کھیت کھلیان اور کسان و مزدور کی بے کسی ولاچاری کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کردار کا نام بھی جو گاؤں میں اکثر و بیشتر استعمال ہوتے ہیں اسی نام کو افسانہ الاؤ میں بھی لیا گیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''الاؤ'' ان کی تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا افسانہ ہے۔ افسانے کا قصہ اس طرح ہے:

''الاؤ'' ایک علامتی اور فکری افسانہ ہے جس میں سماج کی بے رحمی، انسان کی تنہائی اور اونچ نیچ کے طبقاتی فرق کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں ''الاؤ'' صرف آگ کا نام نہیں بلکہ زندگی، امید، انسانی لگاؤ، جذباتی وابستگی اور اپنائیت کی پہچان ہے۔

افسانے کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ گاؤں سے دکھن میں ایک بڑا سا فیلڈ ہے وہ میدان ان لوگوں کے لیے سب کچھ تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں کسی بادشاہ یا راجہ کا محل تھا۔ میدان کے مشرق کی طرف پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں۔ اس کے بعد کھیت کھلیان ہے۔ اسی کے ارد گرد ایک پوکھر بھی ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رانی اور اس کی سہیلیاں اس میں نہایا کرتی تھیں جو اب بچوں کی تفریح کی جگہ بن گئی ہے۔

اب گاؤں میں صرف مزدور، کسان اور زمیندار رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے میدان ہی سب کچھ تھا بچوں کے کھیلنے کی جگہ، کسان کے اناج پھیلانے وسکھانے کا مسکن یہاں تک کہ گاؤں والوں کی ایک رہائش گاہ تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ بچے میدان میں کھیل رہے تھے، عورتیں اپنے کاموں میں مصروف تھیں اور پھگوا میدان کے ایک گوشے میں آگ جلایا تاکہ وہ اپنی لاٹھی سیدھی کرے، پھگوا کو یہ لاٹھی بہن کے گھر سے آتے وقت اس کے بہنوئی نے بسواڑی سے ایک لاٹھی کاٹ کر دیا، لاٹھی نہایت ہی مضبوط تھی لیکن نیچے سے تھوڑی ٹیڑھی تھی اسے آگ جلا کر سیدھا کر رہا تھا۔ گاؤں کے کچھ افراد ادھر سے آپڑے اور بولے اے پھگوا ابھی تو زیادہ سردی بھی نہیں ہے آگ کیوں جلائے ہوئے ہو! پھگوا نے بتایا کہ لاٹھی سیدھی کر رہا ہوں۔ یہ لوگ وہاں بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے ''الاؤ'' کے پاس لوگوں کا جماؤڑا ہو گیا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ چچا بولے آج کل کے لڑکے بہت بدمعاش ہو گئے ہیں اور اس حوالے سے چچا نے ایک قصہ بیان کیا۔ پھر ان میں کسی نے بولا کل کی بات ہے کلوا کی بیوی کا ریتو نے راستہ روک کر ہنسی مذاق کر رہا تھا کلوا کی بیوی نے ہاتھ میں لیے گھڑا سے پانی اڑیلنے کی دھمکی دی تو ریتو نے راستہ چھوڑا۔ سانول نے جواب دیا کہ چچا ریتو مذاق کر رہا ہو گا بھوجائی جو لگتی ہے۔ چچا نے بتایا کہ اگر کوئی اور دیکھتا تو بدنامی ہوتی اور طرح طرح کی باتیں نکل کر آتیں۔ اسی طرح گاؤں کے قصے کہانیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ بات بات میں پھگوا جو اپنی بہن کے یہاں سے ہو کر آیا تھا اس نے بتایا کہ پاس کے گاؤں میں لوگ سبھا کر رہے ہیں تاکہ وہ ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کر سکے اسی میں دلّو بیٹھا تھا جو کلکتہ میں قلی کا کام کر رہا تھا کل رات ہی گاؤں آیا تھا

۔ دلوّاحتجاج وغیرہ سے واقف تھا کیوں کہ وہ یہ سب کلکتہ میں دیکھ چکا تھا اور دلو گاؤں کے زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ دوران گفتگو طوفانی چچا حقہ لے کر آپڑے، چچا کے آتے ہی کچھ وقت کے لیے سناٹا پسر گیا۔ طوفانی چچا ٹھاٹ پاٹ سے بیٹھنے کے بعد دریافت کیا کہ تم لوگ چپ کیوں ہوگئے۔ پھر کسی نے پاس کے گاؤں دھرم پور کے احتجاج کا ذکر کیا طوفانی چچانے بڑے رعب کے ساتھ بولے یہ سب اوپر والے کی لکھی ہوئی قسمت ہے کہ وہ زمیندار پیدا ہوئے اور ہم کسان ومزدور یہ سن کر وہاں بیٹھے نوجوانوں میں جو تھوڑی، ہمت بن رہی تھی سرد پڑ گئی اب بھلا خدائی کارخانے میں تکرار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں بنتا۔ کچھ وقت کے بعد دلو ہمت کر کے بولا کہ ہم لوگ چاہے تو زمینداروں کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرسکتے ہیں پھر طوفانی چچا طنز کرتے ہوئے کہا کہ بھئی بچے ہو تم شہر سے آئے ہو گاؤں کے حال چال سے واقف نہیں ہو یہ کہہ کر طوفانی چچا الاؤ کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چل پڑے ساتھ ہی دو چار آدمی وہاں سے چلے گئے۔ لیکن دلو، سانول بھاگو اور کچھ نوجوان وہاں بنے رہے اور کافی دلچسپی لے رہے تھے ۔ سانول نے دلو سے مخاطب ہو کر کہا بھیا بتایئے آگے کیا کرنا ہے اور کب سے؟ دلو نے کہا سب سے پہلے سب اکٹھا ہو جائیں۔ وہاں موجود سارے نوجوان دلدادہ کے ساتھ اور خوب جوش کے ساتھ بولے ہم تیار ہیں۔ کسی کو آگے پیچھے کی پرواہ نہ تھی سب نے ہاں میں ہاں ملائی کافی بحث و تکرار کے بعد دلو نے رائے پیش کی کہ پٹواری جی کو رسید انہ نہ دیا جائے کیوں کہ وہ دباؤ ڈال کر گھی دودھ لے لیتے ہیں۔ آج سے بیگاری ختم یہ کہہ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ''الاؤ'' بجھ گئی۔ ان میں ایک نے کہا دلو بھیا پنڈت جی بولتے ہیں کہ تم لوگ خاموش رہو یہ سب ''کانگریس پارٹی کر دے گی۔ ان میں سے ایک اور نوجوان کو ہمت آئی اور وہ ماموں کے گھر سے ہو کر آیا تھا۔ وہ وہاں کانگریس پارٹی کی برائیاں سن چکا تھا۔ اس نے کہا دلّو بھیا۔ مولانا صاحب کہتے ہیں اتنے میں دلّو ذرا تیز آواز سے بولا دھت غریبوں کا کوئی بھی مسیحا نہیں ہوتا ہمیں یہ سب خود کرنا ہو گا۔ رات کافی گزر چکی تھی، ہوا بھی چل رہی تھی اور سردی کا موسم بھی تھا۔ دلّو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کی جانب نکل پڑے۔

کل ہو کر صبح سے ہر گلی کوچوں میں ان باتوں کا شور ہونے لگا، بڑے بزرگوں میں سنّاٹا پسرا ہوا تھا، بچے تماشا دیکھنے کے لیے خوش ہو رہے تھے اور نوجوان نئی صبح کی امید پر تھے لیکن اندر سے ڈرے ہوئے تھے کہ پتا نہیں پٹواری اور زمیندار کیا پیش قدمی کریں گے۔ شام ہوتے ہی کچھ نوجوان جمع ہوئے لیکن زیادہ تر کترا کے ڈرتے ہوئے نکل گئے

۔ مجمع اکٹھا کر کے سبھا کرنے والے بہت غصہ ہوئے اور کچھ کے گھر پر بھی گئے اور غصے میں کہا کہ تم سب کا حشر طوطا رام کی طرح ہی ہو گا، طوطارام جسے زمیندار نے بولا کہ تم اپنی بیوی کو میرے گھر کے کام کاج کے لیے بھیجو! طوطارام نے اس سے انکار کر دیا بس زمیندار نے اسے پیٹا تم سب کا حشر بھی ایسا ہی ہو گا اور مار کھاؤ گے اور ذلیل بھی کیے جاؤ گے۔

صبح ہوتے ہی سانول کے دروازے پر ایک آدمی آیا اور بولا تحصیلدار تمھیں کوٹ بلا رہے ہیں۔ سانول منھ ہاتھ دھو کر، کچھ کھا پی کر تحصیلدار سے ملنے کی غرض سے کچہری کی طرف نکل پڑا راستے میں خیال آیا کہ پھگوا اور دلّو کو اس بات سے آگاہ کر دوں۔ یہی تینوں پورے سرغنا کے رہنما تھے۔ دلو اور پھگوا کچہری سے ڈانٹ سن کر واپس آرہے تھے۔ سانول نے انھیں دیکھ کر پوری بات بتائی لیکن وہ لوگ اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ ہمیں ڈانٹ پڑی اس لیے کہ سانول غصے والا تھا اس کا غصہ اور تیز ہو جائے گا۔ پھگوا نے سوچا کہ سانول کو ملنے جانے سے روکا جائے لیکن ملنے نہ جانے میں اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ کچھ گفتگو کے بعد سانول ملنے چلا گیا، وہاں تھوڑی ڈانٹ کے بعد سانول نے غصے میں جواب دے دیا۔ پٹواری اپنے پیادے سے سانول کو پیٹنے کا حکم دیا۔ سانول دیوار کود کے بھاگ نکلا اور پھگوا کو لاٹھی نکالنے کو بولا، دلّو سمجھدار تھا کسی طرح سانول کو پھگوا کے گھر میں بند کر دیا۔

کچھ وقت کے بعد تحصیلدار کے کچھ پیادے سانول کو طلب کرنے آئے لیکن دلّو نے کہا کہ یہاں نہیں ہے وہ بھاگ گیا۔ پیادے کو پہلے ہی یہ پتا چل چکا تھا کہ وہ پھگوا کے گھر میں بند ہے وہ ضد کرنے لگے کچھ وقت کی بات چیت کے بعد دلّو نے کہا کہ چپ چاپ لوٹ جاؤ نہیں تو پیٹے جاؤ گے۔ جب تک وہاں پندرہ بیس آدمی جمع ہو چکے تھے، یہ دیکھ پیادے لوگ سوچے کہ مالک کو ان سب باتوں سے آگاہ کرنا چاہئے اور وہ واپس چلے گئے۔

سب کی آپسی گفتگو سے یہ طے پایا کہ اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ سب نے لوگوں سے ملنا شروع کیا اور آس پاس کے گاؤں والوں سے بھی بات چیت ہونے لگی۔ پٹواری یہ سب ماجرا دیکھ کر دھارا ۱۴۴ لگا دی تا کہ کوئی کسی سے مل جل نہ سکے۔

ایک دن صبح سانول کھیت میں لوٹا لے کر جا رہا تھا۔ سامنے سے چھپی آرہا تھا۔ سانول جب پھگوا کے گھر پر چھپا تھا تو چھپی نے ہی پٹواری کو خبر دی تھی، تو سانول صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ چھپی نے ایسا کیوں کیا؟ چھپی کی دشمنی

پھگوا سے تھی نہ کہ سانول سے، کچھ دیر بحث کے بعد دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور سانول نے غصے میں آکر چھپی کا سر پھوڑ دیا۔ کچھ دیر کے بعد پولیس آئی اور سانول کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے لائے لیکن جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ زمیندار اور پٹواری کی آؤ بھگت تھی۔ ایک طرف سانول پر کیس چلنے لگا تو دوسری طرف باقی لوگوں کے خلاف رپوٹیں ہونے لگیں۔ اور جس پر بھی ذرا سا شک ہوتا اسے دفعہ ۱۴۴ کی نوٹس دی جانے لگی۔ اور ایسے ہی گرفتاریوں کا سلسلہ چلتا رہا، کھیت کھلیان سے زیادہ نوجوان جیل میں نظر آنے لگے۔ کھیتوں میں کسانوں سے زیادہ پولیس کا آنا جانا ہونے لگا۔

تحصیلدار خوش تھا کیوں کہ سارے مخالفین جیل میں بند تھے، کسی کے اندر اب آواز اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن ایک سوال تھا جو دل میں چل رہا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ زمیندار بھی پریشان ہونے لگا کہ کھلیان بھرتے جا رہے تھے اور کھلیان میں مزدوروں سے زیادہ پولیس نظر آ رہی تھی۔ ٹھنڈ کا مہینہ تھا، کڑاکے کی ٹھنڈی پڑ رہی تھی، لوگ آگ تاپ رہے تھے اور گفت و شنید ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک اٹھ کر کھڑا ہوا اور کہا کہ ایک دن یہ سب ختم ہو جائے گا۔

بہر حال سہیل عظیم آبادی اپنے افسانہ ''الاؤ'' کے اختتام میں یوں رقم طراز ہیں:

''پوس کا مہینہ تھا، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے ککڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں ۔ الاؤ بجھنے لگا، ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا۔

''ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی''

دوسرا بولا:

''سالے پٹواری کھچڑ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت''

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا۔

زمین پر الاؤ بجھتی جا رہی تھی اور آسمان پر دھواں چھا رہا تھا۔''

(الاؤ۔ مرتب مصطفیٰ کمال پاشا۔ ص:۱۲۵ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

الغرض: اس افسانے کے ذریعے سہیل عظیم آبادی نے زمینداروں کے استحصال کے خلاف اپنی آواز کو بلند وبالا کیا۔ افسانہ الاؤ کی کہانی ایک میدان میں آگ کے پاس جہاں غریب کسان اور مزدور لوگ آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی سختیوں، بھوک اور بے بسی کے شکار ہیں۔ آگ یعنی الاؤ انھیں کچھ وقت کے لیے گرمی اور سکون ضرور فراہم کرتا ہے۔ مگر اس کے پس پردہ ان پر دکھوں کے انبار لدے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف زمیندار اور امیر طبقے کے لوگ ہیں جن کے پاس طرح طرح کے عیش وعشرت کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ البتہ سہیل عظیم آبادی علمی ومالی خانوادے کے روشن ستارہ ہونے کے باوجود بھی انھوں نے زمیندارانہ عیش وعشرت کی زندگی کو ترک کر کے نہایت ہی مفلس اور بے کس انسانوں کے دکھ درد کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور وہ اپنے تمام تحریروں میں سماج کے مظلوم طبقے کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات:


۱۔ افسانہ "الاؤ" (سہیل عظیم آبادی)

۲۔ سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے (ڈاکٹر وہاب اشرفی)

۳۔ کلیات سہیل (اقبال احمد خان سہیل)

۴۔ بے جڑ کے پودے (سہیل عظیم آبادی)

۵۔ چار چہرے سہیل عظیم آبادی


***

# ڈنمارک میں اُردو زبان و ادب: ایک طائرانہ نظر

محمد شعیب اسلم

اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی شعبۂ اردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر فضیلت بانو

استاد شعبۂ اردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Urdu has a long-standing tradition in Denmark, dating back to 1620. The publication of an Indian Urdu dictionary in 1741 marked a significant development in this tradition. Initially, Christian missionaries also published a few religious pamphlets. Writers representing all literary genres have engaged in Urdu literary creation. The poetry of some classical urdu poets has been translated into Danish, along with the prose works of several prominent Urdu prose writers.

In the 1960s, when thousands of Pakistanis migrated to Denmark for employment, this literary tradition gained further momentum. Over time, approximately thirty magazines and journals were launched. Watan News International has been published continuously for the past fifteen years.

Several individuals have played a vital role in promoting Urdu poetry in Denmark, including Zafar Awan, Nasr Malik, Iqbal Akhtar, Fawad Karamat, Kamran Iqbal Azam, Abu Talib, Safdar Ali Agha, Nosheen Iqbal, and Adeel Tahir Asi. In the promotion of Urdu prose, notable contributors include Tahira Shamim Hussain, Islam Saqi, Maqbool Bhatti, and Ghulam Sabir.

In addition, platforms like YouTube bloggers, radio, and social media are actively being used for the dissemination and promotion of the Urdu language.

**Keywords:** Denmark, Urdu, Translations, Poetry, Prose, Poets, Prose Writers, Magazines and Journals, Social Media.

ڈنمارک میں اردو کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتدا ۱۶۲۰ء میں ہوئی۔ ۱۷۴۱ء میں ہندوستانی اردو لغت کی اشاعت سے یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ عیسائی مشنری نے ابتدائی طور پر چند مذہبی رسالے بھی شائع کروائے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے موجود ہیں۔ اردو کے چند کلاسیکی شعرا کے کلام کا ڈینش زبان میں ترجمہ کیا گیا

ہے۔ اسی طرح چند بڑے نثر نگاروں کی تخلیقات کے تراجم بھی کیے گئے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جب ہزاروں پاکستانی روز گار کے سلسلے میں ڈنمارک پہنچے تو اس روایت میں بہت تیزی آئی۔ مختلف اوقات میں کم و بیش تیس رسائل و جرائد کا اجرا ہوا۔ "وطن نیوز انٹر نیشنل" پندرہ سال سے لگا تار شائع ہو رہا ہے۔ ڈنمارک میں اردو شاعری کے فروغ میں ظفر اعوان، نصر ملک، اقبال اختر، فواد کرامت، کامران اقبال اعظم، ابو طالب، صفدر علی آغا، نوشین اقبال اور عدیل طاہر آسی اپنا بھر پور کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو نثر کے فروغ میں طاہرہ شمیم حسین، اسلام ساقی، مقبول بھٹی اور غلام صابر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ یوٹیوب بلاگرز، ریڈیو اور سوشل میڈیا کے ذرائع استعمال کر کے بھی اردو کی ترویج و اشاعت جاری ہے۔

**کلیدی الفاظ:** ڈنمارک، اردو، تراجم، شاعری، نثر، شعرا، نثر نگار، رسائل و جرائد سوشل میڈیا۔

ڈنمارک میں اردو کے حوالے سے جو کام ہوا ہے اس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور پچھلے پانچ چھ عشروں سے یعنی عصر حاضر میں اب جو اردو زبان و ادب یہاں فروغ پا رہا ہے اس کی بھی اپنی ہی داستان ہے۔ ڈنمارک میں صرف اردو ہی نہیں بلکہ بر صغیر کی بڑی بڑی زبانوں کے ادب پر بھی بہت پہلے سے کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ سنہ سولہ سو بیس (۱۶۲۰ء) میں ڈنمارک کے شاہ کرسچن چہارم نے اپنے دو ایلچیوں کو متحدہ ہندوستان کے کے علاقے کرناٹک و تامل ناڈو کی ایک ساحلی ریاست تھنجور کے راجہ رگھوناتھ نائیک کے پاس بھیجا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ سلطنت ڈنمارک اور تھنجور کے درمیان دوہری تجارت کا معاہدہ ہوا اور ڈنمارک نے وہاں اپنے قدم جما لیے۔ اور پھر ڈینش استعماریت کا علاقہ تھنجور سے سیر ام پور تک پھیل گیا اور یہاں سنہ سولہ بیس (۱۶۲۰ء) سے لے کر سنہ سترہ سو پچپن (۱۶۵۵ء) تک ڈینش گورنر اور پادری کام کرتے رہے۔ کلکتہ سے کوئی دو سو پینتیس میل دور شمال مشرق میں واقع سیر ام پور میں ہندوستان کا پہلا لیتھو چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا جس کے لیے تمام مشینیں ڈنمارک کے شہر البورگ سے

دارالحکومت کوپن ہیگن لائی گئیں اور پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے ہندوستان پہنچائی گئیں۔ اس چھاپہ خانہ پر سب سے پہلے ڈچ و پالی زبان کی لغت شائع کی گئی۔ اور پھر اسی چھاپہ خانہ سے مسیحی لٹریچر اور مذہبی مناجاتیں مختلف ہندوستانی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے کتابوں کی صورت میں شائع کیے جاتے رہے جن میں اردو (جسے تب ہندوستانی کہا جاتا تھا) میں لکھے ہوئے کتابچے بھی شامل تھے۔ سنسکرت ادب کا معروف ڈرامہ ''مٹی کی گاڑی'' کا ترجمہ پہلی بار اٹھارہ سو ستر (۱۶۷۰ء) میں ہوا اور پھر اسے جدید ڈینش زبان میں سنہ انیس سو انیس (۱۹۱۹ء) میں دوبارہ شائع کیا گیا۔

ڈنمارک اور اردو کا تعلق بہت پرانا ہے۔ بنیامین شلز (اصل تلفظ بنجمن ہے) جو جرمن النسل ڈینش شہری اور ایک نامور عیسائی مبلغ اور کئی مشرقی زبانوں کے ماہر تھے، انہوں نے سنہ سترہ سو اکتالیس (۱۷۴۱ء) میں ابتدائی دور کی ایک ہندوستانی (اردو) گرامر شائع کی اور چھوٹی چھوٹی کئی کتابیں لکھیں۔ گرامر کی اس کتاب کی اشاعت تاریخ کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے لیکن اصل سنہ اشاعت سترہ سو اکتالیس (۱۷۴۱ء) ہے۔ اس کتاب کا نام بھی لاطینی زبان میں ہے یعنی یہ "GRAMMATICA HINDOOSTANICA" کہلاتی ہے۔ اس میں اردو الفاظ عربی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں اور ان کا تلفظ لاطینی زبان میں دیا گیا ہے اور تشریح دیوناگری میں کی گئی ہے۔۔۔ بنجمن شلز نے اردو گنتی اور محاورات پر بھی چند ایک کتابچے اردو میں شائع کیے اور پھر انہوں نے کتاب مقدس سے پیدائش کے پہلے چار ابواب کا اردو ترجمہ سنہ سترہ سو پینتالیس و چھیالیس میں کیا اور شائع کرایا۔ اس طرح انہوں نے دانیال کی کتاب کا ترجمہ سنہ سترہ اڑتالیس میں شائع کرایا اور پھر کتاب مقدس کے کئی حصوں کے تراجم اردو میں شائع ہوئے مثلاً رسولوں کے اعمال، سنہ سترہ سو انچاس میں، یعقوب کا خط سترہ سو پینسٹھ میں، مرقس کی انجیل سترہ سو اٹھاون میں، یوحنا کی انجیل مع مکاشفہ بھی اسی سال یعنی سترہ سو اٹھاون اور اس کے ساتھ اسی سال نیا عہد نامہ اور مکاشفہ یوحنا کا اردو ترجمہ بھی بنجمن شلز نے کیا اور شائع کرایا۔

ایک اور ڈینش مستشرق اوارس ایبل بھی تھے جنھوں نے سنہ سترہ سو بیاسی (۱۷۸۲ء) میں اردو زبان میں ایک فرہنگ مرتب کی اور یہ ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن ہی سے شائع ہوئی اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کی یہ پہلی کتاب تھی جو ڈنمارک ہی میں شائع ہوئی اس میں ترپن الفاظ کے معانی کا گیارہ زبانوں سے موازنہ کیا گیا تھا جن میں اردو بھی شامل ہے۔ ہندو پاکستان کے ادب سے ''کبیر کے ایک سو دوھے'' اور معروف صوفی سنت، حضرت عنایت خان کی کتاب ''گیان، ودان، فرمان'' اور شاہ ادریس کی کتاب ''داستان صوفیار و درویش'' بالترتیب انیس سو انسٹھ اور انیس سو بیاسی میں شائع ہوئیں۔

برصغیر کی کم سے کم پندرہ مختلف زبانوں کے ادب کا ڈینش میں ترجمہ سنہ اٹھارہ سو سے لے کر اب تک کیا جاچکا ہے۔ ان میں اردو ادب کے حوالے سے شاعری سر فہرست ہے اور جن اردو شعراء کا کلام ڈینش زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے ان میں آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر، سید محمدی میر سوز، اشک، دلہن بیگم، مینائی، غالب، اقبال، سید محمد حیدر بخش، کمال الدین حسین شاہ، مومن، غلام ہمدانی مصحفی، میر حسن، میر انشاء اللہ خان، میر تقی میر، عبداللہ یحیٰی خان، شاہ محمد ولی، میراجی، امیر خسرو، بابا گرونانک، کالیداس، بھلے شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا، خوشحال خان خٹک کا کلام شامل ہے۔ اس کے علاوہ فیض احمد فیض، جان ایلیا، احمد فراز، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عبید اللہ علیم، افتخار عارف اور ساقی فاروقی کے کلام کا ڈینش زبان میں ترجمہ ملتا ہے۔ ان سب شعراء کا منتخب کلام ڈینش زبان میں، مختلف انتھالوجیز اور ادبی رسالوں کی زینت بن چکا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی بعد'' کا ترجمہ موجود ہے اور اسی سلسلے کو اگر ہم اپنے پڑوسی ملک ہندوستان کے اردو شعراء سے ملالیں تو بلراج کومل، علی سردار جعفری، اختر الایمان اور بشیر بدر اور ف۔ س۔ اعجاز کی نظموں کے تراجم بھی نظر آتے ہیں۔

جن اردو افسانوں اور کہانیوں کے ڈینش زبان میں تراجم موجود ہیں ان کے مصنفین میں، انتظار حسین، خواجہ احمد عباس، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی سر فہرست ہیں جبکہ احمد ندیم قاسمی، ابدال بیلا، رشید

امجد اور احمد ہمیش بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے ایک نوجوان ادیب، دانیال معین الدین کی نو کہانیوں کا ایک مجموعہ بعنوان "ANDRE STEDER, ANDRE DROMME" یعنی "مکان ھای دیگر، رویاھائی دیگر" یا آسان اردو میں "دیگر مقامات، دیگر خواب" کے نام سے دو سال پہلے شائع ہوا ہے۔ کسی پاکستانی ادیب کی کہانیوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو کتابی صورت میں سامنے آیا ہے۔ یہ کہانیاں پہلے انگریزی زبان میں امریکہ میں کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔

مختصر یہ کہ اہل ڈنمارک کی اردو کے لیے خدمات کا وہ سلسلہ جو سنہ سولہ سو بیس میں شروع ہوا اور سنہ سترہ سو اٹھاون تک ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اب پچھلے تیس چالیس سال سے یہ ایک نئے انداز میں پھر سے جاری ہے۔ اور وہ یوں کہ سنہ انیس سو ساٹھ کے عشرے میں ایک بڑی تعداد میں پاکستانی بسلسلہ روزگار ڈنمارک پہنچے اور جب انہوں نے یہاں اپنے قدم جما لیے تو انہوں نے اپنے بال بچوں کو بھی وہاں بلا لیا۔ فی الوقت ایک محتاط اندازے کے مطابق ڈنمارک میں پاکستانی النسل افراد کی تعداد کم سے کم پینتیس چالیس ہزار ہے اور اب گرین کارڈ کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوان بھی یہاں پہنچ رہے ہیں اور یوں اس تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عہد حاضر میں ڈنمارک میں اردو کی ابتدا انہی پاکستانی تارکین وطن کی آمد سے ہوئی۔

پچھلے تیس پینتیس سال کے دوران ڈنمارک سے اردو کے کم و بیش تیس بتیس رسائل و جرائد وقتاً فوقتاً جاری ہوئے لیکن اپنا تسلسل جاری نہ رکھ سکے۔ ان میں سے کئی تو ایک ایک دو دو شماروں کی اشاعت کے بعد بند ہو گئے اور کچھ تین تین چار ماہ جاری رہنے کے بعد غائب ہو گئے۔ فی الوقت اردو کا ایک جریدہ، وطن نیوز انٹرنیشنل، پچھلے پندرہ برس سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔ یہ جریدہ پاکستان میں طبع ہوتا ہے اور ڈنمارک میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اقبال اختر، کامران اقبال اعظم، صفدر علی آغا، ترغیب بلند نقوی کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور صدف مرزا کا ایک مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ طاہرہ شمیم حسین پہلی ادیبہ ہیں جن کا ناول "جہنم کے اس پار" شائع ہوا ہے۔

ڈنمارک سے شائع ہونے والا یہ پہلا اردو ناول ہے۔ محمد رمضان معروف بلاگر ہیں اور پاکستان کے روزنامہ ''ڈان'' کے اردو ایڈیشن میں ان کے تصویری بلاگ اپنی نوعیت بہت ہی منفرد ہوتے ہیں۔ زراعت کے موضوع پر ان کی کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ڈرائیونگ سیکھنے کے خواہشمندوں کے لیے اردو میں ''تھیوری'' کی ایک کتاب بھی مرتب کی ہے۔ اور ابھی حال ہی میں ان کی ایک کتاب بعنوان ''تحریر سے تقریر تک'' شائع ہوئی ہے۔ ظفر اعوان پنجابی و اردو میں شاعری کرتے ہیں اور ان کی پنجابی شاعری کا ایک مجموعہ ''زیویں سدھراں دی'' ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔

ڈنمارک میں اردو شاعری اور نثر کے حوالے سے معروف نام نصر ملک کا ہے۔ جنہوں نے اردو شاعری اور نثر کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور اب بھی پوری آب و تاب سے اردو کی خدمت میں سرگرداں ہیں ڈنمارک میں نصر ملک اردو زبان و ادب کی چلتی پھرتی لائبریری ہیں۔

اردو کی تمام اصناف کے اندر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے ان کی شاعری کے اندر وطن ثانی کا موضوع جھلکتا ہے اور نثر کے اندر جدید دنیا کے تقاضے ملتے ہیں۔ سب سے بڑا کام اردو ڈینش ڈکشنری ہے جو ان کی مسز ہما نصر نے ان کے ساتھ مل کر تالیف کی ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت میں بہت منفرد ہے۔

ڈنمارک کی اسٹیٹ لائبریری میں ''تارکین وطن کے لیے ادب'' کے شعبہ اردو میں کم و بیش تین ہزار اردو کتابیں موجود ہیں اس کے علاوہ وہاں پشتو، پنجابی، ہندی اور تامل زبانوں میں بھی کتابیں موجود ہیں۔ اردو کے ڈراموں اور گیتوں کے سی ڈی اور کیسٹ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جبکہ قارئین کو ان کی دلچسپی کی اردو کتابوں کی فراہمی کی سہولیات بھی مہیا ہیں۔

ڈنمارک کے پبلک سکولوں میں بچوں کو ان کی مادری زبان کی تعلیم کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا اور پاکستانی بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے اساتذہ کی ایک کھیپ تیار کی گئی۔ سکولوں میں اردو کی تعلیم کا وہ پہلے والا

سلسلہ تو رہا نہیں البتہ کچھ شرائط کے ساتھ یہ سہولت کچھ حد تک اب بھی موجود ہے۔ کوپن ہیگن میں پاکستانیوں کا اپنا ایک پرائیویٹ سکول "جناح سکول انٹرنیشنل" کے نام سے قائم ہے جہاں بچوں کو اردو زبان کی تعلیم دیئے جانے کا بندوبست ہے۔ کچھ اسلامک سنٹر بھی اردو زبان کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔

ڈنمارک میں لکھنے والے شعراء بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اقبال اختر، ادبی تنظیم، "اردو فورم" کے سربراہ ہیں۔۔۔ ان کا نمونہ کلام حاضر ہے:

؎ یہ ویرانی ، یہ تنہائی کی شب ، کیسے بسر ہوگی
کسی نازک بدن کے دل میں گھر کرنا ضروری ہے [۱]

؎ یہاں نوائے مسرت صدائے نوحہ ہے
دیارِ غیر میں اختر اُداس رہتا ہے [۲]

؎ ہر اک رُت میں نظر کے سامنے ہے اِک نیا منظر
یہ منظر کس طرح دیکھے نظر ، فرصت نہیں ملتی [۳]

فواد کرامت جتنی ایک ہنس مکھ شخصیت ہیں، شاعری کے اعتبار سے اتنے ہی سنجیدہ ہیں۔۔۔ نئے موضوعات۔۔۔ ملاحظہ کیجئے:

؎ نہ پوچھ آئے ہیں منزل کو چھوڑ کر کیوں کر
کہ نارسائی ادھر اس قدر ہے کیا کہیئے ؎۴

؎ کیا نئے زخم مرا کرب نکھاریں دیکھو
آج پھر وقت کے ہاتھوں میں ہیں کچھ سنگ نئے ؎۵

کامران اقبال اعظم کا شعری مجموعہ ''اس کا وعدہ تھا کل شام'' شائع ہو چکا ہے۔۔۔اُن کے دو شعر:

؎ انہیں پوچھو کہ کن حالات میں رکھا ہوا ہے
خوشی نے بھی جنہیں صدمات میں رکھا ہو گا ؎۶

؎ جو پس منظر میں تھا وہ پیش منظر کی طرف ہے
نکل کے گھر سے بھی میرا سفر گھر کی طرف ہے ؎۷

ابو طالب، شہر تہذیب و ادب لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں اور غزل گوئی میں یکتا ہیں، دو شعر ان کے حاضر ہیں:

؎ یوں بھی نئی زمین پہ ہم کو ملا ہے سچ
جیسے ہر اِک کتاب میں ہم نے پڑھا ہے جھوٹ ؎۸

؎ یہ ہم زباں ہیں جو میری زباں نہیں سمجھے
سہل سی بات بھی اُن کے لیے ثقیل ہوئی ؎۹

چھوٹی بلکہ بہت چھوٹی بحر میں لکھنے والے صفدر علی آغا کا مجموعہ کلام ''تیری باتیں'' شائع ہو چکا ہے۔۔۔ اسی سے دو شعر:

؎ تیرا ساتھ دل سے بہت بے محل ہے
نگاہوں میں یہ لمحہ پھرتی اجل ہے ؎۱۰

؎ دھوپ ، ہوا اور پھول سماں ہے
اُس کے آنے کا امکاں ہے ؎۱۱

نوشین اقبال نسائی لہجے کی ایک منفرد شاعرہ ہیں اور اظہار کے پیرائے میں بڑی گہری بات آسان لفظوں میں کہنے کا گر جانتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کا نمونہ کلام حاضر ہے:

؎ بھنور سے بچ کے آخر کیا کروں میں
میرے آگے کنارے جل رہے ہیں

؎ میرے شہروں میں نفرت ناچتی ہے
محبت کے منارے جل رہے ہیں ؎۱۲

اور پھر نوشین کا یہ طرز تکلم سماعت فرمایئے:

؎ میں ایک ماں ہوں میری اپنی ذات کوئی نہیں
میں خود کو مار کے ممتا بچا کے بیٹھی ہوں
؎ اُسے تو یاد نہیں اُس نے کیا ستم توڑے
کمال یہ ہے! میں سارے بھلا کے بیٹھی ہوں ؎۱۳

اور ہاں، یہ بھی سنیئے:

؎ عشق کو دل کا آبلہ دیکھا
حوصلہ دیکھ میں نے کیا دیکھا
میکدے میں سراب کے جیسے
بس تیرا عکس جا بجا دیکھا ؎۱۴

؎ آج پھر پڑ گئی نظر ان پر
آج پھر حشر یادگار ہوا
؎ آج پھر خواب بک گئے سارے
آج پھر خوب کاروبار ہوا ؎۱۵

شعر گوئی کا منفرد انداز لئے اور اپنے اظہار کا الگ رنگ رکھنے والے، غزل کی کلاسیکل روایات کے امین، طاہر عدیل کا شعری مجموعہ ''کوئی دوسرا نہیں'' شائع ہو چکا ہے اور اسے کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ طاہر عدیل کے دو شعر:

؎ دل و دماغ میں ہیں وہم اور گمان بہت
دکھائی دیتا نہیں جس کے ہیں نشان بہت

؎ بدلتی جاتی ہیں اقدار جس طرح طاہر
میں سب یہ دیکھ سکوں ، مجھ میں اتنی تاب کہاں ؎۱۶

عدیل طاہر آسی اگرچہ نظم و غزل بھی لکھتے ہیں لیکن انہوں نے نعت گوئی میں شہرت پائی ہے ان کے دو شعری مجموعے، ''شہر خواب سے آگے'' اور ''ذکر رسالت مآب ﷺ'' شائع ہو چکے ہیں۔ ظفر اعوان پنجابی و اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔۔۔ ان کا اردو مجموعہ ''آرزوئے سحر'' بھی شایع ہو چکا ہے۔۔۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے شعراء اور کچھ ''خانہ ساز قسم کی'' ادبی نظیمیں بھی ہیں جو اپنی اپنی بساط کے مطابق اردو کی ترویج کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

ڈنمارک میں اردو کے نام پر کئی ایک تنظیم بنتی رہیں بکھرتی رہیں۔۔۔ ان کا کام صرف مشاعروں کا انعقاد کرنا ہوتا تھا۔ فی الوقت تین تنظیمیں متحرک ہیں، ان میں اپنی کارکردگی کے لحاظ سے ادبی و ثقافتی تنظیم۔۔۔ ''بیلی'' کا پلہ بھاری ہے۔ ''اردو فورم'' سال میں دو بار مشاعرہ کرانے کی اپنی رسم پر ابھی تک گامزن ہے۔ ''کہانی گھر'' کے نام سے صائقہ رازی کی تنظیم مطالعہ اقبال کے ماہر شوکت علی کے اشتراک سے، بچوں کو اردو زبان وادب کی جانب لانے

کے لیے بہترین کردار ادا کر رہی ہے اور اسے والدین کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ ڈنمارک میں اب تک جن شعراء کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں نصر ملک، اقبال اختر، علی صفدر خان، کامران اقبال اعظم، صفدر علی آغا، طاہر عدیل، ظفر اعوان، عدیل احمد آسی، ترغیب بلند نقوی، آنجہانی شمشیر سنگھ شیر وغیرہ شامل ہیں۔۔۔۔ فواد کرامت اور ابو طالب ڈنمارک کے اردو شاعروں میں کئی اعتبار سے سرفہرست شمار ہوتے ہیں۔ محترمہ طاہرہ شمیم حسین کا ناول ''جہنم کے اُس پار''، اسلام ساقی کی کتاب ''ساحل کے ساتھ ساتھ'' اور مرحوم مقبول بھٹی کی کتابیں، ''آئینہ جہلم'' اور ''منزلیں'' بھی قابل ذکر ہیں۔ ''اقبال اکادمی اسکینڈے نیویا، ڈنمارک'' علامہ اقبال کی سوچ و فکر کو متعارف کرانے کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کے سربراہ غلام صابر کی انگریزی میں دو اور اردو میں ایک کتاب ''اقبال شاعر فردا'' شائع ہو چکی ہیں اور اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستان کی حکومت نے ان نے انہیں ''صدارتی گولڈ میڈل'' سے نوازا ہے۔ یہ اکادمی ہر سال اقبال کی سالگرہ اور اُن کی برسی کے موقع پر دو تقاریب کا بطور خاص بندوبست کرتی ہے۔ کئی ایک پاکستانیوں نے ''یوٹیوب'' کا سہارا کے لیے بڑے بڑے دلکش، اور بڑی مقناطیسی کشش رکھنے والے ناموں سے، ایسے ''ٹی وی'' بنا رکھے ہیں جہاں وہ اپنے ارمان پورے کرتے اور لوگوں کو تاثر دیتے ہیں کہ، دیکھو ہم نے اپنا ٹی وی قائم کر رکھا ہے۔''

نوشین اقبال اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑی معتبر شاعرہ ہیں اور غزل و نظم کہنے پر انہیں کمال فنی مہارت حاصل ہے۔۔۔۔ ڈنمارک ریڈیو نے سنہ انیس سو پچاسی میں دوسری پانچ غیر ملکی زبانوں کے ساتھ اردو نشریات کا آغاز بھی کیا، سنہ دو ہزار دس میں اردو سروس اور دوسری زبانوں کی نشریات بجٹ کی کمی کی وجہ سے بند کر دی گئیں۔۔۔۔۔ فی الوقت ''ریڈیو آپ کی آواز'' اور پاکستانیوں کا سے پہلا اور پرانا ''ریڈیو ہموطن'' ایف ایم ریڈیو موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی تین چار ریڈیو ایسے ہیں جو اپنی ہفتہ وار نشریات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چاند شکلا ہدیہ بادی کا آن لائن ریڈیو ''سب رنگ'' بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ، اس پر روزانہ ڈینش خبریں شائع کی جاتی ہیں اور نشر بھی کی جاتی

ہیں۔۔۔۔ مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ڈنمارک میں ابھی تک تو اردو ہے، اور پہلی اور دوسری نسل تک تو یہ شائد اسی طرح موجود بھی رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آثار بتاتے ہیں کہ شاید یہ محض پاکستانی وہندوستانی گھرانوں میں بول چال تک ہی رہ جائے گی۔۔۔۔ اگر حکومتی سطح پر کام ہو تو امید ہے یہ زبان آنے والوں کیلئے بھی مشعل راہ ہو گی۔

## حوالہ جات


۱۔ محمد اقبال اختر، خوشبو کا خیمہ (اسلام آباد، کتاب گھر ۲۰۰۵ء) ص ۱۳۱

۲۔ محمد اقبال اختر، خوشبو کا خیمہ (اسلام آباد، کتاب گھر ۲۰۰۵ء) ص ۱۰۰

۳۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۳۰

۴۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۴۵

۵۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۴۸

۶۔ کامران اقبال اعظم، اس کا وعدہ تھا کل شام، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۷ء، ص ۲۸

۷۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۷۲

۸۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۱۰۱

۹۔ محمد طاہر خان، (مرتبہ ڈنمارک کے اردو شاعر) UK, London, Urdu Publishers، ۲۰۱۶، ص ۱۰۹

۱۰۔ صفدر علی آغا، تیری باتیں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۹۵

۱۱۔ صفدر علی آغا، تیری باتیں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۵۵

۱۲. http://urduhamasr.dk>post>defenition/English/humar_1 visited July 28, 2025 at 1:45pm

۱۳. http://urduhamasr.dk>post>defenition/English/humar_1 visited July 28, 2025 at 1:55pm

۱۴. http://urduhamasr.dk>post>defenition/English/humar_1 visited July 29, 2025 at 11:00am

۱۵. http://urduhamasr.dk>post>defenition/English/humar_1 visited July 29, 2025 at 1:00pm

۱۶. http://urduhamasr.dk>post>defenition/English/humar_1 visited July 30, 2025 at 2:15pm


***

# تاریخ ادب اردو کا ایک تنقیدی مطالعہ

محمد رمیض مصباحی

ریسرچ اسکالر (کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

(کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)

## ملخص

پیش نظر مضمون بعنوان "تاریخ ادب اردو کا ایک تنقیدی مطالعہ" ہے۔ جو رسالہ تاریخ ادب اردو کے بارے میں ہے۔ یہ سہ ماہی تاریخ ادبِ اردو یو-جی-سی کیئر لیست ٹیڈ دہلی ۷۰ (کڑوری مل کالج) ایک بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جنرل ہے، جو سال ۲۰۱۹ (اپریل تا جون) میں اپنی پہلی طبع کے ابتداء سے ہی ادبی و ثقافتی حلقوں میں اسے بے پناہ مقبولیت ملی ہے۔ آفاقی پیمانے پر ادبی نقد و نظر، علمی تحقیق اور جدید رجحانات و افکار پر مشتمل معیاری اور مستند حوالہ جاتی مقالات کو اردو زبان و ادب کے حوالے سے علمی و ادبی تحریروں کی اشاعت ''تاریخِ ادبِ اردو'' کی اولین ترجیح ہے، خاص طور پر اردو ادب کے ریسرچ اسکالرز اور عام طور پر ادب اور دوسرے علوم سے دلچسپی رکھنے والے قارئین انگریزی، ہندی، سائنس اور شوسل سائنس میں تحقیق و معلومات کی فراہمی میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

**کلیدی الفاظ:** تاریخِ ادبِ اردو، تحقیق، تنقید، ادبی رسائل، سہ ماہی مجلہ، یو جی سی کیئر لسٹ، بین العلومی، مطالعات، اداراتی پالیسی، جدید رجحانات، کلاسیکی ادب، فکشن، معاصر، اردو اسکالرز

تاریخ ادبِ اردو ایک ادبی اور تحقیقی جرنل ہے، اس میں مختلف علوم و فنون پر مبنی تحریریں شامل کی جاتی ہیں، جو تحقیق پر مبنی، معلومات سے بھرپور اور فکری گہرائی کی حامل ہوتی ہیں، اس میں شامل تمام موضوعات تحقیقی عمق، معلوماتی وسعت اور فکری بالیدگی کے متحمل ہیں، جو قارئین کو اردو دنیا میں وقوع پذیر تغیرات اور ابھرتے ہوئے نئے رجحانات سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ قدیم اور کلاسیکی ادب کی روایت و معنویت سے بھی باخبر رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں نو وارد تحقیق، تلاش و جستجو اور حالیہ طریقہ کار کو فروغ دینا بھی اس جرنل کا مقصد ہے۔ اس جرنل میں تحقیقی و تجزیاتی مضامین، تراجم اور کتابوں پر تبصرے بھی شایع کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آرٹ، بشریات، ثقافتی علوم، فلم و میڈیا، اسٹڈیز، تاریخ، زبان، ادب، فلسفہ اور مذہبی علوم جیسے بین العلومی موضوعات پر مبنی مضامین کو بھی اس میں جگہ دی جاتی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو اُردو زبان کا ایک معیاری اور ادبی جرنل ہے۔ جس کے تحت فن و ادب کی گوناگوں اصناف، جیسے شاعری، افسانہ نگاری، مضمون نویسی، تحقیق، تنقید اور تبصرہ وغیرہ کو شائع کیا جاتا ہے۔

رسالہ "تاریخ ادبِ اردو" کی امتیازی خصوصیت اس میں شامل تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا اعلیٰ معیار ہے، جو اس کے بانی مدیر پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی معلم کڑوری مل کالج کی انتھک محنت، گہری توجہ اور خلوصِ عمل کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے موصول ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین میں سے انتخاب کے وقت صرف معیار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ نگارشات کا غیر مطبوعہ ہونا اس لیے ضروری ہے تاکہ ایک ہی تحریر کی دوبارہ اشاعت سے بچا جاسکے۔ قلمکار کا تعلق خواہ کسی بھی جگہ سے ہو، قلمکار معروف ہو یا نووارد، اِس سے بالاتر ہو کر مضامین کی اشاعت کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ تاریخ ادبِ اردو ان جرنلز میں شامل ہے، جو عالمی ادب کو اعلیٰ معیار کے ساتھ اردو زبان میں پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور محنتی اسکالرز کو اپنے خیالات اور افکار کے اظہار کے لیے وسیع پیمانے پر پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ اس لیے سنجیدہ اسکالرز اور نئے قلمکاروں سے التماس ہے کہ غیر مطبوعہ نگارشات ارسال فرما کر "تاریخ ادبِ اردو" کو مزید معیاری بنائیں۔

میگزین تاریخِ ادبِ اردو کی سرپرستی پروفیسر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے سپرد ہے، جب کہ اس کے مدیرِ رسالہ کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا انجام دے رہے ہیں۔ کسی بھی جریدے کی کامیاب اشاعت اور اس کے علمی و ادبی مقام کے استحکام میں مدیرِ اعلیٰ اور ادارتی عملے کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔ انہی کی شب و روز محنت، پیشہ ورانہ لگن اور سنجیدہ کاوشوں کے باعث جریدے کا معیار اور وقار برقرار رہتا ہے۔ تاریخ ادب اردو کے سرپرست پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو ادب کے مشہور تحقیق و تنقید اور ماہر معلم شعبہء اردو، دہلی یونیورسٹی ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو دنیا کے بہت معزز اور ممتاز نام ہے انھوں نے لمبے عرصے تک ادب کے فیلڈ میں ناقابل فراموش کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے فرائض کا بھی بحسن و خوبی انجام دیے ہیں اور

قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی معتبر تصانیف "اردو فیکشن کی تنقید"، "مابعد جدیدیت اور پریم چند"، "موضوعات"، "مطالعات"، "آغا حشر عہد اور ادب"، "انتظار حسین ایک دبستان"، "قرت العین حیدر ایک مطالعہ"، "اُردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے"، "جدید تنقید کا منظر نامہ"، "اردو افسانے میں بیانیہ کا احیا" اور "اردو میں پاپولر لٹریچر" وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ رسالہ "تاریخ ادب اردو" کو سرخرو بنانے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا کلیدی کردار رہا ہے بالخصوص میگزین کو یو جی سی کیئر لیست ٹیڈ میں ملحق کرنے کے لیے انھوں نے بڑی محنت کی۔

جیسا کہ اس میگزین کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی صبا لکھتے ہیں:

"پروفیسر ارتضیٰ کریم کی رہنمائی میں ہمارا رسالہ صف اول میں شمار ہونے لگا ہے۔ ان کی اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت کی وجہ سے رسالے کی زبان میں نکھار آرہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے قارئین پروفیسر ارتضیٰ کریم کی رہنمائی میں نکلنے والے اس رسالے سے مستفید ہوں گے اور اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کریں گے"۔

(تاریخ ادب اردو، جلد-۳، شمارہ ۴ (اکتوبر تا دسمبر)، ص:۵)

ادبی رسالے کی کامیابی کا انحصار جس طرح سرپرست کی بصیرت، جاں فشانی اور مخلصانہ کاوشوں پر ہوتا ہے وہیں مدیر اعلیٰ کی انتھک محنت اور بالغ نظری بھی جریدے کو قدر و منزلت عطا کرنے میں سود مند ثابت ہوتی ہے۔ میگزین تاریخ ادب اردو کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی صبا کا شمار اردو زبان و ادب کی ماہر معلم، تحقیق اور تنقید کے وسیع و عمیق میدان کا ایک ایسے علمی درخشاں و ادبی مینار کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی فکر، بصیرت اور علمی کاوشیں نہ صرف اہلِ ادب میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں بلکہ اردو تحقیق و تنقید کی روایت کو مضبوطی اور وقار بھی عطا کرتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی صبا کی پیدائش ۴ فروری ۱۹۷۰ کو مہدیوا گائوں، ضلع ارریا، ریاست بہار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے علاقے کے اسکول اور کالج میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کی طرف رواں دواں ہوئے

، ذاکر حسین کالج سے اردو زبان و ادب میں ماسٹر ز آف آرٹس (M.A.Urdu) اور ماسٹر ز آف فلاسفی، پھر شعبہء اردو دہلی یونیورسٹی سے ہی فلسفہ ڈاکٹریٹ سرپرست اعلی پروفیسر ارتضیٰ کریم کی نگرانی میں مکمل کی۔ اب پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیی صباد ہلی یونیورسٹی کے کڑوری مل کالج کے شعبہء اردو میں بحثیت مدرس تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں ۔ ان کی اب تک چھ کتابیں " شاعر کی ناول نگاری"، "ادبی مقالات"، "ادبی شخصیات"، "ادبی تجزیات"،" ادبی مناظرات "اور " جمیل جالبی: محقق و مؤرخ" شائع ہو چکی ہیں۔ ان سب تصانیف کے علاوہ نو ادبی و تحقیقی مضامین رسالہ تاریخ ادب اردو میں متعدد اشاعت ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں ان عنوانات کو بھی اپنی تحریر کے لیے انتخاب کرتے ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ماہر ادیب حقانی القاسمی اپنی تصنیف "رینو کے شہر میں" پروفیسر ڈاکٹر یحیی صبا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"یحیی صبا کا ذہن کئی جہتوں میں متحرک ہے۔ کلاسکی ادبیات کی تفہیم کے ساتھ جدید ادب کی تعبیر بھی ان کے تنقیدی عمل میں شامل ہے۔ جدید و قدیم ادب سے آگہی نے ان کی تنقیدی نظر کو منور کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے مجموعی صورت حال کا انہیں گیان ہے اور وہ ادب کو عمرانیاتی اور سماجیاتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب کی تاریخی سروکار کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ یحییٰ صبا کی تحریر میں ابہام یا اہمال نہیں ہے، بلکہ فطری سادگی اور سلاست ہے۔ اُن کے ذہن میں جو جذبات خیالات موجزن ہوتے ہیں اُنہیں بغیر کسی تصنع اور تکلف کے پیش کر دیتے ہیں۔ وضاحت اور سادگی کے اعتبار سے اُن کی تحریریں آج کے اُن ارسطوئوں سے الگ ہیں جو لسانی اور فطری کنفیوزن یا کنفیوزن کے شکار ہیں اور جن کے لئے خود اپنی تحریر کی تفہیم بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ یحییٰ صحبہ میں جذب و انجذاب کی قوت ہے اُن کی ہر تحریر پر اُن کی اپنی زبان کا اثر نظر آتا ہے کسی اور تحریر کا گمان نہیں گزرتا۔ جبکہ آج کے دور کی بیشتر تنقید ارسطو، افلاتون، ایلیٹ کی تحریر کردہ نظر آتی ہیں، یحیی صبا نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ مانگے کے اجالے سے اپنی سوچ اور اپنی زبان زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ ویسے صبا کی زبان مروق اور مصفی ہوتی ہے۔"

(رینو کے شہر میں از حقانی القاسمی، ص۔ ۲۲۵ سنہ اشاعت ۲۰۰۷، ادارہ دعوت القرآن، مقام و پوسٹ، ڈوبا، ضلع ارریا (بہار))

کسی بھی رسالے کی اشاعت اور اسے منظرِ عام پر لانے کے عمل میں بے شمار افراد کی مشترکہ محنت اور تعاون شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح رسالے کے معیار کو بلند کرنے میں نائب مدیر محمد رمیض رضا مصباحی جو نہایت محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ تحریروں کو لفظ بہ لفظ پڑھ کر اس کے معیار کو بلند کرنے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں اور وہ اس کی موزوں ترتیب اور مجموعی پیشکش کو عمدہ اور تعمیری بنانے میں ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ سرپرست پروفیسر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، مدیر اعلیٰ پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا اور نائب مدیر محمد رمیض رضا مصباحی کے علاوہ بے شمار اراکین میگزین کی امداد رہی جن میں چند کا نام درج ذیل ہیں:

"ڈاکٹر محمد محسن" مدرس، کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی، "ڈاکٹر مجیب احمد" اسوسیٹ پروفیسر، کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی، "ڈاکٹر ندیم احمد" اسیسٹینٹ پروفیسر، کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی، "پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم" شعبہء اردو، آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی۔ "پروفیسر ڈاکٹر محمد امتیاز" شعبہء اردو، آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی "پروفیسر ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے" شعبہء طبیعیات، کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی، "پروفیسر ڈاکٹر ندیم کوثر" شعبہء اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی، "پروفیسر ڈاکٹر کوثر مظہری" شعبہء اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی، "پروفیسر ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی" شعبہء سنسکرت، پورنیہ یونیورسٹی، بہار، "پروفیسر ڈاکٹر محمد شاہد رزمی" صدر شعبہء اردو، مونگیر یونیورسٹی، بہار، "ماسٹر رفیع "مظفر پور، ریاست بہار، "پروفیسر ڈاکٹر بلرام شکلا "شعبہء سنسکرت، "مولانا محمد شاہد عادل قاسمی"، پرنسپل مدرسہ یتیم خانہ، بہار ہیں، یہ تمام افراد میگزین کی ترقی کے لیے معاون رہے ہیں۔

سہ ماہی رسالہ تاریخِ ادبِ اردو اپنی علمی اہمیت، تحقیقی معیار اور منفرد خصوصیات کے سبب ایک اہم، مرتبت اور وسیع مجلہ ہے، اور انہی خوبیوں کے باعث اسے یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ تاریخ ادب اردو نہ صرف عام ناظرین کے لیے نافع ہے بلکہ زیرِ تعلیم افراد اور اہلِ ادب کے لیے بھی ایک نمایاں اور قیمتی علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے خاص طور پر طالب علم بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اس رسالے کے ذریعے مستقبل میں بھی اہم ادبی شخصیات اور علمی موضوعات سے متعلق مستند اور بنیادی معلومات حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوتے رہیں گے۔

ماخذ۔

۔1 تاریخِ ادب اردو، جلد۔۳، شمارہ۔۴(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱)

۔2رینو کے شہر میں از حقانی القاسمی، ص-۲۲۵، سنہ اشاعت۲۰۰۷، اداری دعوت القرآن، مقام وپوسٹ، ڈوبا، ضلع اراریا

۔3 تاریخ ادب اردو، جلد۔۳، شمارہ۳،(جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱)

***

# تعلیم کی زبان یا زبان کی تعلیم؟
# قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے تناظر میں ہندوستان میں کثیر لسانیت کی تعلیمی معنویت

ڈاکٹر ندیم احمد
اسسٹنٹ پروفیسر (شعبۂ اردو کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)
ڈاکٹر پروین کمار سرجن
اسسٹنٹ پروفیسر (اسکول آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ

تلخیص

یہ تحریر قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے تناظر میں ہندوستان میں کثیر لسانی تعلیم کی تعلیمی اور تہذیبی اہمیت کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کو بچوں کی فکری نشوونما، ثقافتی شناخت اور نفسیاتی اعتماد کے لیے بنیادی قرار دیا گیا ہے۔ مقالہ این ای پی ۲۰۲۰ کے کثیر لسانی وژن اور اس کے عملی نفاذ میں درپیش چیلنجز، جیسے اساتذہ کی تربیت، نصابی مواد کی کمی، والدین کی انگریزی مرکز سوچ اور زبان کی سیاست، پر روشنی ڈالتا ہے۔ ساتھ ہی یہ واضح کرتا ہے کہ ٹیکنالوجی اور مناسب پالیسی ہم آہنگی کے ذریعے کثیر لسانی تعلیم کو تعلیمی مساوات اور قومی یکجہتی کا مؤثر ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

**کلیدی الفاظ:** قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰, کثیر لسانی تعلیم, مادری زبان, سہ لسانی فارمولا, تعلیمی مساوات, لسانی تنوع

بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں زبانیں صرف الفاظ کی زنجیر نہیں بلکہ جذبات، روایات اور تاریخ کی جیتی جاگتی روح ہیں۔ یہاں کی ہر گلی، ہر بستی، ہر شہر اپنے اندر ایک مخصوص لسانی نغمہ سموئے ہوئے ہے، جیسے ایک عظیم سمفونی ہال میں ہزاروں ساز بیک وقت گونج رہے ہوں۔ قومی تعلیمی پالیسی دو ہزار بیس، جو عام طور پر این ای پی دو ہزار بیس کے نام سے موسوم ہے، نے اسی سمفونی کو تعلیم کے مرکز میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس پالیسی کا جوہر کثیر لسانیت

ہے، یعنی درس و تدریس کے ایسے نظام کا قیام جہاں طفل اپنی ماں بولی میں سوچے، سمجھے، اور اظہار کرے، پھر تدریجاً ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کے امتزاج سے آگے بڑھے۔ یہ خیال محض علمی ارتقا تک محدود نہیں بلکہ تہذیبی بقا کا بھی مظہر ہے، کیونکہ جب کوئی بچہ اپنی زبان میں تعلیم پاتا ہے تو اس کا اعتماد جڑ پکڑتا ہے اور وہ دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مگر یہ نظریہ جب عمل کی سرزمین پر اترتا ہے تو اسے بے شمار رکاوٹوں کے خارزار سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے یاد ہے، کئی برس قبل جب میں ایک دور افتادہ گاؤں کے اسکول میں گیا تو دیکھا کہ بچے جو گھروں میں تیلگو بولتے تھے، کلاس میں ہندی کی کتابیں ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی الجھن تھی اور استاد کی آواز ان کے کانوں سے زیادہ فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ این ای پی دو ہزار بیس، جسے انتیس جولائی دو ہزار بیس کو کابینہ نے منظور کیا تھا، اب دو ہزار پچیس میں قدم رکھ چکی ہے، مگر اس کا کثیر لسانی باب تاحال ایک نامکمل داستان کی طرح معلق ہے۔ یہ تحریر انہی چیلنجز اور رکاوٹوں کو دریافت کرنے کی ایک کوشش ہے جو لسانی، معاشی، سماجی اور سیاسی سطح پر بکھری پڑی ہیں، اور ساتھ ہی ان حکمتِ عملیوں پر بھی غور کرتی ہے جو اس خواب کو ایک زندہ حقیقت میں بدل سکیں۔ یہ سب کچھ ایک مسلسل بہاؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے، جیسے کوئی بزرگ استاد اپنے شاگردوں کے سامنے اپنی یادوں اور تجربوں کا خزانہ بے ساختہ طور پر کھول دے، بغیر کسی عنوان یا فہرست کے، محض دل کی گہرائیوں سے۔ سب سے پہلے بھارت کی لسانی دنیا کا دریچہ. کھولتے ہیں تاکہ منظر صاف ہو۔ یہاں دستور کے آٹھویں شیڈول میں بائیس زبانیں باضابطہ تسلیم کی گئی ہیں، جن میں ہندی، بنگالی، تامل، تیلگو، ملیالم، مراٹھی، گجراتی، پنجابی اور دیگر شامل ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی انفرادی روح رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں علاقائی بولیاں اور قبائلی زبانیں بھی ہیں، جیسے سانتھالی جو جھارکھنڈ میں بولی جاتی ہے، گونڈی جو چھتیس گڑھ کے جنگلات میں گونجتی ہے، بوڈو جو آسام کی پہاڑیوں میں بسی ہے، یا کوکبک جو شمال مشرق کی قبائلی بستیوں کی پہچان ہے۔ پیپلز لینگویج سروے آف انڈیا، جو دو ہزار ایک میں شائع ہوا، اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ یہاں سات سو اسی سے زائد زبانیں رائج ہیں، جو دنیا کی کل لسانی تنوع کا تقریباً دس فیصد ہیں۔ یہ تنوع بھارت کی اصل طاقت ہے، مگر تعلیمی نظام میں اسے سنبھالنا ایک نازک چیلنج بن چکا ہے۔ این ای پی دو ہزار بیس کی شق چار اعشاریہ گیارہ میں واضح طور پر درج ہے کہ پانچویں جماعت تک تعلیم ماں بولی، مقامی یا علاقائی زبان میں دی جانی چاہیے، اور اس کے بعد تین زبانوں کا فارمولا اپنایا جائے: علاقائی

زبان، ہندی یا اس کے متبادل میں کوئی اور، اور انگریزی۔ یہ پالیسی یونیسکو کی دو ہزار تین کی سفارشات سے متاثر ہے جو بین الاقوامی یومِ مادری زبان کے موقع پر پیش کی گئی تھیں، جن کے مطابق کثیر لسانی ماحول میں تعلیم حاصل کرنے سے بچوں کی علمی استعداد میں بیس سے تیس فیصد تک اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ مفہوم کو اپنی فطری زبان میں پہلے جذب کرتے ہیں اور بعد میں دوسری زبانوں کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ "ماں بولی" کی تعریف کیا ہے؟ شہری بچے گھر میں ایک زبان، اسکول میں دوسری، اور سڑک پر تیسری زبان سنتے ہیں تو ان کی حقیقی ماں بولی کون سی مانی جائے؟ دیہی علاقوں میں تو یہ مسئلہ اور بھی گہرا ہے، جہاں قبائلی بچوں کی بولیاں جو تقریباً سات اعشاریہ پانچ فیصد آبادی بولتی ہے، سرکاری نصاب میں شامل ہی نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر اڑیسہ کے مالک انجبھا گڑھ ضلع میں سانتھالی بولنے والے بچوں کو اوڑیا میں تعلیم دی جاتی ہے، جو ان کے ثقافتی پس منظر سے مطابقت نہیں رکھتی اور ان کے لیے ذہنی انتشار پیدا کرتی ہے۔ این ای پی نے اس کا حل تلاش کرنے کے لیے نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، مگر دو ہزار پچیس کی تازہ ترین یو ڈی آئی ایس ای پلس رپورٹ کے مطابق صرف بیالیس فیصد ابتدائی اسکولوں میں مادری زبان میں تدریس کا آغاز ہوا ہے، جب کہ اٹھاون فیصد اب بھی ہندی یا انگریزی پر انحصار کر رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار اس امر پر compel کرتے ہیں کہ ہم ان چیلنجز پر غور کریں جو محض عملی نہیں بلکہ گہرے سماجی مسائل سے جڑے ہیں۔ چیلنجز کی فہرست طویل ہے مگر سب سے. بنیادی مسئلہ اساتذہ کی تربیت اور تیاری کا فقدان ہے، جو کثیر لسانی کلاس روم کی روح ہے۔ بھارت میں تقریباً ستانوے لاکھ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں جن میں سے ستر فیصد سرکاری اسکولوں میں ہیں اور باقی نجی اداروں میں۔ مگر ان میں کتنے ایسے ہیں جو کثیر لسانی تدریس کے ماہر ہوں؟ نیشنل اچیومنٹ سروے دو ہزار اکیس، جس کی تازہ کاری دو ہزار چوبیس میں ہوئی، یہ ظاہر کرتا ہے کہ صرف بائیس فیصد اساتذہ کو علاقائی زبانوں میں پڑھانے کی بنیادی تربیت ملی ہے، حالانکہ این ای پی دو ہزار بیس نے بی ایڈ، ڈی ای ایل ایڈ اور دیگر تربیتی کورسز میں کثیر لسانی ماڈیولز کو شامل کرنے کا واضح حکم دیا تھا۔ نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن نے دو ہزار بائیس میں نیشنل کریکیولم فار ٹیچر ایجوکیشن جاری کیا، جس میں پچاس گھنٹوں کی ان سروس ٹریننگ کا ذکر ہے، مگر اس پر عمل درآمد نہایت سست روی سے ہو رہا ہے۔ اس تاخیر کی بنیادی وجہ ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹس آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ اور اسٹیٹ کونسلز میں وسائل

کی شدید کمی ہے، جہاں نہ تربیت کار دستیاب ہیں، نہ معیاری مواد، اور نہ ہی مناسب فنڈنگ۔ ایک استاد جو خود ہندی یا انگریزی میں تعلیم یافتہ ہو، وہ تامل ناڈو کے دیہی اسکول میں تامل میں تدریس کیسے کرے؟ میں نے ایسے متعدد اساتذہ سے ملاقات کی ہے جو بتاتے ہیں کہ وہ کلاس میں محض ترجمے میں وقت گزارتے ہیں، مگر وقت کی تنگی کے باعث طلبہ کی توجہ بکھر جاتی ہے، نتیجتاً نہ پہلی زبان میں پختگی آتی ہے نہ دوسری میں روانی۔

کورونا وبا نے اس مسئلے کو مزید واضح کر دیا۔ دو ہزار بیس سے دو ہزار بائیس کے دوران آن لائن کلاسوں میں انگریزی انٹر فیس کی وجہ سے دیہی بچوں کا پینتالیس فیصد ڈراپ آؤٹ ریکارڈ کیا گیا، جیسا کہ اینول اسٹیٹس آف ایجوکیشن رپورٹ دو ہزار تئیس میں ظاہر ہوا۔ این ای پی کا کثیر لسانی خواب جو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز جیسے دکشا پر مبنی ہے، انٹرنیٹ کی کمی کے باعث ادھورا رہ جاتا ہے، کیونکہ دو ہزار پچیس تک بھی صرف پچپن فیصد دیہی اسکولوں میں براڈ بینڈ کی سہولت موجود ہے، جیسا کہ ٹرائی کی رپورٹ بتاتی ہے۔ یہ سب عوامل مل کر اساتذہ کو ایک ایسے معرکے میں دھکیل دیتے ہیں جہاں وسائل کم اور توقعات زیادہ ہیں۔ کثیر لسانی تعلیم کا دوسرا بڑا چیلنج نصابی مواد کی تیاری ہے۔ جب تک نصاب بچے کی اپنی زبان میں دستیاب نہ ہو، وہ علم کے سمندر میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نے اگرچہ فاؤنڈیشنل لیول کے لیے بارہ زبانوں میں ابتدائی درسی مواد تیار کیا ہے، مگر ملک میں بولی جانے والی سات سو زبانوں کے تناظر میں یہ محض ایک قطرہ ہے۔ ریاستی سطح پر چند نمایاں مثالیں ضرور موجود ہیں، جیسے کرناٹک میں کُورچ، مہاراشٹر میں بھِلی، اور جھارکھنڈ میں سانتھالی زبانوں کے پرائمری نصاب کی تیاری، لیکن ان منصوبوں کی رسائی محدود ہے۔ کئی ریاستیں اب بھی قومی نصاب کے ترجمے پر انحصار کر رہی ہیں، جن میں اکثر مفاہیم کے ترجمے میں بامعنی ربط کھو جاتا ہے۔

مثلاً "نیچر اسٹڈی" کے انگریزی ماڈیول کا لفظی ترجمہ "قدرتی مطالعہ" جب قبائلی بچے کے سامنے آتا ہے، تو وہ قدرت کو اپنے تجرباتی دائرے سے جوڑنے کے بجائے اسے کتابی علم کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسی طرح "سائنس" کے لیے بعض مقامی زبانوں میں کوئی ہم معنی اصطلاح ہی موجود نہیں، اس لیے معلم کو ہر سبق میں تشریح اور تمثیل کے ذریعے مطلب سمجھانا پڑتا ہے۔ اس عمل میں وقت کا ضیاع ہوتا ہے اور تعلیمی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

کثیر لسانی تدریس کے نفاذ میں ایک اور بڑی. رکاوٹ والدین کا رویہ ہے۔ والدین میں ایک عام خیال رائج ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم ہی ترقی کی کنجی ہے، چنانچہ وہ بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخل کروانے کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے انہیں اپنی زبان کے اسکول پاس ہی کیوں نہ ملیں۔ اس طرزِ فکر کے پیچھے تاریخی اور سماجی عوامل کارفرما ہیں۔ نو آبادیاتی دور سے لے کر آج تک انگریزی کو طاقت، روزگار اور وقار کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی علاقوں میں بھی اب انگریزی بولنے کو "ترقی" اور "مہذبیت" کا معیار تصور کیا جانے لگا ہے۔ این ای پی دو ہزار بیس نے اگرچہ واضح کیا ہے کہ انگریزی کا رد نہیں کیا جارہا بلکہ اس کے ساتھ مقامی زبانوں کو بھی برابر کا درجہ دیا جارہا ہے، تاہم زمینی سطح پر یہ توازن قائم کرنا دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ ایک طرف سرکاری اسکولوں میں ماں بولی کی ترویج کی بات کی جاتی ہے، دوسری طرف نجی اسکولوں میں والدین کی خواہش کے مطابق انگریزی میڈیم کا دائرہ مسلسل پھیلتا جارہا ہے۔ نتیجتاً سماجی درجہ بندی کی ایک نئی لکیر کھنچتی جارہی ہے: ایک طبقہ وہ جو اپنی مادری زبان میں پڑھتا ہے، اور دوسرا وہ جو انگریزی میں تعلیم حاصل کر کے بہتر مواقع حاصل کرتا ہے۔ کثیر لسانیت کے اس منظر نامے میں ایک اور. پہلو بھی توجہ طلب ہے، اور وہ ہے زبانوں کے باہمی تعلق کا سوال۔ بھارت کی زبانیں الگ الگ درخت نہیں بلکہ ایک ہی تہذیبی جنگل کی شاخیں ہیں۔ ہندی، اردو اور فارسی کا باہمی رشتہ اس کی سب سے روشن مثال ہے۔ ایک ہی جملے میں ہندی کا دھیرج، اردو کا لطف اور فارسی کا حسن ایک ساتھ بولتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے تعلیمی نظام میں ان رشتوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ نصاب میں زبانوں کے اس باہمی اشتراک پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اگر کوئی استاد بچوں کو یہ سکھائے کہ "دل" اور "قلب" ایک ہی جذبے کے دو نام ہیں، یا "روشنی" اور "نور" ایک ہی مفہوم کے دو زاویے ہیں، تو شاید وہ زبانوں کے درمیان دیوار نہیں بلکہ پل تعمیر کرے۔ این ای پی دو ہزار بیس نے اگرچہ اس فکری ربط کو تسلیم کیا ہے، مگر اس پر عمل درآمد کے لیے کسی منظم منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ زبانوں کی سیاست سے جڑا. ہوا ہے۔ بھارت میں زبان محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں بلکہ شناخت، اقتدار، اور بعض اوقات مزاحمت کا نشان بھی ہے۔ ہندی کو قومی زبان کا درجہ دینے کی بحث ہو یا جنوبی ریاستوں میں علاقائی زبانوں کے تحفظ کی تحریکیں، زبان کا سوال ہمیشہ جذبات اور سیاست کے بیچ پھنسا رہا ہے۔ کثیر لسانی پالیسی کے

نفاذ کے وقت یہی تنازعہ سر اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر، تامل ناڈو نے تین زبانوں کے فارمولے کی مزاحمت کی اور دو زبانوں (تامل اور انگریزی) پر اصرار کیا، کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ہندی کے فروغ سے مقامی شناخت متاثر ہو گی۔ اسی طرح شمال مشرقی ریاستوں میں کئی مقامی زبانوں کے علمبرداروں نے مطالبہ کیا کہ ان کی زبانوں کو بھی تدریسی ذریعہ بنایا جائے، مگر وسائل کی کمی کے باعث حکومت انہیں مکمل طور پر شامل نہ کر سکی۔

یہ تضادات ظاہر کرتے ہیں کہ کثیر لسانی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے محض تعلیمی اصلاح کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک ثقافتی مصالحت بھی درکار ہے، جہاں ہر زبان کو برابری اور احترام کے ساتھ قبول کیا جائے۔ اسی پس منظر میں ایک امید کی کرن نئی ٹیکنالوجی کی شکل میں ابھرتی ہے۔ مصنوعی ذہانت اور خودکار ترجمہ کے جدید اوزار تعلیم میں لسانی فاصلے کم کر سکتے ہیں۔ مثلاً "بھاشانیٹ"، "اِندکسن"، اور "این ایل پی انڈیا" جیسے منصوبے اب ہندوستانی زبانوں کے درمیان خودکار ترجمے کی سہولت فراہم کر رہے ہیں۔ این ای پی نے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مستقبل کا تعلیمی ڈھانچہ ٹیکنالوجی کے ذریعے کثیر لسانی تعامل کو فروغ دے گا۔

نیشنل ڈیجیٹل ایجوکیشنل آرکیٹیکچر (NDEAR) کے تحت بنائے گئے پلیٹ فارمز جیسے دِکشا اور سوَیم پر اب مختلف ریاستوں کی زبانوں میں تعلیمی مواد اپلوڈ کیا جا رہا ہے۔ اس اقدام سے یہ امید بندھی ہے کہ آنے والے برسوں میں زبان تعلیم کی دیوار نہیں بلکہ پُل بن جائے گی۔ تاہم ٹیکنالوجی تک رسائی اب بھی غیر مساوی ہے۔ شہروں میں جہاں ہر ہاتھ میں موبائل اور انٹرنیٹ موجود ہے، وہیں دیہی علاقوں کے اسکول آج بھی بجلی اور نیٹ ورک کے انتظار میں ہیں۔ اس تفاوت کو دور کیے بغیر کثیر لسانی خواب ادھورا ہی رہے گا۔

کثیر لسانی تدریس کے چیلنجز میں ایک پہلو جذباتی و نفسیاتی بھی ہے، جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب کسی بچے کو اپنی زبان میں پڑھایا نہیں جاتا تو وہ اپنی شناخت سے کٹنے لگتا ہے۔ اس کے اندر احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی زبان کم تر ہے۔ میں نے خود ایسے بچوں کو دیکھا ہے جو اسکول میں ہندی بولنے سے جھجکتے ہیں کیونکہ وہ "انگریزی اسکول" کے تصور سے مرعوب ہیں۔ این ای پی دو ہزار بیس کا ایک غیر علانیہ مقصد اسی احساسِ کمتری کو ختم کرنا ہے۔ زبان کو عزت دینا دراصل انسان کو عزت دینے کے مترادف ہے۔ کثیر لسانیت کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ صرف تعلیمی نہیں بلکہ تہذیبی ہم آہنگی کا ذریعہ بھی ہے۔ جب ایک بچہ مختلف زبانوں کے الفاظ، محاورے

اور لہجے سنتا ہے تو اس کا ذہن کشادگی اختیار کرتا ہے۔ وہ فرق کو قبول کرنا سیکھتا ہے اور تنوع کو حسن سمجھنے لگتا ہے۔ بھارت جیسے ملک میں جہاں مذہب، نسل، طبقہ اور زبان کی بنیاد پر اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہاں کثیر لسانی تعلیم دراصل قومی یکجہتی کا عملی مظہر بن سکتی ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر "ایک بھارت، شریشٹھ بھارت" کا خواب تعبیر پاتا ہے۔ زبانوں کے درمیان ہم آہنگی، قوموں کے درمیان محبت پیدا کرتی ہے، اور یہی این ای پی دو ہزار بیس کے پس منظر میں سب سے بڑی روحانی قدر ہے۔

اس تناظر میں اساتذہ کی تربیت، نصاب کی مقامی تشکیل، اور ٹیکنالوجی کے متوازن استعمال کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ذہنی ماحول کی تشکیل بھی ضروری ہے جہاں زبان کو تفریق نہیں بلکہ ربط کا وسیلہ سمجھا جائے۔ اسکولوں میں کثیر لسانی سرگرمیوں جیسے ترجمہ مقابلے، مادری زبان کے دن کی تقریبات، اور دو لسانی کہانی گوئی کے پروگرام اس سمت میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ نیشنل ایجوکیشنل ٹکنالوجی فورم نے حال ہی میں ایک سفارش پیش کی ہے کہ ہر اسکول میں کم از کم دو زبانوں میں تدریسی مواد دستیاب ہو، تاکہ طلبہ اپنی مادری زبان اور ایک دیگر زبان کے درمیان باہمی تبادلے سے علم حاصل کر سکیں۔ یہ امر بھی اہم ہے کہ کثیر لسانیت کو صرف ابتدائی سطح تک محدود نہ رکھا جائے۔ جب طلبہ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر پہنچتے ہیں تو اکثر ان کی مادری زبانوں کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ جامعات میں انگریزی ہی غالب تدریسی زبان ہے۔ اگر تحقیق، سائنسی مباحث اور علمی مکالمات کو علاقائی زبانوں میں بھی فروغ دیا جائے تو تعلیم میں حقیقی شمولیت ممکن ہو سکتی ہے۔ دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اور عثمانیہ یونیورسٹی نے اس ضمن میں کچھ مثبت قدم اٹھائے ہیں۔ مثلاً "ملٹی لِنگول ریسرچ سینٹرز" کا قیام، جہاں مختلف زبانوں میں علمی مواد کا ترجمہ اور اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہ اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کثیر لسانیت محض ایک تعلیمی تصور نہیں بلکہ مستقبل کی علمی سیاست کی سمت طے کرنے والا اصول ہے۔

کثیر لسانیت کے نفاذ کے لیے پالیسی ساز اداروں کے درمیان بہتر ہم آہنگی بھی ناگزیر ہے۔ وزارتِ تعلیم، این سی ای آر ٹی، یو جی سی، اور ریاستی تعلیمی محکموں کے درمیان واضح رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی اسکیمیں نیم فعال رہ جاتی ہیں۔ این ای پی نے ایک "نیشنل مشن آن لینگویجز" کے قیام کی تجویز دی تھی جو مختلف زبانوں کے فروغ اور تدریسی استعمال کے لیے مرکزی نگران ادارہ ہو، مگر دو ہزار پچیس تک اس کا عملی خاکہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اگر یہ مشن

جلد عمل میں آ جائے تو نصابی مواد، اساتذہ کی تربیت، اور ٹیکنالوجی کے استعمال میں یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ کثیر لسانیت کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری شرط "رویہ" ہے۔ جب تک ہم زبانوں کو برتری یا کم تری کے پیمانے پر تولتے رہیں گے، تب تک تعلیم میں مساوات ممکن نہیں۔ زبان کو محض ذریعۂ علم نہیں بلکہ ایک تہذیبی سرمایہ سمجھنا ہو گا۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ بنگالی میں شاعری کی نرمی، تامل میں فلسفے کی گہرائی، اردو میں بیان کی نزاکت، اور ہندی میں روایت کی مضبوطی، سب مل کر ہماری مشترکہ شناخت بناتے ہیں، تبھی کثیر لسانیت حقیقی معنوں میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ این ای پی دو ہزار بیس کا کثیر لسانی تصور بھارت کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں نہ صرف تعلیمی برابری کا پیغام ہے بلکہ تہذیبی احترام، قومی یکجہتی اور عالمی مکالمے کی تمنا بھی شامل ہے۔ چیلنجز بے شک کم نہیں وسائل کی قلت، نصاب کی پیچیدگی، سیاسی اختلافات، اور والدین کے تصورات مگر اگر نیت مضبوط ہو اور وژن واضح، تو یہ سب رکاوٹیں زائل ہو سکتی ہیں۔ کثیر لسانی تعلیم دراصل وہ آئینہ ہے جس میں بھارت اپنی اصل صورت میں جھلکتا ہے رنگا رنگ، متنوع، مگر ایک۔ یہی اس قوم کی طاقت ہے، یہی اس کی پہچان۔

مراجع / حوالہ جات


حکومتِ ہند، وزارتِ تعلیم۔ (۲۰۲۰). قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ (National Education Policy 2020). نئی دہلی: وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT). (2021). Position Paper on Multilingual Education. نئی دہلی: این سی ای آر ٹی۔

نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (NCTE). (2022). National Curriculum Framework for Teacher Education (NCFTE). نئی دہلی۔

یونیسکو۔ (۲۰۰۳). Education in a Multilingual World. (پیرس: UNESCO.

نیشنل اسٹیٹسٹیکل آفس (NSO). (2024). Annual Status of Education Report (ASER 2023-24). نئی دہلی۔

نیشنل ایجوکیشنل ٹکنالوجی فورم (NETF). (2024). Digital Inclusion and Language Equity Report. نئی دہلی۔

پیپلز لینگویج سروے آف انڈیا۔(۲۰۰۱ .The People's Linguistic Survey of India. (نئی دہلی: بھارت بھاشا پریشد۔

وزارتِ ٹیلی کمیونیکیشن، حکومتِ ہند۔(۲۰۲۵ .TRAI Report on Rural Internet Connectivity. ). نئی دہلی۔

نیشنل ڈیجیٹل ایجوکیشنل آرکیٹیکچر (NDEAR). (2023). Policy Framework for Multilingual Digital Learning. نئی دہلی۔

احمد، ن۔(۲۰۲۵). بھارتی کلاس رومز میں کثیر لسانی تدریس کا نفاذ: قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے تناظر میں چیلنجز اور حکمتِ عملی. دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

***

# فارسی اوراردو مخطوطہ شناسی کے، مسائل اوران کا حل

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی وفارسی، الہٰ آباد یونیورسٹی

**کلیدی الفاظ:**

مخطوطہ شناسی، دستاویز، قرات متن، قدیم وکہنہ، ارزش وافادیت، ادبی وفرہنگی، افہام وتفہیم، اصول وضوابط، معاون ومددگار، تصحیح وتدوین، تنقید وتحقیق، مہر واسناد، تقدم وتاخر، ترقیمہ وتملیکہ، طباعت واشاعت، تخریج وتعلیقات، شواہد داخلی وخارجی، تذکرے وتواریخ، تصرفات وتغیرات، مایہ ناز و گرانقدر، تہذیب وثقافت، قومی وبین الاقوامی، عصر قدیم وموجودہ، مسائل ومشاکل، متروک ومعدوم، تحفظ ونگہداری، انفرادی واجتماعی، فخر وافتخار۔

**خلاصہ:**

مخطوطہ کسی تحریری نمونہ کو کہاجاتاہے، یہ تحریر کسی کتاب سے نقل بھی ہوسکتی ہے اور طبع زاد بھی، طویل بھی اور مختصر بھی، اصطلاحی معنی میں مخطوطہ سے مراد ایک ایسی کتاب لی جاتی ہے جس کو ہاتھ سے لکھا گیاہو، پریس کی ایجاد سے قبل کتابوں کو ہاتھ سے لکھ کر محفوظ کیے جانے کا رواج تھا، مخطوطہ لکھنے والے کو خطاط اوراس کی تحریر کو خطاطی کہتے ہیں، مخطوطہ شناسی کی روائت بہت ہی قدیم اور کہنہ رہی ہے۔ گوناگوں جہات ونکات کے سبب مخطوطہ شناسی کے اس پر ارزش فن کی معنوئیت واہمیت عصر حاضر میں بھی اسی طرح قائم ودائم ہے، مخطوطہ شناسی تحقیق اور تدوین کی بنیادی ضرورت ہے کیونکہ اس فن پر کامل دستگاہ حاصل کیے بغیر ہم ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہوسکتے ہیں، مخطوطہ شناسی کے عمل میں تحقیق وتنقید اور تصحیح وتدوین کا بنیادی اور اہم مقصد حقائق کی تلاش، سچ کی جستجو، مناسب انداز سے واقعات کو

ترتیب دینا اور خالص منطقی انداز سے اس کے نتائج نکال کر دنیا کے سامنے پیش کرنا سب سے اہم ہے تاکہ آئندہ لوگ اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی آگے کے راستوں کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکیں، مخطوطہ کی تصحیح و تدوین کے لیے مخطوطہ شناس کو بہت سے مسائل، مشکلات اور مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے یہ ہی سبب ہے کہ دورہ موجودہ میں شعور ولاشعوری دونوں ہی اعتبار سے اس فنِ پر ارزش کی طرف سے بے اعتنائی اور لاپرواہی اختیار کی جارہی ہے اور موجودہ دور کے دانشوروں کے لیے یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا ہے، بااین ہمہ آج بھی فارسی واردو زبان کے بعض ایسے خاموش اور بے ریا خدمت گار ضرور موجود ہیں جو اس کام کو اپنا فریضہ ادبی سمجھ کر، پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی کوششوں اور مشقتوں سے اس سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لیے دل وجاں سے سرگرداں ہیں، مخطوطات کی تصحیح وتدوین سے منسلک محققین اور ناقدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخطوطہ شناسی کے تمام آداب وضوابط سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہوں، ایک مخطوطہ شناس کے لے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت ایک مورخ بھی ہو اور لغت شناس بھی، سکّہ شناس بھی ہو اور کتبہ شناس بھی، دقیق بین بھی اور دور اندیش بھی، مہر شناس ہو اور تصویر شناس بھی ہو، نقش و نگار اور علم خط وغیرہ میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک و قوم کی بے لوث خدمت ومحبت کا جذبہ بھی اس میں پایا جاتا ہو کیوں کہ ان خصوصیات کے بغیر مخطوطات کی تدوین و تحقیق یا تصحیح و تنقید کے تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے، ایک سہل پسند، غیر مستقل مزاج اور سطحی ذہن کا انسان اس کار گراں کو درست طریقے سے انجام تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی ایک عام فہم مخطوطہ شناس کی تحقیق و تدوین اس کے ملک اور قوم کو کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ مخطوطہ شناس جب کسی متن کو ترتیب دے رہا ہو تو اس کو حواشی، مقدمہ، متن کا زمانہ تصنیف، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، زبان وبیان، اور داخلی وخارجی شواہد کا تعین وغیرہ کے درست تعین کے سلسلے میں غیر معمولی استعداد ولیاقت کا مالک ہو، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسے اہم نکات ہیں جن کا جاننا ہر مخطوطہ شناس کے لیے لازم ہے۔ مثلاً مخطوطہ کی جلد، کاغذ، روشنائی، رسم الخط، زبان، املا، داخلی شواہد، ترقیمہ، دست خط، مہریں اور تملیکہ وغیرہ کے متعلق درست جانکاری حاصل کرنا بھی اس کے لیے بے حد اہم بلکہ لازم ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو تدوین پر اس وقت تک دسترس حاصل نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ تحقیق کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ تدوین کتب کے لیے مخطوطہ شناسی انتہائی ضروری عمل ہے۔ چوں کہ تدوین، تحقیق سے آگے کی منزل ہے اس لیے تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی کو کافی اہم قرار

دیا جاتا رہا ہے لیکن افسوس کہ موجودہ زمانے میں اس قیمتی ورثے کی حفاظت و نگہداری سے شعوری ولاشعوری طور پر لاپرواہی اختیار کی جارہی ہے۔ یہ مخطوطات ہمارے اسلاف کے بہترین تہذیبی اور علمی کارناموں وکاوشوں کا عظیم ترین اثاثہ ہیں، ان کی مدد سے وطن عزیز کے عہد گذشتہ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ذہنی، فکری، جذباتی اور نفسیاتی حالات کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان مخطواطت کی رہنمائی سے ہی آئندہ نسلیں رہنمائی اور تقویت حاصل کرتی ہیں، ان کا سہارا لے کر یا ان کو مشعل راہ بنا کر لے کر چلنے سے اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھانا قدرے آسان اور سہل ہو جاتا ہے لہٰذا یہ مخطوطات ہمارے مستقبل کی کامیابی کے ضامن ہیں، آج بھی ہمارے ملک ہندوستان میں اردو اور فارسی مخطوطات کا اتنا عظیم، بیش قیمت اور گران قدر سرمایہ موجود ہے کہ جن کی ارزش واہمیت کا درست اندازہ لگا پانا بھی ہمارے احاطہ گمان سے باہر ہے، ان مخطوطات میں بہت سی ایسی چیزیں مل جائیں گی جو ہماری علمی، ادبی اور تاریخی زندگی میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں مگر افسوس کہ وقت اور حالات کی ناسازگاری اور ہماری اپنی بے نیازی وبے اعتنائی کے سبب ہم اپنے اس بیش قیمت اور گرانقدر ورثے پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ فارسی واردو زبان وادب کی اس کساد بازاری کے دور میں ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم نے اپنی اس قیمتی وراثت کو سنبھال کر نہ رکھا، تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی شاندار تاریخ اور بہترین ادبی روایات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے۔ زمانہ موجودہ میں ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مخطوطہ شناسی اب شخصی کام نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کے لئے اب صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی پیمانے پر سنجیدہ اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے، اردو، عربی اور فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اس طرف خصوصی توجہ مبذول کرنا بے حد ضروری ہو گیا ہے، عصر حاضر کے اس حبس زدہ ماحول میں، زبان وادب کے بے لوث اور بے غرض خدمات گاروں کی انفرادی واجتماعی کاوشوں کی مدد سے ہی اپنے اجداد کے اس گراں قدر سرمایہ سے مستفیض ہوا جاسکتا ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو سکے اردو وفارسی ادب سے تعلق رکھنے والے دانشور اپنی انفرادی واجتماعی طور پر انھیں محفوظ کرنے کے لیے ہمیں سنجیدہ اور ٹھوس اقدامات اٹھائیں، تاکہ آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں کی ان کاوشوں کا نہ صرف اعتراف کریں بلکہ ان پر فخر وافتخار بھی کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ ان سے استفادہ کرتے ہوئے ترقی کے راستوں پر آگے بڑھ سکیں اور احساس کم

تری کا روح فرسا احساس ان کے دل سے محو ہو سکے اور وہ بھی ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے اپنے قومی و قار اور ملکی عظمت پر ہمیشہ نازوافتخار کر سکیں۔

مخطوطہ سے مراد کوئی بھی ہاتھ سے لکھی ہوئی وہ کتابیں، دستاویزات اور تحریریں ہوتی ہیں جن کو زیور طباعت سے آراستہ نہ کیا گیا ہو، مخطوطہ کو انگریزی زبان میں "Manuscript" کہا جاتا ہے، وہ لوگ جو مخطوطہ لکھتے ہیں انھیں خطاط کہا جاتا ہے اور ان کی تحریروں کو خطاطی کہتے ہیں، اور وہ شخص کسی کام کی اصل تحریر غور و فکر کرنے کے بعد تحریر کرتا ہے اس کو مصنف کہا جاتا ہے اور جو کسی اور کی تحریروں کو نقل کرتا ہے اس کو کاتب کہتے ہیں، خطوطہ نویسی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں کسی متن کو ہاتھ سے لکھا جاتا ہے، پھر وہ متن چاہے کسی کتاب کی شکل میں ہو، یا دستاویز یا شاعری، یا پھر کسی اور صورت میں ہمارے سامنے موجود ہو، شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں مخطوطہ شناسی اور مخطوطہ نویسی کی تاریخ بہت قدیم اور کہنہ رہی ہے، پرنٹنگ کی ایجاد سے پہلے تمام تر ضروری دستاویزات اور کتابوں کی تیاری یا ان کو محفوظ رکھنے کا بنیادی طریقہ یہ ہی ہوتا تھا کہ کاتب یا مخطوطہ نویس کسی دانشور کی علمی وادبی کاوش کو قلمی نسخے کی شکل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ طباعت کی آمد سے پہلے کے تمام دستاویزات اور کتابیں مخطوطات کی شکل میں ہی محفوظ ہوتی تھیں اور تحقیق اور تدوین وغیرہ کے میدان میں تو مخطوطہ کی یہ اصطلاح آج بھی خصوصی طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ مخطوطے کی تعریف کے ضمن میں بعض دانشوروں کا ماننا یہ بھی ہے ہر قلمی تحریر یا دستاویز کو مخطوطہ نہیں کہا جا سکتا ہے، بلکہ کسی بھی تحریر کو مخطوطہ صرف اور صرف اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی طباعت نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ ایسی تحاریر جو چھاپہ خانے کی ایجاد سے قبل لکھی گئیں ہیں، صرف انھیں قلمی تحریروں پر مخطوطات کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مشہور

و معروف محقق، ناقد اور دانشور آقائے شفیق انجم مخطوطات کی بڑی جامع مانع اور پر از معلومات پیش کی ہے ذیل میں اس کی چند سطور پیش کی جارہی ہیں وہ مخطوطہ میں بارے میں لکھتے ہیں:

"مخطوطات سے مراد مشینی چھپائی سے قبل کی تحریریں ہیں، عام طور پر قلمی تحریروں کو مخطوطہ کہنے کا رواج ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ہر قلمی تحریر مخطوطہ نہیں ہوتی، مخطوطات کا اطلاق قبل از طباعت کی تحریروں پر ہوتا ہے۔ مخطوطات کے لیے روشنائی سے کاغذ پر لکھنا بھی شرط نہیں ہے۔ یہ کسی دھات، کپڑے، پتھر، چمڑے اور اسی نوعیت کی دیگر اشیاء پر کھدے ہوئے ہوں، ابھارے ہوئے یا چسپاں بھی ہوسکتے ہیں۔ پس قلمی کا مفہوم یہاں قلم کی مناسبت سے نہیں بلکہ دورِ طباعت سے قبل کے ان وسیلوں کی مناسبت سے ہے، جو متن کو تحریری شکل میں لانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے"۱

اردو زبان وادب کے ایک اور بہت ہی عظیم الفکر اور مایہ ناز مفکر، محقق اور ناقد ڈاکٹر گیان چند جین نے مخطوطہ کی تعریف پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

"ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر مخطوطہ کہلاتی ہے یہ تحریر ایک صفحے پر مشتمل ہو، یا ایک ہزار پر، ایک سال پرانی ہو یا ایک ہزار سال، کاغذ پر لکھی ہوئی ہو یا پھر کھجور کی چھال پر، پتھر پر کندہ ہو یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر، بہر حال اس کو تحقیق و تدوین کی زبان میں مخطوطہ کہا جائے گا"۲

یہاں اعجاز رازق کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کرنا بھی ضرور معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے مخطوطہ کے درست معنی و مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایسی دستاویز جو خطی ہو یا ٹائپ کی ہو، (اس میں کاربن کاپیاں بھی شامل کی جاتی ہیں) اس میں خطوط، تاریں، روزنامچے، رسیدیں، ذاتی حالات، فہرستیں، اجلاس کی رودادیں، معاہدے، ٹیکس

کے ریکارڈ، قانونی سرٹیفکٹ (پیدائش ، شادی ، انتقال، وغیرہ) ادبی کتب، تقاریر اور دوسری دستاویزات کے اصل مسودات، جو شخصیات یا افراد سے متعلق ہوں، ان میں شامل ہوتے ہیں ۔"[۳]

اردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں مخطوطہ کے لفظ، قسم اور اصطلاح کی تشریح و توضیح بہت ہی جامع و مانع انداز میں پیش کی گئی ہے اس کا ایک مختصر اقتباس ذیل میں درج کیا جارہا ہے تاکہ مخطوطہ کے درست معنی و مفہوم اخذ کرنے میں ہمیں مزید مدد مل سکے:

"زمانہ قدیم میں اس قلمی نسخے کو مخطوطہ کہا جاتا تھا جو پیپرس پر لکھا جاتا تھا۔ بعد ازاں قلمی تحریریں جھلی نما اشیاء پر اور کاغذ کی ایجاد پر یہ تحریریں اس پر لکھی جانے لگیں۔ مخطوطات کی متعدد اقسام ہیں مثلاً وہ مخطوطات جو مطلاً و مذہب ہوں یا وہ مخطوطات جن پر سلاطین و امراء کی مہریں یا اُن کے دستخط ثبت ہوں۔ یا وہ مخطوطات جو فتوحات کے موقع پر سلاطین اور سپہ سالاروں کو اموال غنیمت میں حصہ آئے۔ یا وہ مخطوطات جنہیں خود مصنفین نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور وہ بوجوہ شائع نہ ہو سکے۔ یا وہ مخطوطات جن کو مشہور خطاطوں نے لکھا- شوقین حضرات قیمتی قسم کے مخطوطات کو خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں"[۴]

مخطوطات خواہ وہ کسی بھی ملک و قوم کی تاریخ، سیاست، ادب، مذہب، تہذیب اور ثقافت وغیرہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں، وہاں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کرنے میں ہمارے بڑے معاون و مددگار ہوتے ہیں اپنے اسی بیش قیمت سرمایہ کی مدد سے ہی ہم اپنے ثقافتی و تہذیبی ورثے سے منسلک ہوتے ہیں اور صرف ہماری معلومات ہی میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ ہماری غور و فکر کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ انھیں کے ذریعے ہمیں تحقیقی و تنقیدی مواد حاصل ہوتا ہے، اور انھیں کی مدد سے ہم ماضی کی بازیافت کر سکتے ہیں ان مخطوطات میں موجود ذی قیمت معلومات محققین کو تازہ موضوعات اور نئے زاویوں سے روشناس کراتی ہے، اور انہیں اپنے تحقیقی کام کو مزید بہتر

بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ مخطوطات کی ابتدا کب، کہاں اور کیسے ہوئی ہے ؟ اس کا جواب دینا تو قدرے مشکل ہے، کیونکہ مخطوطات کی تاریخ اس قدر قدیم اور پرانی ہے کہ ہمارے محققین و مفکرین کی دور رس نگاہیں بھی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں، البتہ قیاس کی بنیاد پر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے تکلم میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد پتھروں، چٹانوں، درختوں کی چھالوں اور جانوروں وغیرہ کی کھالوں کو محفوظ کیا ہو گا اور انھیں اشیا کو بعد میں، مخطوطات کی تیاری میں بروئے کار لایا گیا ہو گا، ابتدائی دور میں مخطوطات کو تیار کرنے کے لیے انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوششوں کا سہارا لیا گیا ہو گا، اور جب کشور چین میں سب سے پہلے، کاغذ کا اختراع ہوا تو پھر مخطوطہ نویسی کی دنیا میں بھی ایک خاص اور مثبت انقلاب پیدا ہو گیا اور ۱۴۳۹ عیسوی میں جب جرمنی میں پہلی بار چھاپہ خانہ کو قائم کیا گیا، تو مخطوطہ نویسی کی روائت میں بھی بے شمار تبدیلیاں اور تغیرات پیدا ہو گئے اور طول و طویل زمانے تک ان تغیرات و تبدیلیوں کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہا۔

مخطوطات کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ ان کی مدد سے ہم کو کسی بھی ملک کے زبان اور ادب کے ارتقاء کو سمجھنے میں خصوصی مدد ملتی ہے اور ان مخطوطات میں موجود مختلف تحریری انداز بیان اور سبک زبان کے استعمال سے محققین و ناقدین کو زبان کے مختلف پہلوؤں کی تفہیم و افہام میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطات میں تاریخی واقعات، شخصیات، اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بھی بیش قیمت اور اہم معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں، اور انھیں معلومات کے ذریعے ہمیں عہد گذشتہ یعنی ماضی کے بارے میں ایک سچی اور حقیقی تصویر فراہم ہوتی ہے اور ان کے ذریعے ہمیں ماضی میں ظہور پذیر ہونے والے گوناگوں واقعات، سانحات اور حوادثات سے سبق سیکھنے میں بھی خاصی مدد حاملتی ہے جو آئندہ کے لیے مشعل راہ کی طرح کام کرتی ہے۔

ہمارے یہ مخطوطات علم و ادب اور غور و فکر کے شعبوں میں بھی بڑے گہرے، راسخ اور ہمہ گیر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان میں موجود نظریات اور افکار محققین، مورخین اور طالب علموں وغیرہ کے لیے ایک بیش قیمت دولت کی

طرح ہیں، اور علم وادب کی پیش رفت اور ترقی میں بڑا اہم اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم قدرے گہرائی اور دیانت داری کے ساتھ ان مخطوطات کا مطالعہ کریں تو ہم کو پتہ چلے گا کہ ہمارا زیادہ تر قدیم تاریخی، سیاسی، معاشرتی تعلیمی، اورادبی سرمایہ ان مخطوطات کی شکل میں ہی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ مخطوطات انسانی تہذیب وتمدن کی سب سے زیادہ اہم اور بیش قیمت وراثت تصور کیے جاتے ہیں، جو انسانی روایات واقدار کو نسل در نسل آگے پہنچاتے ہیں، یہ مخطوطات نہ صرف کسی ملک اور قوم کی تہذیب وتمدن بلکہ مختلف علوم وفنون کی تاریخ کو آگے بڑھانے میں بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر میں ہمارے ملک وقوم کا تمام تر قدیم تاریخی، علمی اورادبی سرمایہ ان مخطوطات ہی کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان مخطوطات کی حفاظت اور نگہداری کی ذمہ داری بھی ہماری ہی ہے، ان مخطوطات کی مدد لئے بغیر ہم اپنی تاریخی اورادبی روایات کی جڑوں تک رسائی پانے میں صد فی صد کامیاب نہیں ہوسکتے ہیں، ڈاکٹر انجم رحمانی نے اپنے ایک مضمون میں مخطوطات کی اہمیت وارزش کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مخطوطات انسان کی تہذیبی کارناموں کا عظیم قیمتی ورثہ ہے۔ یہ انسان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ذہنی، فکری، جذباتی اور نفسیاتی حالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ماحول اور فضا کو پیش کرتے ہیں جس میں وہ تخلیق ہوئے۔ یہ انسانی معاشرہ کی روایات اور اقدار کے امین ہوتے ہیں۔ جس سے آئندہ نسلیں رہنمائی حاصل کرلیتی ہیں۔ یہ ماضی کے یادگار واقعات وحالات کا ریکارڈ ہوتے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے انسان میں مستقبل سے نمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ ماضی کی سائنسی، تکنیکی ایجادات کی پیش رفت کا دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف گامزن ہونا آسان ہوجاتا ہے''۵

ہمارا ملک ہندوستان ابتدا ہی سے عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور دیگر زبانوں کے مخطوطات کی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے پوری دنیا میں خاصی شہرت اوراہمیت کا حامل رہا ہے، تاریخ کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جس

وقت عالم اسلام پر وحشی اور علم وادب سے نا آشنا تاتاری قوم ایک تباہ کن آندھی بن کر اپنا تسلط قائم کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی، اور اس آندھی بلکہ تند و تیز طوفان نے ہمہ طرف ظلم و ستم کا ایک ایسا قہر برپا رکھا تھا کہ جس کا تصور کرنے سے ہی سے روح میں ارتعاش اور قلم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے، جس وقت تاتاری قوم نے ظلم واستبداد سے ہر خاص وعام کو ہراساں اور خوف زدہ کر رکھا تھا، اس وقت ہندوستان ملک پر مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ یہ حکومت مستحکم ومضبوط بھی ہوتی جا رہی تھی، ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت اہل ہند کے حق میں بڑی رحمت ثابت ہوئی تھی، کیونکہ یہ مسلم فرمان روا بڑے ہی عدل پرست، شجاع، علم نواز اور ادب پرور تھے، ان کے داد و دہش اور کرم فرمائیوں کی دل انگیز داستانیں، سن سن کر نہ جانے کتنے شاعر، ادیب اور علما اپنا وطن عزیز چھوڑ کر ہندوستان کی سرزمین پر قدم رنجا ہوئے، اور جلد ہی اس دیار غیر کی فضاؤں میں اس طرح رچ بس گئے کہ پھر اپنے وطن واپسی کا خیال تک بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ غیر ملکی دانشور اپنے ساتھ اپنی بہت سی علمی کتابوں اور ادبی جواہر پاروں کو بھی لے کر آئے تھے ، تاکہ ہندوستان کے ادب نواز اور علم پرور بادشاہوں کے یہاں ان کے علم وہنر کو حمایت و پذیرائی اور داد و تحسین حاصل ہو سکے، ان ہندوستانی بادشاہوں نے بھی ان غیر ملک سے آئے دانشوروں کو انعام واکرام سے نوازنے اور ان پر اپنے لطف وکرم کی بارش کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی اختیار نہیں کی، اور نہ ہی ان کو کبھی ان کی بے وطنی کا روح فرسا احساس ہونے دیا، ان بادشاہوں کی فیاضیوں و زر پاشیئوں اور دانشوروں کی ادبی صلاحیتوں ولیاقتوں کی علمی وادبی کاوشوں سبب ہی، دورہ موجودہ میں ہندوستان کے تقریباً تمام ہی بڑے بڑے کتب خانے، مخطوطات کی قیمتی دولت سے مالا مال ہیں اور ہمارے محققین وناقدین کے دست ہنر مند کے منتظر ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ”مردی از غیب برون آید وکاری بکند“ اور فارسی واردو مخطوطات میں تو ہندوستانی تہذیب کی تمام تر قدیم اور دلچسپ داستانیں سمٹی ہوئی ہیں، ان مخطوطات کی مدد لیے بغیر ہم اپنے وطن عزیز کی شاندار وجاندار روایات کے متعلق درست واقفیت

حاصل نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ ہی یہاں کی حقیقی تاریخ سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں، لہٰذا گمنامی کے اندھیروں میں سسکتے ہوئے ان مخطوطات کی تصحیح و تدوین، اور ان کی درست قدر و قیمت کا تعین کرنا، ہمارے لئے نہ صرف ضروری، بلکہ دورہ موجودہ میں تو لازمی تصور کرنا چاہیے۔

فارسی اور اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور پیشرفت و فروغ میں ہندوستان میں تحریر کیے جانے والے مخطوطات کی اہمیت وافادئیت ہمیشہ سے ہی مسلم رہی ہے اور آج بھی ان کی ادبی، تاریخی، ثقافتی، لسانی اور تحقیقی ارزش وافادئیت میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ دن بہ دن افزوں ہی ہوتی چلی جارہی ہے، بھلے ہی دورہ حاضر کی علمی کساد بازاری اور ہماری بے حسی کے سبب ان پر بہت زیادہ توجہ صرف نہ کی جارہی ہو، با این ہمہ یہ مخطوطات خصوصاً عربی و فارسی اور اردو مخطوطات ہمارے اسلاف کے تہذیبی کارناموں کا ایسا بیش قیمت ورثہ ہیں جو ہمیں ماضی کے تابناک اور درخشندہ دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ذہنی، فکری، جذباتی اور نفسیاتی حالات کی بیش قیمت معلومات فراہم کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ہمارے پاس مختلف علوم وفنون سے متعلق جو بیش قیمت علمی سرمایہ موجود ہے، وہ ابتدائی زمانے میں مخطوطات کی صورت میں ہی محفوظ تھا، ان مخطوطات کی ادبی اور تاریخی حقائق کو منظر عام پر لانا اور ان کی درست قدر و قیمت سے دنیا کو روبرو کرانا اس بحرانی اور پر انتشار صورتحال میں ہمارا اہم ترین فریضہ بن جاتا ہے کہ ان مخطوطات سے نہ صرف یہ کہ ہم استفادہ کریں بلکہ دیگر اقوام کو بھی ان سے فیض یاب ہونے کی دعوت دیں، کشور ہندستان کی بے شمار ایسے کتب خانے اور سرکاری و غیر سرکاری ادارے موجود ہیں جہاں فارسی واردو مخطوطات کا بڑا نایاب ونادر ذخیرہ موجود ہے مگر افسوس کہ ہماری بے اعتنائی، کم توجہی کے سبب وہ ذخیرہ اب تباہ وبرباد ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں لوگوں کے ذاتی ذخیرے بھی کچھ کم اہمیت کے حامل قرار نہیں دیئے جاسکتے ہیں، مگر فارسی زبان سے عدم واقفیت اور اردو زبان بے اعتنائی کے سبب یہ ذاتی ذخائر بھی اب انتہائی خراب وخستہ حالت میں نظر ہیں اور بعض تو ایسے بھی ہیں جو کہ دستبرد زمانہ کے ہاتھوں فنا ہو

کر صفحہ قرطاس سے اپنے نام ونشان محو کر چکے ہیں، لیکن ہمیں یہ بات ہر گز بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، کہ یہ مخطوطات انسانی تہذیب و ثقافت کی اساس اور جدید تمدن کا شاندار اور جان دار ستون ہیں۔ اور یہ ہی سبب ہے کہ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں مخطوطات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ہمارا بیشتر قدیم علمی وادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہی آج ہمارے پاس محفوظ ہے۔ قدیم تواریخ و تذکرے، سوانح و سیرت، داستانیں، مثنویات اور شعرا کے دواوین وغیرہ سب کے سب مخطوطات کی شکل میں ہی موجود ہیں اور ہمیں بار بار اس حقیقت کا اعتراف کرنا بے حد ضروری ہے کہ ان مخطوطات کے بغیر ہم اپنی ادبی روایات کی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے حال کو درخشاں اور تابندہ بنا سکتے ہیں۔

ہندوستان کی مختلف دانش گاہوں اور کتب خانوں کی زینت بنے یہ مخطوطات ہمارے اسلاف کے مستحکم ومضبوط حکمت عملیوں، مختلف النوع سیاسی وسماجی واقعات وحالات، تجربات اور مشاہدات کا نہائت شاندار اور جاندار ریکارڈ کہے جاسکتے ہیں، جن کی معاونت ومدد سے ہم اپنے حال کو بہتر بنا سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مستقبل کے لیے بہترین حکمت عملیاں بھی اختیار کر سکتے ہیں، یعنی ان مخطوطات کی بنیاد پر ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف گامزن ہونا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ ابتدائی زمانے سے لے کر دورہ حاضر تک اردو وفارسی مخطوطات ایک قیمتی وراثت سمجھے جاتے رہے ہیں جو ہمیں ماضی کے بارے میں اہم معلومات فراہم نہیں کرتے ہیں، بلکہ آئندہ آنے والے چیلنجز اور مشکلات سے مقابلہ کرنے کے لئے بھی توجہ طلب مواد فراہم کرتے ہیں، لہٰذا ان مخطوطات کی حفاظت ونگہداری ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے، تاکہ آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں کے اس قیمتی سرمایہ پر ناز وافتخار کر سکیں اور موجودہ دنیا میں روز بروز رونما ہونے والی ترقیات واختراعات میں نمایاں حصہ داری نبھا سکیں۔

فارسی اور اردو زبان و ادب میں کسی مخطوطہ کی تصحیح وتدوین یا ترتیب و تحقیق کی اہمیت ابتدا ہی سے خاصی اہمیت کی حامل رہی ہے، ان زبانوں کے اب تک نہ جانے کتنے مخطوطات منظر عام پر آکر قومی اور بین الاقوامی سطح

پر آفاقی و عالمگیری شہرت حاصل کر چکے ہیں، کسی بھی مخطوطے کی درست تصحیح و تدوین کے لیے کچھ اصول و قواعد کی پابندی لازمی ہے تاکہ کسی بھی مخطوطے میں موجود حقائق کو زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لایا جا سکے، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تحقیق یا ریسرچ کا بنیادی مقصد حقائق کی تلاش، سچ کی جستجو، مناسب انداز سے واقعات کو ترتیب دینا اور خالص منطقی انداز سے نتائج نکالنا ہوتا ہے۔ مخطوطہ شناسی کے لیے تحقیق کے ہمہ بنیادی اصولوں سے واقفیت رکھنا بھی ضروری ہے۔ حواشی، مقدمہ، متن کا زمانہ تصنیف، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعین وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا جاننا ہر محقق اور مخطوطہ شناس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس بات سے کوئی بھی صاحب فہم انکار نہیں کر سکتا ہے کہ تصحیح و تدوین و تنقید مخطوطہ پر اس وقت تک کوئی دسترس و کمال حاصل نہیں کر سکتا، جب تک وہ تحقیق ک و تنقید کا مزاج نہ رکھتا ہو، تدوین کے عمل کے لیے مخطوطہ شناسی انتہائی ضروری ہے۔ چوں کہ تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے اس لیے تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی کو کافی اہم قرار دیا جاتا ہے۔ تحقیق کی طرح تدوین کے لیے بھی مخصوص مسائل، آداب اور ضابطے ہیں۔ اور اس کے لیے مخطوطہ شناسی کا علم سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔یہ مخطوطات انسان کی انفرادی اور اجتماعی لغزشوں فروگزاشتوں اور خطاؤں کے عکاس ہوتے ہیں جن سے آئندہ نسلوں کے افراد اور ابھرنے والی اقوام درس عبرت حاصل کرتی ہیں اور زندگی میں کامیابی کے لئے رہنما اصول مرتب کرتی ہیں۔ مخطوطہ شناسی یا تحریر شناسی ایک ہمہ گیر اور وسیع شعبۂ علم ہے جس کی اہمیت و افادیت از زمان گذشتہ تا عصر حاضر مسلم رہی ہے۔ البتہ یہ شعبۂ علم جس قدر ناگزیر ہے اسی قدر اس کی تلاش و جستجو، قرأت و مطالعہ اور اصول و ضوابط دشوار کن اور اعصاب شکن بھی ہے۔

خطوطے میں مندرج حواشی، مقدمہ، متن کا زمانۂ تحریر، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعین وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ صرف کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو تدوین پر اس وقت تک دسترس نہیں ہو سکتی جب تک وہ تحقیق کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی انتہائی ضروری شرط ہے۔ چونکہ تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے اس لیے تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی کو کافی اہم بلکہ لازم قرار دیا جاتا ہے۔ تحقیق کی طرح تدوین کے لیے بھی مخصوص مسائل، آداب اور ضابطے ہیں جس کے لیے مخطوطہ شناسی کا علم بے حد ضروری ہے۔ جب کسی مخطوطے کو موضوع بنایا جاتا ہے تو اس کی اصلیت یا اسناد کے

بارے میں سب سے پہلے اطمینان کرنا بہت زیادہ اہم ہے۔ مخطوطہ شناسی کا علم صرف تاریخی اورادبی نقطہ نظر سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے ان مخطوطات اور قلمی نسخوں کا تعلق بہت گہرااور راسخ ہے، یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ مخطوطہ شناسی کا عمل نہایت ہی وقت طلب، مشکل اور دشوار کن ہے، کسی بھی مخطوطے کو مرتب کرنے کا مقصد محض ایک کتاب کو گمنامی کے اندھیروں سے نکال کر شائع کر دینا ہر گز بھی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا اصل مقصد، پوشیدہ حقیقتوں کو مستند و معتبر دلائل وبراہین سے ثابت کرتے ہوئے انھیں درست طریقے منظر عام پر لانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس فن میں عروج وکمال حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ طور پر ذہنی مشق اور مسلسل جاں فشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اورزمانہ موجودہ میں چونکہ مخطوطہ شناسی اور تحقیق کا کام ہماری اپنی ہی غفلت اور ناقدری کا شکار ہو گیاہے، اس لیے اہل علم وہنر نے بھی اس کام کی طرف سے بے اعتنائی اور بے نیازی اختیار کر لی ہے بقول شاعر ''اس نے نظر جو پھیر لی ہم نے بھی جام رکھ دیا''لیکن موجودہ وقت کی تمام تر ناسازگاری ونامساعدی حالات کے باوجود یہ بات ہمارے لیے باعث تقویت ہے کہ آج بھی بہت سے بے لوث محققین، بے غرض مدون اور دانشور ضرور ایسے موجود ہیں اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں، جو گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ستائش کی تمنااور صلہ کی پروا کیے بغیر اس بے انتہامشکل، دشوار اور پیچیدہ کام کو سر کرنے میں مستغرق و منہمک ہیں لیکن افسوس کہ اب اردو اور فارسی زبان وادب کے ان خاموش اور بے لوث خدمت گاروں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے جو بہت تشویش ناک بات ہے اور ہمیں اس سلسلے میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے بہر حال یہ ایک طول وطویل بحث ہے، جس پر پھر کسی وقت گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں میں اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے سب سے پہلے مخطوطہ شناسی کے فن سے متعلق بعض بے حد اہم اور ضروری اصطلاحات کے بارے میں سرسری طور پر بات کروں گی، کسی بھی مخطوطے خصوصاً فارسی یا اردوزبان میں تحریر کیے گئے مخطوطات کی تصحیح وتدوین کرتے وقت ہمارے ذہن میں ان اصطلاحات کے درست معنی اور مفہوم واضح ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلا نام تملیک کا لیاجاسکتاہے۔

**ا۔ تملیک:**

لفظ ''تملیک'' عربی زبان کے ملک سے نکلا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ملکیت ہونا، کسی چیز کا مالک ہونا یا کسی شے پر اپنا پورا حق ہونا، مخطوطہ شناسی کے عمل میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی قلمی نسخہ، جس شخص کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو تملیک کہا جاتا ہے، تملیک میں قلمی نسخہ کا نام مختلف مقامات پر آتا ہے اور فارسی یا اردو زبان کے مخطوطات میں تملیک عام طور پر چہرہ پر درج کیا جاتا ہے جس سے آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مخطوطہ کس کی ملکیت ہے۔

**۲۔ چہرہ:**

''چہرہ'' کا لفظی مطلب صورت، چہرہ اور مکھڑا ہوتا ہے، مخطوطے میں چہرہ سے مراد، وہ سرورق ہوتا ہے جس پر اس نسخہ کا نام، مصنف کا نام، نقش و نگار، مصوری کے اعلیٰ نمونے وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں، یہ تمام لوازمات ہمیں مخطوطے کے سرورق پر نظر آتے ہیں، عرض دیدہ کی مہریں اور اسناد وغیرہ بھی اسی صفحہ پر ثبت کی جاتی ہیں اسی لیے اس کو چہرہ کہا جاتا ہے۔

**۳۔ عرض دیدہ نسخہ:**

''عرض دیدہ'' سے مراد ''دیدہ شد'' یعنی دیکھا ہوا۔ عرض دیدہ کی یہ اصطلاح مغل عہد میں قدرے کثرت سے رائج تھی، جب مغل بادشاہوں کے پاس، کسی شاعر یا مصنف کے قلمی نسخہ کو لے کر آتے تھے، تو بادشاہ ان پر نظر ثانی کر کے، اس پر عرض دیدہ کی مہر ثبت کر دیتے تھے، ہمیں مغل عہد کے بے شمار قلمی نسخے دیکھنے کو مل جائیں گے، جن پر اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کی مہریں ثبت کی گئی ہیں جو ہمیں اکثر ان مخطوطوں کے اول یا آخر کے صفحات میں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کا مطلب بادشاہ کا دیکھا ہوا ہوتا ہے۔

**۴۔ ترک، رکاب، پاورق، خارجہ:**

اگر فارسی یا اردو مخطوطات کے حوالے سے مذکورہ بالا الفاظ کی بات کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے وہ الفاظ جو کاتب صفحہ تمام ہو جانے کے بعد، صفحے کے آخیر کونے میں صفحہ آیندہ کی شروع کی عبارت میں لکھ دیتے ہیں، اور ایسا اس لیے کیا جاتا تھا کہ پڑھنے والے کو یہ پتہ رہے کہ یہ آئندہ صفحہ ہے، عموماً قدیم عہد کی فارسی قلمی کتابوں میں صفحہ

نمبر درج نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ دائیں ہاتھ کے صفحہ کے نیچے بائیں کونے میں اگلے صفحہ کی ابتدا کے ایک دو لفظ لکھ دیئے جاتے تھے، انھیں کو "ترک"، "رکاب"، "پاورق" اور "خارجہ" وغیرہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔

**۵۔ حوض:**

"حوض" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی پانی جمع کرنے کی جگہ ہے، جو قدرتی طور پر یا انسانوں کی مدد سے بنائی گئی ہو۔ مخطوطات میں حوض سے مراد صفحے کے متن والے حصے کے چاروں طرف بنا ہوا چوکھٹا یا حاشیہ کو حوض کہا جاتا ہے. بعض اوقات کسی صفحے پر یہ حوض یا حوضہ صرف تین طرف ہوتا ہے یعنی دائیں، بائیں اور نیچے کی طرف، اور بعض قلمی نسخوں میں چاروں طرف بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

**۶۔ باریکہ:**

باریکہ کا لفظی مطلب باریک بالوں والے قلم کے ہوتے ہیں جس کی مدد سے مصور باریک خط کھینچتے ہیں، مخطوطہ شناسی میں باریکہ سے مراد حاشیہ، کنارہ، یا وہ باریک لکیر ہے جو متن کے علاوہ کتاب کے صفحات کے کناروں پر کشیدہ کیا جاتا ہے، عام طور پر یہ باریکہ حواشی اور اصل متن کو الگ کرتا ہے اور اگر ہم فارسی مخطوطات کی بات کریں تو ہمیں باریکہ کا استعمال خاصی فراوانی کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔

**۷۔ حاشیہ، حواشی اور تحشیہ:**

حاشیہ، حواشی یا تحشیہ کسی بھی متن کی تصحیح کرتے وقت بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے، اس کا مطلب ہے کسی متن کے ساتھ دی گئی اضافی معلومات یا وضاحت یا تشریح۔ حاشیہ واحد ہے جبکہ حواشی اسی کی جمع ہے اور تحشیہ بھی لگ بھگ انھیں معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اوران کا استعمال کسی کتاب، مضمون یا کسی بھی تحریر میں کسی خاص لفظ، جملے یا پیراگراف کی وضاحت یا تشریح کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ معلومات متن کے نیچے کی طرف، کتاب کے آخر میں یا پھر کسی الگ جگہ پر دیا جاتا ہے۔

**۷۔ رسم الخط:**

"رسم الخط" سے مراد کسی زبان کو لکھنے کے لیے استعمال ہونے والے علامات کا نظام ہے، رسم الخط وہ طریقہ ہے جس میں خیالات اور معلومات کو تحریری شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے اور پھر دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے، دوسرے

الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ رسم الخط سے مراد کسی زبان کو لکھنے کا ایک مخصوص طریقہ یا نظام ہے۔ رسم الخط وہ علامات اور قواعد ہیں جنہیں لکھ کر خیالات او معلومات کو محفوظ اور منتقل کیا جاتا ہے۔

**۸۔ناقص الاول نسخہ:**

"ناقص الاول نسخہ" اس نسخہ یا مخطوطہ کو کہا جاتا ہے، جس کتاب کا ابتدائی حصہ ناقص ہو یعنی مکمل نہ ہو، یہ اصطلاح عام طور پر کسی ایسے قلمی نسخے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس نسخے کے ابتدائی صفحات کرم خوردہ ہو گئے ہوں یا پھٹ گئے ہوں یا پھر غائب ہو گئے ہوں، یعنی جب کسی نسخہ کے سرورق یا ابتدائی صفحات کسی وجہ سے الگ ہو گئے ہوں اس قسم کے نقص کی وجہ سے مخطوطہ ناقص الاول نسخہ کہلاتا ہے۔

**۹۔ناقص الاوسط نسخہ:**

جیسا کہ اس کے نام سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "ناقص الاوسط نسخہ" ایسے مخطوطات کو کہا جاتا ہے جس نسخہ کے درمیان کے صفحات میں نقص پایا جاتا ہو یا وہ اصل کتاب سے نکل گئے ہوں یا خراب ہو گئے ہوں اس قسم کے مخطوطات کو ناقص الوسط یا ناقص الاوسط نسخہ کہلاتا ہے۔

**۱۰۔ناقص الآخر نسخہ:**

"ناسخ الآخر نسخہ" سے مراد وہ قلمی نسخہ یعنی مخطوطہ ہوتا ہے جس نسخہ کے آخری صفحات میں کسی قسم کا کوئی نقص یا خامی وغیرہ پائی جاتی ہو، بالفاظ دیگر کسی مخطوطے کو پانی، دھوئیں وغیرہ سے اس کے صفحات خراب ہو گئے ہوں، یا پھر کسی وجہ سے اصل کتاب سے الگ ہو کر غائب ہو گئے ہوں اس قسم کی کتابوں کو عام طور پر ناقص الاخر نسخہ کہا جاتا ہے۔

**۱۱۔ناقص الطرفین نسخہ:**

نسخہ اول و آخر کے نقص کی وجہ سے کوئی نسخہ "ناقص الطرفین نسخہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے نسخے جو دونوں جانب سے نامکمل، ادھورا یا خراب، ناقص ابتدا اور انتہا والا، یعنی وہ کتاب یا قلمی نسخہ جو بیک وقت ناقص الاول اور ناقص الآخر ہو، یعنی ابتدائی صفحات اور آخری صفحات کسی سبب سے خراب ہو گئے ہوں یا پھٹ گئے ہوں اس قسم کے قلمی نسخے کو ناقص الطرفین نسخہ کہا جاتا ہے۔

**۱۲۔ آب دیدہ نسخہ:**

''آب دیدہ نسخہ'' ایسے قدیم نسخے کو کہا جاتا ہے۔ جو پانی کی بوندیں وغیرہ پڑنے کی وجہ سے خراب ہو گیا ہو اور اس کو پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے یعنی پانی کی وجہ سے خراب شدہ مخطوطہ کو آب دیدہ نسخہ کہا جاتا ہے۔

**۱۳۔ آتش دیدہ نسخہ:**

جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ''آتش دیدہ نسخہ'' عام طور پر ایسے نسخہ کو کہا جاتا ہے جو آگ یا دھوئیں وغیرہ کی وجہ خراب ہو گیا ہو اس میں وہ تمام نسخے شامل ہوتے ہیں جو آگ یا دھوئیں کی وجہ سے پڑھنے میں نہ آتے ہوں۔

**۱۴۔ کرم خوردہ نسخہ:**

کرم خوردہ نسخہ سے مراد وہ نسخہ ہوتا ہے جو درست نگہداشت نہ ہو پانے کے سبب، کیڑے مکوڑوں کے ذریعے خراب کیا گیا ہو یعنی ایسی قلمی کتاب جس کو دیمک یا دیگر کیڑے مکوڑوں نے چاٹ لیا ہو اور محقق کے لیے اس کا پڑھنا دشوار ہو، کرم خوردہ نسخہ کہلاتا ہے۔

**۱۵۔ خوانا و ناخوانا نسخہ:**

جیسا کہ اس کے نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ایسا نسخہ جس کو پڑھا جا سکے اس کو ''خوانا'' نسخہ کہتے ہیں اور ایسا مخطوطہ جس کو پڑھا نہ جا سکے اس کو ''ناخوانا'' نسخہ کہا جاتا ہے۔

**۱۶۔ نسخہ دریدہ:**

ایسا نسخہ جو بہت خراب حالت میں رہا ہو یا پھر اس کو محفوظ کرنے کی غرض سے اس کو دوبارہ کسی نے جلد کیا ہو یا اس کی صحت و درستگی کی ہو، یعنی اگر طول و طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے کوئی نسخہ خراب ہو گیا ہو اور بعد میں اس کی جلد سازی کی گئی ہو ایسے نسخے کو عام طور پر ''دریدہ نسخہ'' کہا جاتا ہے۔

**۱۷۔ انجامہ یا ترقیمہ:**

قدیم نسخوں کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض مخطوطے کے آخر میں کاتب کی جانب سے اختتامیہ عبارت رقم کی جاتی تھی جس کو انجامہ یا ترقیمہ کہا جاتا ہے، اس میں کاتب کا نام، قلمی نسخہ کے مصنف یا فرمایش کنندہ کا نام، زمان

ومکان، کتابت، اختتامی شعر وغیرہ درج کیا جاتا ہے فارسی واردو کی قدیم کتابوں یا مخطوطات کے آخر میں اکثر انجامہ یا ترقیمہ دینے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

**فارسی اوراردو مخطوطہ شناسی کے مسائل:**

فارسی زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے ،اس دنیا کی تاریخ میں اس شیرین ودلنشین زبان کی جڑیں بہت گہری اور بڑی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔اس زبان کی موجودہ شکل فنکاروں کی برسہابرس کی محنت وریاضت اور دانشوروں کی مسلسل جہدوکوشش کا ثمرہ ہے، اس زبان وادب کے اصول وقواعد اور شعر وشاعری نے مختلف ادوار میں ارتقاوعروج پایاہے،اس زبان کی تاریخ چونکہ ہزاروں سال پر محیط ہے اس لیے اس کے ادب پر کام کرنا بھی اسی قدر مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ جس زبان کا ادب جتنا زیادہ قدیم ہوتا ہے اس کی تفہیم وافہام میں اتنے ہی زیادہ مسائل، مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں فارسی زبان وادب کی قدامت سے بھی اپنی جگہ مسلم ہے اس لیے اس زبان کی کتابوں کی جمع وتدوین یا تحقیق وتنقید میں بھی محقق یا مخطوطہ شناس کو بڑے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور اکثر اوقات تو محقق کے تمام تر غور وفکر اور جہدوکوشش کے باوجود بھی تسلی بخش نتائج برآمد نہیں ہو پاتے ہیں یہاں پروفیسر شریف حسین قاسمی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے اس جانب اشارہ کیاہے کہ قدیم ترین نسخوں پر کام کرنا کس قدر مشکل اور پیچیدہ عمل ہے وہ لکھتے ہیں:

> ”فارسی زبان اور اس کے ادب کی قدامت بھی مسلم ہے، اس لیے یہاں بے شمار مسائل ہیں، ایک بڑی تعداد ہے ایسے شعرا، ادبا، عرفااور دیگر صاحبان علم ودانش ہیں، جن کی جائے پیدائش ، تاریخ ولادت ووفات اور جای وفات کا علم نہیں ، فردوسی ،سعدی ، حافظ وغیرہ فارسی زبان وادب کے لات ومنات ہیں، ان کی تاریخ ولادت ووفات میں بھی اختلاف ہے ،اسی طرح بعض

کتابوں کے مصنفین کا علم نہیں، باقاعدہ مرتبہ کوئی بھی فارسی متن اٹھالیجئے، حواشی میں اختلاف نسخ کی بھرمار نظر آئے گی"۔[۶]

مخطوطات چاہے وہ فارسی میں ہوں یا اردو میں یا پھر کسی اور زبان میں، ان کی ارزش و اہمیت اور قدر و قیمت اظہر من الشمس ہے، اور یہ ہی سبب ہے کہ مخطوطات ہر زمانے میں دانشوروں، محققین اور مفکرین کی توجہ اپنی جانب کھینچتے رہے ہیں، لیکن یہ بھی ایک بہت تلخ بلکہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ عصر حاضر میں اس پل پل رنگ بدلنے والی دنیا، اور نئے زمانے کی چکاچوند نے ان مخطوطات پر گویا گرد و غبار کی دبیز تہہ چڑھادیں ہیں جس کی وجہ ہماری نئی نسل ان کی عظمت و اہمیت سے کماحقہ واقفیت حاصل نہیں کر پارہی ہیں، لیکن علم وادب کی اس کساد بازاری کے پر آشوب حالات میں بھی یہ بات ہمارے لیے باعث تقویت ہے کہ اب بھی یہ مخطوطہ شناسی ماضی کی نہائت مضبوط و توانا اور علمی و ادبی، تہذیبی روایت کی امانت دار ہے، اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ مخطوطہ شناسی نے اپنی بے پناہ اثر انگیزی، علمی قوت اور ادبی تابندگی سے، ہمارے ملک کے تہذیبی سفر کو بے پناہ برنائی اور توانائی بخشی ہے اور عہد گذشتہ کی یادگار یا یاداشت کے طور پر ہماری یہ جاندار اور شاندار مخطوطہ شناسی کی روایت انسانی اذہان و قلوب کے لیے تدبر و تفکر اور غور و فکر کا نیا اوت تازہ سامان فراہم کرتی رہے گئی یہ مخطوطات ہمارے قومی تشخص کے لیے بہت زیادہ اہمیت اور عظمت کے حامل ہیں، لہٰذا ان مخطوطات کا تحفظ، نگہداری اور ان کو ڈیجیٹلایز شکل میں پیش کرنا بلاشبہ ہماری آنے والی نسلوں پر بڑا احسان اور منفعت بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ اب میں مندرجہ ذیل سطور میں مخطوطہ شناسی سے متعلق بعض بہت ہی اہم اور بنیادی قواعد و ضوابط کے متعلق نشان دہی کرنے کی کوشش کروں گی، جو کسی بھی مخطوطہ شناس کے لیے، اردو و فارسی یا عربی وغیرہ کے قلمی نسخے کی تلاش و تحقیق اور ترتیب و تدوین کرتے وقت بے انتہا ضروری بلکہ بعض اوقات لازم تصور کی جاتی ہیں اور ان کی درست جان کاری کے بغیر مخطوطہ کی تصحیح و تدوین کا کام درست طریقے سے اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ادبی و تحقیقی لحاظ سے اس کو مخطوطے کو کوئی نمایاں مقام و مرتبہ دیا جاسکتا ہے۔

## مخطوطہ شناسی کے بنیادی اصول وضوابط:

مخطوطہ شناس پھر چاہے وہ اردو زبان کے کسی مخطوطے کی تصحیح کر رہا ہو یا پھر فارسی زبان کے، اس کو مختلف علوم اور گوناگوں فنون پر کامل دستگاہ حاصل ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ ایک سطحی ذہن اور عام فہم مخطوطہ شناس اس۔ ایک کامیاب مخطوطہ شناس اس فن کے ہمہ تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیابی وکامرانی حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا مخطوطہ شناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت محقق بھی ہو ناقد بھی، مورخ بھی ہو مدبر بھی، ماہر لغت ہو سکّہ شناس بھی، خط شناس ہو اور کتبہ شناس بھی،، دقیق بین ہو دور اندیش بھی، مہر شناس ہو اور تصویر شناس ہونے کے ساتھ ساتھ کاغذ شناس، روشنائی شناس، صاحب نظر، دقیق الفکر اور نقش ونگار وغیرہ کا بھی ماہر ہو۔ اور ان سب کے ساتھ ساتھ اس کو مختلف ادوار کے اسالیب اور اسٹائل ادب سے بھی واقفیت ہونا چاہیے۔ جب بھی کوئی سنجیدہ مزاج اور ادب شناس مخطوطہ شناس کسی مخطوطہ پر کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کام کی ابتدا کیسے اور کہاں سے کی جائے اور پھر کس طرح اپنے کام کو بتدریج آگے بڑھایا جائے کہ وہ کام آسانی کے ساتھ اختتام پذیر ہو سکے، لہٰذا جب تک محقق کو مخطوطہ شناسی کے بنیادی اصول وقواعد کے متعلق آگاہی حاصل نہیں ہو گی تب تک وہ اپنی تحقیق وتدوین سے کوئی نتیجہ بخش اور خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کر سکے گا یہ ہی سبب ہے کہ محقق کے لیے مخطوطہ شناسی کے بنیادی اصولوں سے متعلق آگاہی بے حد ضروری بلکہ لازم ہے اس فن سے عہدہ بر آں ہونے کے لیے کون کون سے بنیادی اصول وضوابط یا نکات وجہات ذہن نشین رکھے جانا ضروری ہے اس کا مختصراً ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

مخطوطہ شناس کا جس مخطوطے کا بھی ترتیب وتصحیح کرنے کا ارادہ ہو تو، سب سے پہلے زیر نظر مخطوطے کو عقل کی کسوٹی پر اچھی طرح جانچ پرکھ یعنی غور وفکر کر لے، کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک کتاب کے مختلف مخطوطے اور پھر ان کے بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں مثلاً حجم مختلف ہونا، تاریخ میں اختلاف ہونا، ناسخ کا الگ ہونا یا نسخہ کا کامل وناقص ہونا وغیرہ، لہٰذا اگر کسی مخطوطے میں سنین یا اس کے بنیادی وثانوی نسخے کا مسلہ ہو تو اس عہد میں رواج پانے والے الفاظ اور ایجادات سے مدد لے کر اس کے زمانے کا تعین کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے، کسی بھی زبان کے

مخطوطے کی درست شناخت وتعین کے لیے مخطوطہ شناس یا محقق کو داخلی شہادت سے کام لینا چاہیے، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر تو خارجی شواہد کی روشنی میں بھی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ داخلی ذرائع میں زیر بحث مخطوطہ کا دیباچہ اور متن کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ خارجی شواہد میں ہمیں اس زمانے کی معتبر شہادتیں، تاریخی کتب، تذکرے، بیاضیں اور دیگر یادداشتیں وغیرہ سے مدد لینی پڑتی ہے ہیں، کبھی کبھی کتاب یا نسخے میں مصنف کا نام درج نہیں ہوتا، نام نہ ہونے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً شاعر یا مصنف از راہِ عاجزی وانکساری اپنا نام نہیں لکھتا ہے یا اگر لکھتا بھی ہے تو صرف پہلے صفحے پر اور اگر وہ پہلا صفحہ کسی وجہ سے کتاب سے الگ ہو جائے تو کتاب کے مصنف کی شناخت کا مسلہ ایک بڑا مسلہ بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اس کے علاوہ بعض اوقات حکمران وقت کے عتاب وقہر سے بچنے کے لیے بھی بعض اوقات نام کو پردہ خفا میں رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں مخطوطے کے عنوان اور موضوع کو غیرہ کو دیکھ کر اس کے فن کے مطابق اس کے مصنف کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اکثر مخطوطات کی فہرست، سند اور ترقیمہ وغیرہ کی مدد سے بھی مصنف کا نام معلوم کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک اور اہم نکتہ ذہن میں رکھے جانا چاہیے کہ کسی مخطوطہ کی کئی اقسام ہو سکتی ہیں مثلاً کوئی قلمی نسخہ، بیاض، مکتوب، سفینہ، جنگ، طبقات، مرقع، کشکول، کراسہ، مقالہ اور اسی قبیل کی دوسری بہت سی شکلوں میں ہو سکتا ہے یا پھر نثر کے بجائے نظم کی مختلف اصناف سے متعلق ہو سکتا ہے، لہٰذا ایک بار پھر وہ ہی سوالات اٹھتے ہیں کہ کسی بھی مخطوطے کی درست طریقے سے کس طرح شناخت کی جائے؟ اس کو پرکھنے کے لیے کیا میزان ومعائیر قائم کیے جائیں؟ اس کی درست قدر وقیمت کا تعین کیسے کیا جائے؟ یا اس کو علم وادب کے کس زمرے میں رکھا جائے وغیرہ جیسے نہ جانے کتنے سوالات ہمارے ذہن میں شک وشبہات پیدا کرتے ہیں، ایک محقق یا مخطوطہ شناس کے لیے ان تمام سوالات کے جوابات سے آگاہی اس لیے بھی ضروری ہے کہ جب تک آدمی کسی چیز کی صحیح پہچان نہ رکھتا ہو اس وقت تک اس کی صحیح قدر وقیمت سمجھنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کی جاچکا ہے کہ مخطوطات کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، ان میں سب سے پہلی قسم میں نسخہ اصلیہ کو رکھا جاتا ہے یہ نسخے کی وہ قسم ہوتی ہے جس کو مصنف نے خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہوتا ہے اس نسخہ میں

شبہات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ نسخہ اصلیہ کے بعد اس قلمی نسخہ کو سب سے زیادہ معتبر، بہتر اور مستند سمجھا جاتا ہے جو کہ اصلی نسخہ سے نقل کیا گیا ہو۔ اس کے بعد پھر ان نسخوں کا نمبر آتا ہے، جنھیں اصلی یا ثانوی نسخوں سے نقل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ یہ مخطوطات در حقیقت بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے لیے مصدر اور سر چشمے کا کام کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ قبلاً بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ تدوینِ مخطوطہ کا پہلا اور بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ جس کسی بھی مخطوطے کے متن کی تصحی و تدوین کا ارادہ ہو اس کے بارے میں پہلے اچھی طرح سے معلومات کو حاصل کر لی جائے کہ اس کے کتنے نسخے ہیں اور کہاں کہاں ہیں ان کی ایک فہرست بنالی جائے۔ اور جہاں جہاں بھی اس کتاب نسخے موجود ہوں، مصحح کو وہاں وہاں تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ اس عمل میں مختلف زمانوں میں پائی جانے والی مختلف قسم کی مہریں اور اسناد وغیرہ بھی ہماری معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اردو اور فارسی کے مخطوطوں میں عام طور پر یہ مہریں، دستخط اور اسناد وغیرہ قلمی کتابوں کے شروع یا آخر میں پائی جاتی ہیں جو علمی و تحقیقی لحاظ سے نہایت اہم ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے بعض اوقات تو بڑی دل چسپ اور تاریخی معلومات بھی ہمیں حاصل ہوتی ہے جو دیگر ذرائع سے ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی ہیں، مہروں او اسناد وغیرہ کی بناوٹ، لمبائی چوڑائی اور موٹائی وغیرہ کے سلسلے میں بھی مخطوطہ شناس کو پوری طرح سے علم ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ کسی مخطوطہ کی تصحیح، تدوین یا پھر تحقیق کا ایک بنیادی اور اہم اصول یہ بھی ہے کہ دستیاب شدہ تمام نسخوں کے متعلق جان لینے کے بعد انھیں میں سے چند نسخوں کو تدوین و تحقیق کے لیے منتخب کر لیا جائے اور کام کا آغاز کیا جائے۔ مان لیجئے کہ اگر ہمیں کسی مخطوطے کے دس نسخے دستیاب ہو گئے ہیں تو سب سے پہلے ہم ان میں سے دو، تین یا چار نسخوں کا انتخاب کرنا پڑے گا اور دوران انتخاب یہ دیکھنا ہو گا کہ ان میں سے کتنے نسخے ایسے ہیں، جو مصنف کے اپنے ہاتھ کے تحریر کردہ ہیں یا پھر س کے عہد کے زیادہ قریب ہیں، لہٰذا ایسے نسخوں کا انتخاب کیا جائے۔ اس کے بعد دستیاب شدہ نسخوں میں سب سے زیادہ بہتر، معتبر اور مستند قلمی نسخہ کی درجہ بندی کر لی جائے۔ اور جب اس مرحلے سے فراغت حاصل ہو جائے یعنی جب نسخوں کا درست انتخاب ہو جائے، تو انھیں انتخاب شدہ نسخوں میں سے کسی ایک کو بنیادی نسخہ بنا کر تصحیح و تدوین کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا جائے اور اس کے بعد، مدون یا محقق حاصل شدہ تمام نسخوں کے متن کو خوب دقیق بینی اور بیدار مغزی کے ساتھ آپس میں موازنہ کرے اور الگ الگ مخطوطات کی

عبارتوں کو آپس میں مقائسہ و مقابلہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرے کہ دستیاب شدہ تمام نسخوں کی عبارت ایک جیسی ہی ہے یا پھر ان عبارتوں کے مابین کسی قسم کا کوئی تفاوت و تفریق پائی جاتی ہے۔ اگر الگ الگ نسخوں کی عبارتوں میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ نظر آئے تو، ہو تو پھر کوئی مسلہ ہی نہیں ہے، لیکن اگر الگ الگ قلمی کتابوں کی عبارتوں کے مابین کسی قسم کے کوئی اختلاف موجود ہوں تو پھر مصحح یا مدون کو چاہیے کہ وہ ان تفاوت و تفاریق کو حاشیے میں ضرور نقل کر دے اور اگر کہیں کسی لفظ کو واضح کرنے کی ضرورت ہے تو اس سے بھی چشم پوشی اختیار نہ کرے اور حواشی میں تشریح طلب لفظ یا جملے کی درست طریقے سے وضاحت کر دے یے تاکہ اس کے افہام اور تفہیم میں کسی قسم کے شک و شبہات کے سبب کوئی مشکل یا غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مخطوطہ شناسی کا ایک اور اہم مرحلہ حواشی ڈالنے کا ہوتا ہے، کسی مخطوطہ شناس کی فہم و فراست کا درست اندازہ اس کے حواشی سے بھی لگایا جا سکتا ہے، اگر دستیاب شدہ نسخوں کے درمیان کسی قسم کے کوئی اختلافات یا تفاریق پائی جاتی ہوں، تو ان تفاوق کو بیان کرنے کے لیے، کتاب میں نیچے کی طرف حواشی ڈال دیئے جاتے ہیں۔ فارسی و اردو کی کتابوں کی تصحیح و تدوین کرتے وقت عام طور پر حاشیہ درج کرنے کے دو طریقے رائج رہے ہیں؛ یعنی حواشی ڈالنے کا پہلا اور سب سے قدیم طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس صفحے کا حاشیہ ہے اسی صفحے کے فٹ نوٹ میں نمبر ڈال کر حاشیہ اسی صفحہ پر تحریر کر دیا جاتا ہے جبکہ دوسرا طریقہ جو قدرے آسان اور سلیس ہے کہ متن میں تشریح طلب مقامات پر حاشیہ نمبر ڈالتے جائیں اور تمام حواشی ایک ساتھ کتاب کے اخیر میں درج کر دیا جائے۔ اور اگر کوئی مدون، محقق یا مصحح کسی قدیم شاعر یا ادیب کے مخطوطے کی جمع آوری یا تدوین و تحقیق کرنا چاہ رہا ہو، تو اس کے لیے ضروری ہے وہ فرہنگ سازی کا خصوصی اہتمام کرے۔ فرہنگ سازی کا مطلب یہ ہے کہ متعلقہ مخطوطے کے مشکل و پیچیدہ الفاظ، نامانوس اصطلاحات و ترکیبات، مشکل تلمیحات، نامانوس اور متروک الاستعمال الفاظ کے معنی، تشریح اور مفہوم کی اچھی طرح وضاحت کر دے تاکہ عام فہم قاری کے لیے اس کے متن کا معیار سمجھنا قدرے آسان اور سلیس ہو جائے اور وہ بذات خود کسی قسم کی رائے قائم کرنے کا اہل ہو سکے۔ اس کے علاوہ مخطوطہ پر کام کر رہے دانشور کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قلمی نسخے میں بروئے کار آنے والے مختلف النوع محاوروں کا مفہوم، متن میں استعمال میں لائے جانے والے مشکل کلمات و تراکیب، مبہم مصرعے یا اشعار، پیچیدہ فقروں کی تشریح و توضیح بھی کیے جانا بے حد ضروری

ہے تاکہ ایک عام فہم قاری کے لیے بھی اس کے مفاہیم اور مطالب تک پہنچنا آسان ہو جائے اور وہ بھی اس کے افادی پہلوؤں سے مستفیض ہو سکے۔

مخطوطہ شناس کے لیے ایک اور اہم مرحلہ، متن کی قرأت خوانی کا بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر مخطوطے کی تصحیح و تدوین کرتے وقت اس کو درست طریقے سے نہ پڑھا جائے یا اس کو پڑھنے میں کسی قسم کی لاپرواہی برتی جائے تو اکثر بڑی فاش غلطیاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ ماضی میں بعض مخطوطہ نگاروں کی معمولی غلطیوں یا سہل پسندی کے سبب ادب کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے، لیکن یہاں اس بات پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی مخطوطے کے متن کا درست طریقے سے پڑھنا جس قدر اہم اور ضروری ہے، اسی قدر دشوار، پیچیدہ اور دشوار بھی ہوتا ہے، چونکہ بعض مخطوطات اس قدر خراب، خستہ اور بوسیدہ حالت میں ہم تک پہنچتے ہیں جن کو پڑھنا بعض اوقات ناممکن محسوس ہوتا ہے، ان مخطوطات میں کاتب کی طرف سے لغزشوں اور اغلاط کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں مخطوطات کو سینکڑوں ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں غلط الفاظ کی تصحیح و توضیح بڑی ہی مشکل ہو جاتی ہے اور مدون یا محقق کو درست متن کو سمجھنے کے لیے نئے نئے زاویوں سے متن کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور بڑی غور و فکر کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہزار ہا غور و فکر کے باوجود بھی کوئی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہیں ہو پاتا ہے، لہٰذا ایسے مواقع پر محقق کو اپنے قیاس کی بنیاد پر ہی اپنے کام کو آگے بڑھانا پڑتا ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کاتب کی طرف سے سرزد ہونے والی غلطیوں اور لغزشوں کو درست کرنے کے سلسلے میں، علم ریاضی کی طرح مخصوص اصول و قواعد نہیں بنائے جاسکتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں صرف قیاس کی مدد سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔ بعض نسخوں میں کاتب کی طرف سے ترقیمہ بھی درج کیا جاتا ہے، اگر کسی مخطوطے میں ترقیمہ وغیرہ موجود ہو تو اس سے مخطوطہ شناس کو کوئی حتمی فیصلہ لینے میں قدرے آسانی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخطوطہ شناس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تصحیح متن کے بعد اس کے بارے میں ایک مفصل و مدلل مقدمہ تحریر کرنے کا بھی اہتمام کرے، جس میں اس کتاب اور اس کے متعلق تمام ضروری معلومات کو فراہم کرنے کی کوشش کی جائے۔ جیسے اس مخطوطے کی تاریخی اہمیت، ادبی حیثیت، لسانی تجزیہ، مصنف کی سوانح حیات، کاتب کی ذہانت، تحقیق و تدوین کے

دوران نظر سے گزرنے والے تمام نسخوں کا ذکر، متعلقہ متن کی دریافت و بازیافت ، نتیجہ گیری اور معاونین اور عزیزوں کا شکریہ وغیرہ بھی اسی حصے میں ادا کیا جانا چاہیے۔

مخطوطہ شناس کو کسی بھی مخطوطے کی تحقیق و تدوین کرتے وقت اپنی پوری ادبی سنجیدگی اور ادبی بصیرت کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ کسی بھی مخطوطہ کی تحقیق کرتے وقت اس کو پوری گہرائی و گیرائی سے سمجھنے کے لیے انتہائی مہارت و ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر مخطوطہ شناس اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا لاپرواہی اختیار کرتا ہے، تو پھر اس کی تصحیح شدہ متن کو قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک کوئی محقق اور مخطوطہ شناس ، مخطوطہ شناسی کے فن سے کماحقہ واقفیت نہ رکھتا ہو، تب تک وہ تحقیق و تدوین کے کام کو بحسن وخوبی انجام دینے میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا ہے۔ اونہ ہی قدیم ترین متون، کو اصولِ تدوین و تحقیق کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ قبول شدہ ہے کہ کسی مستند نسخے کو ماخذ بنائے بغیر کسی اقتباس کو اس اعتماد اور یقین کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ درست ہے۔ اس احساس نے صحتِ متن کی اہمیت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ کسی مخطوطہ شناس کو محض یادداشت یا سماعت پر بھروسہ کرتے ہوئے، متن پیش کرنا یا کوئی نتیجہ اخذ کر دینا بہت ہی سہل اور آسان کام نظر آتا ہے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے سہل پسندی اس فن کے لیے سم قاتل کی مانند ہے۔ محقق یا کسی بھی مخطوطہ شناس کی یہ بہت اہم اور بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مخطوطے کے متن کے نقطوں، رموز و اوقاف اور اعراب و حرکات کا باریکی اور پوری توجہ کے ساتھ جائزہ لے اور اس کی صحیح قرأت کو نقل کرے تاکہ عام قاری کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو کر راہ راست سے بھٹک نہ جائے۔

وہ لوگ جو مخطوطہ شناسی کے اس منفعت بخش اور پر مغز کام کو کرنے سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں اور ان پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں تو ان نشوروں کے علم میں یہ بات ہونا ضروری ہے اور انھیں سنجیدگی و متانت کے ساتھ اس طرف غور و فکر بھی کرنا چاہیے کہ کسی بھی مخطوطہ کی ترتیب و تدوین یا تصحیح و تنقیدِ متن کا مطلب نہ تو کسی مخطوطے کی عبارتوں یا مفاہیم کو تبدیل کرتے ہوئے، انھیں بہتر الفاظ میں نقل کر دینا ہے اور نہ ہی اس کا مقصد یہ ہے کہ مصنف کے اسلوب کو بدل کر کوئی اور زیادہ بہتر اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی جائے، یا اگر مصنف نے کوئی نظر یہ یا خیال، خلاف واقعہ بیان کیا ہے تو اس کی تصحیح کر دی جائے اور عام لوگوں کی دسترس میں پہنچا دیا جائے، جبکہ حقیقت

تو یہ ہے کہ کسی مخطوطہ کی ترتیب و تدوین ایک تاریخی امانت ہے، اس کا اپنا ایک تقدس، حرمت اور انفرادئیت ہوتی ہے، لہٰذا کوئی بھی مخطوطہ اور اس کی عبارات مصنف کی امانت ہوتی ہیں، اپنی جانب سے ان میں کسی بھی قسم کا کوئی بھی رد وبدل یا تغیر و تبدیلی ناقابل معافی گناہ کے مترادف ہوتا ہے، لہٰذا اپنی جانب سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہیے۔ مخطوطہ شناس کو کسی بھی مخطوطہ کی جمع و تدوین کے وقت مندرجہ ذیل نکات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

**۱۔ جلد:**

مخطوطہ شناسی کے عمل میں کتاب کی جلد کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ کسی مخطوطے کی جلد کی مدد سے اس کتاب یا دستاویز کی حقیقی عمر یعنی قدامت اور زمانہ کا تعین کرنے میں ہم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ قدیم دور میں کاغذ کی جلدیں بنانے کے لیے پتلی پتلی لکڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی گئیں، اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اب پتلی پتلی لکڑیوں اور کاغذ کے بجائے موٹی موٹی کاغذی تہوں کو ملا کر جلد سازی کا کام انجام دیا جانے لگا، اور ان کو آپس میں جوڑ کتابوں کی جلدیں تیار کی ہونے لگیں۔ اور جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا ویسے ویسے جلد سازی کے روائتی طریقوں میں بھی بدلاو آتے چلے گئے، اور آج کے زمانے میں تو جلد سازی کے بے شمار نئے اور جدید طریقے ہمارے سامنے آچکے ہیں جن کی مدد سے کتابوں کا محفوظ رکھنا اور بھی زیادہ آسان اور سلیس ہو گیا ہے۔ مذکرہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی مخطوطے کے زمانے کا درست تعین کرنے کے لیے جلد سازی کے عہد بہ عہد بدلاؤ اور تطورات کا علم حاصل کرنا بھی بہت ضروری بلکہ بعض اقات تو لازمی تصور کیا جاتا ہے۔

**۲۔ کاغذ:**

مدخطوطہ شناس کے لیے مخطوطے پر کام کرتے وقت کاغذ کی شناخت کرنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے، کیونک تاریخی کتابوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں مخطوطہ نویسی کے لیے، مختلف قسم کی کاغذ پائے جاتے ہیں، لہٰذا مختلف ادوار کے کاغذوں کی مروّجہ قسموں سے واقفیت بے حد اہم ہے، کیونکہ ہر عہد اور ہر علاقے کے، کاغذ کی اپنی الگ الگ خصوصیات ہوتی ہیں، مثلاً بغدادی کاغذ مضبوط اور قدرے موٹا ہوتا ہے اور اگر اس پر پانی ڈالا جائے تو اس کی روشنائی دھل جاتی ہے البتہ کاغذ کو کچھ نہیں بگڑتا ہے اور اس کو لکھنے کے لیے دوبارہ بھی

استعمال کیا جاسکتا ہے اسی طرح سمرقندی کاغذ قدرے چمکدار، پتلا اور چمکدار ہوتا ہے، لہٰذا، مخطوطہ کی پہچان کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اس مخطوطے کے کاغذ کی قسم، رنگ اور ظاہری احوال کو دیکھنا چاہیے تاکہ مخطوطے کی قدامت یا اس کے عہد کے متعلق اندازہ لگانے می قدرے ں آسانی حاصل ہو سکے۔

**۳۔روشنائی:**

کسی بھی قلمی کتاب کی درست شناخت اور پختہ پہچان کے لیے مخطوطوں کی کتابت کے وقت، روشنائی کی بھی بڑی اہمیت وافادئیت ہوتی ہے، روشنائی کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اور یہ مخطوطہ کی درست حقیقت واہمیت متعین کرنے میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں روشنائی مختلف علاقوں کے لوگ مختلف انداز سے تیار کرتے تھے مثلاً کشمیر اور وہاں کے اطراف وجوانب کے لوگ بادام اور اخروٹ کے چھلکوں وغیرہ کو جلا کر روشنائی تیار کرتے تھے۔ یہ بہت وقت طلب، مشکل اور تھکا دینے والا کام ہوتا تھا، جیسے جیسے وقت گزرا تو روشنائی بنانے کے طریقوں میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں اور روائتی طریقے سے ہٹ کر اب رنگین روشنائی حاصل کرنے کے لیے پودوں، پھلوں اور لکڑیوں وغیرہ سے بھی رنگ برنگی سیاہی تیار کی جاتی تھی لہٰذا چنانچہ روشنائی کے عہد بہ عہد علم سے بھی مخطوطے کی شناخت کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ جب ہمارے سامنے کوئی علمی کتاب یا مخطوطہ آئے، تو کاغذ کے رنگ کے بعد ہمیں اس کی روشنائی یا سیاہی کی طرف دھیان دینا چاہیے، کیونکہ روشنائی کا رنگ خود بخود بتا دیتا ہے کہ کسی مخطوطہ کی قدامت کتنی ہے۔ اگر روشنائی کہیں کہیں سے اڑ گئی ہو روشنائی پھٹی پھٹی ہو تو اس سے مخطوطہ کے زیادہ قدیم ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

**۴۔زبان سے واقفیت:**

کسی بھی مخطوطے کو درست یا صحیح طریقے سے پرکھنے اور سمجھنے کے لیے اس مخطوطے کی زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے، جیسا کہ ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ زبان کوئی جامد وساکت چیز نہیں ہے بلکہ وقت وزمانے کی رفتار کے مطابق اس میں بھی مسلسل بدلاؤ آتے رہتے ہیں یعنی گزرتے وقت ک ساتھ زبان میں بھی تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں اور تغیرات پر کو اپنی گہری نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے الفاظ کی املا تلفظ اور ہیئت میں فرق آجاتا ہے۔ لہٰذا ایک محقق کے لیے زبان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے آگاہی ضروری ہے۔ اس

کے لیے لازم ہے کہ وہ زبان کی ہر دور کی خصوصیات کے بارے میں کماحقہ واقفیت رکھتا ہو۔ تاکہ اس کی مدد سے وہ نامانوس، غریب اور نا آشنا الفاظ کی درست طریقے سے نشان دہی کر سکے اور اس کے پس پردہ موجود حقائق اور صداقتوں کو بھی منظر عام پر لانے کا متحمل ہو سکے۔

**۵۔رسم الخط:**

کسی بھی مخطوطے کی قدامت و حقیقت اور اصلیت و حقیقت کا اندازہ آسانیٔ کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے، کا علم بغیر رسم الخط اور املا کی درستگی کے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اکثر ایسے نسخے ہوتے ہیں جن پر تاریخ کتابت درج ہی نہیں کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا زمانہ متعین کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی محقق یہ جان لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ کون ساخط کس عہد میں کب سے کب تک رائج تھا، یا کون سا رسم الخط کس مخصوص علاقے تک محدود رہا ہے وغیرہ یہ سب باتیں محقق کے تجر علمی میں اضافہ کرتی ہیں۔ یعنی رسم الخط کسی بھی مخطوطہ کی درست پہچان میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس سے مخطوطہ کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر دور کا رسم الخط ایک مخصوص قسم کا ہوتا ہے جس سے اس عہد کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر عالم یا ادیب کا مخصوص رسم الخط ہوتا ہے جس سے اس کی تصنیف پہچانی جاتی ہے اور اس کے معیار کا درست تعین کیا جاتا ہے۔

**۶۔طرز املا:**

جیسا کہ ہم سب اس بات سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ ہر دور کے طرز تحریر یا املا وغیرہ کا اپنا انفرادی رنگ و آہنگ ہوتا ہے یعنی ہر زمانے میں دانشوروں کے یہاں املا وغیرہ کا اپنا ایک مخصوص طریقہ رائج ہوتا ہے یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گی، اردو زبان و ادب کے قدیم رسم الخط میں یاے معروف اور یائے مجہول کے تلفظ کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، لیکن دونوں کی الگ الگ املائی شکلیں موجود نہیں تھیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قدیم اردو اور فارسی مخطوطات میں بہت سے املائی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایک لفظ کو کوئی مصنف کسی طرح لکھتا تھا تو دوسرا کسی اور طرح اس کو تحریر کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہمیں ایک مصنف کے یہاں بھی یکسانیت دیکھنے کو نہیں ملتی ہے یعنی وہ بھی بعض دفعہ الگ الگ املا لکھ دیتا تھا، لہٰذا مخطوطے کی شناخت میں عہد بہ عہد املائی تبدیلیوں سے شناسائی محقق کے لیے بے حد اہم بلکہ بعض لحاظ سے لازم ہے۔

**داخلی وخارجی شواہد:**

مخطوطہ شناسی میں شواہد یا ثبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے کسی بھی مخطوطے کی تصحیح وتدوین کرتے وقت اس کی درست شناخت اور اصل حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس کے داخلی شواہد سے بھی مدد لی جاسکتی ہے ان کی مدد سے کتاب کو اعتبار واستحکام حاصل ہوتا ہے داخلی شواہد سے مراد وہ شہادتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق براہ راست صاحب کتاب سے ہوتا ہے ان داخلی شواہد میں متن، تزئین، ترقیمہ، تاریخ، دستخط اور مہریں وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں اور کارجی شہادتیں ان شہادتوں کو کہا جاتا ہے جو معاصرین یا بعد کے مفکرین کے یہاں تحریری شکل میں ملتی ہیں مخطوطات کی تصحیح وتزئین میں ان شہادتوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ان کی مدد سے ہی ہم تاریخ حقائق کی درستگی کے بارے میں صحیح پیمائش کرنے کے متحمل ہوسکتے ہیں تحقیق وتدوین کے میدان میں داخلی اور خارجی دونوں ہی شواہد سے استفادہ کیاجاتا ہے مشہور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے ایک مضمون ''داخلی شہادتیں'' میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''داخلی اور خارجی شہادتیں قریب قریب ہر مسلے پر تحقیق و تفکر میں معاون ہوتی ہیں، تاریخی واقعات میں جہاں تعین حقائق کے سلسلے میں مختلف ماخذ پر نظر جاتی ہے وہاں داخلی اور کارجی حقائق میں تقسیم کرکے ان پر غور وفکر کیا جاتا ہے کہ ہر ایک کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور اس اہمیت کے پیش نظر مختلف پہلوؤں پر نظر داری ایک ناگزیر صورت ہوتی ہے''[۷]

مختصر یہ کہ مخطوطات کے درست معانی ومفاہیم سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ہمیں داخلی اور خارجی دونوں ہی شہادتوں کو بروئے کار لانا چاہیے تاکہ کوئی تسلی بخش نتائج اخذ کرنے میں کامیابی حاصل ہوسکے۔

**متن:**

اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مخطوطے کی شناخت اور صحیح قدروقیمت کا اندازہ لگانے کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ خود اس مخطوطے کا متن ہوتا ہے۔ اگر محقق یا مخطوطہ شناس کے پیش نظر کوئی شعری مخطوطہ ہے تو پھر وہ عروض وقواعد سے درست واقفیت نہ ہونے کی بناپر صحیح متن کا کام سرانجام نہیں دے سکتا ہے اور نہ ہی مخطوطے کی قدامت وحیثیت اور قدروقیمت کا درست اندازہ قائم کرسکتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ قوانی واوزان وبحور سے نا

آشنا محققین و مفکرین کسی شعری متن کی صحیح طرح شناخت نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح نثری متن پر کام کرنے والے لوگ اگر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مخطوطے کے متن میں کہیں کوئی تغیر کیا گیا ہے تو بھی متن کے اندر کوئی نہ کوئی سقم ایسا موجود ہو گا جس سے جعل سازی کی نشاندہی ہو جائے گی۔ کسی بھی متن کو ایک مستند سند اور معتبر ثبوت کے طور پر اس وقت تک پیش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جب تک کہ اس کا مستند و معتبر نسخوں سے مقابلہ و محاسبہ نہ کر لیا جائے اور جب تک اس کو پوری طرح تسلی نہ ہو جائے، تب تک ایسے متن کو آداب تدوین کی پابندی کے ساتھ زیر طبع لانے کی کوشش نہ کیا جائے، یہ درست ہے کہ ایسی صورت میں کسی بھی مخطوطے کی اہمیت و قیمت اور قدر و وقعت بڑھ جاتی ہے، مگر جس طرح کہ قبلاً بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی تحقیق و تدوین کا کام انجام دینے کے لیے مخطوطہ کا دستیاب ہونا بہت اہم ہے، لیکن تحقیق و تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی اس سے بھی زیادہ اہم ہے کیوں کہ جب تک کسی مخطوطہ کی اصلیت و حقیقت کا پتا نہیں چلتا ہو تب تک تحقیق و تدوین کا کام درست طریقے سے ممکن ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

**۸۔ ترقیمہ اور تملیکہ:ا**

ن کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے ترقیمہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کاتب کی وہ تحریر جو کتاب کے آخر ورق پر میں وہ درج کرتا ہے اس میں اپنا نام تاریخ تکمیل وقت تکمیل وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور بعض اوقات کاتب اپنے لیے دعا کا طالب بھی ہوتا ہے اسے ترقیمہ کہا جاتا ہے۔ اگر مخطوطے پر ترقیمہ موجود ہے تو گویا اس سے بھی مخطوطے کی شناخت میں قدرے آسانی پیدا ہو جاتی ہے ترقیمہ کی موجودگی سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ مخطوطہ کب لکھا گیا، کس نے لکھا اور کس موضوع پر لکھا گیا ہے وغیرہ، ترقیمہ میں کاتب کا نام، لکھائی یا کتابت کی تاریخ وغیرہ جیسی معلومات بھی درج جاتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ کاتب نے اس نسخہ کو کس تاریخ، کتنے دن اور کس موضوع وغیرہ کے متعلق نقل کیا ہے. بعض اوقات کوئی کتاب کسی کے کہنے یا فرمائش پر تحریر کی جاتی تھی لہٰذا کتاب جس کی فرمائش پر لکھی جاتی ہے یا جس کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اس کے لیے جو عبارت کتاب کی ابتداء میں تحریر کی جاتی ہے اسے تملیکہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بھی مخطوطے کو پہچاننے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس کا رواج بہت عام تھا اور اکثر مخطوطات میں ہمیں ترقیمہ اور تملیکہ کا خصوصی اہتمام دیکھنے کو ملتا ہے۔

**دستخط اور مہریں:** لوگ قدیم زمانے میں ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخوں کو زیادہ مستند و معتبر بنانے کے لیے اکثر اس کے مصنف یا شاعر سے دستخط کرالیا کرتے تھے تاکہ اس کی صحت و درستگی برقرار رہے اور بعض مصنفوں اور شاعروں وغیرہ نے تو اپنے نام کی مہریں اور سندیں وغیرہ بھی بنوا کر رکھی تھیں تاکہ ان کی تخلیقات کو چوری نہ کیا جا سکے اور آج ان مہروں مصنفوں اور شاعروں کے ان دستخطوں اور مہروں وغیرہ سے بھی مخطوطے کی شناخت کی جاتی ہے۔ مخطوطہ شناسی کے عمل میں مہریں اور اسناد بھی خاصی مددگار و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ مہریں قلمی کتابوں کے شروع یا آخر میں پائی جاتی ہیں بعض اوقات درمیانی صفحات میں بھی ہو سکتی ہیں لیکن ان کے امکان کم ہوتے ہیں، بہر حال مہریں یا مخطوطہ نویس کے دستخط یا مہر بہت اہم تصور کی جاتی ہیں علمی، ادبی اور تحقیقی لحاظ سے نہایت گراں قدر ہوتی ہیں اور بعض نئی تاریخی معلومات فراہم کرتی ہیں، اس لیے ان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

**تخریج:**

اس کا مطلب ''استخراج'' یا ''نمایاندن'' یعنی کسی چیز کو نکالنا یا ظاہر کرنا ہوتا ہے مخطوطے کی تصحیح و تدوین یا تنقید کرتے وقت تخریج بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس کے ذریعے مخطوطہ شناس کسی مصنف یا شاعر کے کلام میں دوسرے شاعر یا ادیب کے کلام کے متعلق نشان دہی کرنے کی کوشش کرتا ہے قدیم مخطوطات کو دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات مصنف اور شاعر اپنے بیان کو دل چسپ اور اثر انداز میں پیش کرنے کی غرض سے قرانی آیات، احادیث، اقوال معروف یا اشعار وغیرہ کا استعمال کرتے تھے خصوصاً رقعات، ملفوظات، اور تاریخ وغیرہ کی کتابوں میں اکثر دوسرے شعرا کا کلام اور اقوال وغیرہ زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں لہٰذا مخطوطات کی تصحیح و تدوین کرتے وقت اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے مخطوطہ شناس کو تخریج و تعلیقات کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے، پروفیسر نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون ''متون کی تصحیح و تدوین میں تخریج و تعلیقات کی اہمیت و ضرورت'' میں اس طرف زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''تخریج نہائت مفید عمل ہے اس سے متن کی افادیت میں کئی اعتبار سے اضافہ ہوتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے متن کی صحت کا امکان بڑھ جاتا ہے، متون کی بنیاد مخطوطات پر ہوتی ہے اور ایک

مخطوطہ دوسرے سے نقل ہوتا ہے، اس نقل میں زیادہ احتیاط اس لیے نہیں ہوتی کہ کاتب پیشہ ور ہوتا ہے وہ عجلت سے کام لیتا ہے پھر اس کا علم کم ہوتا ہے اس لیے جو چیز سمجھ میں نہیں آتی اس کو وہ بدل دیتا ہے، پرانی کتاب کے مخطوطے میں کاتب ایسے لفظیات و فقرات سے دوچار ہوتا ہے جن کو وہ نہیں سمجھتا، وہ ان کو غلط ٹھہرا کر زیادہ رائج الفاظ سے بدل دیتا ہے"۸

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کسی بھی تخلیق کار کی تحریروں کی اصل حقیقت کو جاننے و سمجھنے یا جانچنے کے لیے تخریج کا عمل بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر، کسی بھی بات کو آنکھیں بند کر کے بے چون وچرا قبول کرنا درست نہیں ہے بلکہ بعض اوقات تو اس کے درست تعین نہ ہونے کے سبب بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور کسی ادبی شہہ پارے کے درست مقام و مرتبہ کے تعین میں بھی شک و تردد ہوتا ہے، لہذا صرف تخریج کی مدد سے ہی درست طریقے سے اور سیاق و سباق کی روشنی میں سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے دورہ موجودہ میں ہمارے ادب کے بہت سے مورخین اور مفکرین اس طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی پوری ادبی سنجیدگی اور علمی بصیرت کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

**تعلیقات یا حواشی:**

تعلیقات کا لغوی معنی آویختن، یاد داشت کردن یا کسی چیز کو لٹکانا یا معلق کرنا لیا جاتا ہے اصطلاحی یا ادبی معانی میں تعلیقات حواشی یا فٹ نوٹ کو کہا جا سکتا ہے یعنی کسی متن میں موجود کسی لفظ، جملے یا عبارت کی وضاحت کے لیے حاشیے میں لکھی گئی اضافی معلومات یا پھر مصنف یا شاعر کی طرف سے تحریر کردہ کسی عبارت یا شعر کے بارے میں وضاحت، ترجمہ، تنقید اور تحقیق پر مبنی نوٹس کو تعلیقات کے زمرے میں رکھا جاتا ہے اس کے علاوہ کسی کتاب سے متعلق یاد داشت، ضمیمہ یا خلاصہ بھی تعلیقات کہلاتا ہے۔ بعض اوقات کتابوں میں ایسے نکات مذکور ہوتے ہیں جن کی توضیح و تشریح سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اگر ان کا خیال ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے یعنی عدم توضیحات کے سبب عام فہم قارئین کی اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے متن کی اہمیت وافادیت افزوں ہونے کے بجائے کم ہو جاتی ہے یہ ہی سبب ہے کہ تعلیقات متون کی تصحیح و تدوین کا لازمی حصہ سمجھی جاتی ہیں پروفسور نذیر احمد نے

تعلیقات کو اصل متن سے زیادہ پر از معلومات قرار دیا ہے ذیل میں ان کے مذکرہ مضمون سے چند اہم نکات بعینہٖ نقل کیے جاتے ہیں جن کی مدد سے تعلیقات نویسی کی اہمیت اور افادیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

- ”مطالب کتاب کی تفہیم و تنقید میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے اور کتاب کی غرض و کتابت کما حقہ انھیں سے پوری ہوتی ہے۔
- ان سے کتاب کی تاریخی، ادبی و فرہنگی اہمیت کا اندزاہ کیا جا سکتا ہے، گویا کتابوں کی پرکھ کا ایک پیمانہ کے مثل ہے
- ان سے مصنف کتاب کے علم و فضل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
- تعلیقات نویسی علوم پر غیر معمولی دسترس کی متقاضی ہے، چنانچہ تعلیقات نویسی بذات خود عمیق مطالعے کی دعوت دیتی ہے، تعلیقات نویس ذوالفنون ہوتا ہے، اسی بنا پر بڑا مشکل فن تصور کیا جاتا ہے۔
- تعلیقات نویسی مصنفوں کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتی ہے اور اگر یہ نہ لکھے جائیں تو مدتوں تسامحات کا شمار علم کے درجے میں ہوتا رہے گا، گویا تعلقات علم اور جہل میں حد مقیاس قائم کرتے ہیں“[۹]

بہر حال یہ تو سچ ہے کہ عہد قدیم سے مخطوطہ شناسوں کے یہاں تعلیقات یا حاشیہ نویسی کا رواج موجود رہا ہے اور موجودہ وقت میں تو اس کی معنویت اور اہمیت مزید افزوں ہو چکی ہے کیونکہ اگر کسی کا خطی نسخہ کسی دوسرے کے مطالعے میں ہوتا تو وہ مطالعہ کے دوران یا بعد میں حاشیہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ اگر مطالعہ کرنے والا کوئی بڑا عالم ہوتا تو وہ ضروری مقامات پر اصلاح بھی کر دیتا تھا۔ یا پھر اپنی رائے حاشیہ پر بھی لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی بعض اوقات ایسی باتیں سامنے آجاتی ہیں جس سے مخطوطے کی شناخت ہو جاتی ہے اور اگر کوئی مدون یا محقق کسی قدیم شاعر یا ادیب کے مخطوطے کی تدوین و تحقیق کر رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے وہ فرہنگ سازی کا خصوصی اہتمام کرے۔ فرہنگ میں متعلقہ مخطوطہ کے مشکل الفاظ، اصطلاحات، تلمیحات، نامانوس اور متروک الاستعمال الفاظ کے معنی، تشریح اور مفہوم کی اچھی طرح وضاحت کر دے تاکہ عام فہم لوگوں کے لیے بھی اس کا سمجھنا آسان ہو۔

**ترجمہ:**

خطوطہ شناسی کے اس عمل میں کسی ایک زبان سے کسی دوسرے زبان میں ترجمے کو بھی خاصی اہمیت وافادئیت حاصل رہی ہے، تاریخ سے ثابت ہے کہ ماضی میں بے شمار مخطوطات کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیاہے اور آج بھی کیاجارہاہے، ان تراجم کی ارزش وافادئیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تراجم نہ صرف مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان باہمی رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ کسی بھی متن کی تفہیم اور تشریح میں بھی بنیادی کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ترجمہ کسی مخطوطے کو اس زبان میں منتقل کرتا ہے جس میں اس کا مطالعہ کیا جاسکے اور اس کے مواد کو سمجھا جاسکے۔ لہٰذا اگر عربی، فارسی یا پھر کسی دوسری زبان کے مخطوطے کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا مطلوب ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ حواشی اردو میں ہی تحریر کیے جائیں، اور اس مخطوطے کا اردو ترجمہ یا تو مقابل صفحہ پر تحریر کیا جائے یا پھر الگ حصے کے طور پر، ترجمہ کرتے وقت محقق کو ترجمہ نگاری کے تمام اصول و قواعد کی معلومات ہونا چاہئے۔اور اسی کے ساتھ ساتھ مخطوطے کے کچھ اوراق کا عکس تحقیق شدہ مواد کے ساتھ منسلک کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ اس کے ذریعے افہام و تفہیم میں آسانی پیدا ہو سکے۔

ا۔ مخطوطہ شناسی کے عمل سے تعلق رکھنے والے محققین اور ناقدین اچھی طرح واقف ہیں کہ تحقیق و تدوین کے کام میں سب سے زیادہ اہمیت منتخب شدہ نسخے یا متن کی ہوتی ہے، اور یہ مخطوطات نقل در نقل ہوتے ہوئے، ہم تک پہنچتے ہیں اس لیے بعض اوقات کاتبوں کی تمام تر احتیاطی تدابیر کے بعد بھی کچھ نہ کچھ تفاوت یا تساہم باقی رہ ہی جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بار بار نقل ہونے کے سبب اصل کتاب اور دیگر نسخوں میں اتنا زیادہ فرق ہو جاتا ہے کہ وہ دو الگ الگ کتابیں محسوس ہونے لگتی ہیں، دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ محقق کی تمام تر احتیاط اور بیدار مغزی کے باوجود بھی ہر قلمی نسخہ دوسرے نسخے سے کسی نہ کسی لحاظ سے مختلف ہو ہی جاتا ہے، لہٰذا محقق کو کسی مخطوطے کی تحقیق و تدوین کرتے وقت خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا یا پھر اس کے عہد میں تحریر کیا گیا نسخہ تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہئے، تاکہ غلطیوں اور لغزشوں کے امکان قدرے کم ہو جائیں کیونکہ اس بات سے ہر گز بھی

انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی بھی ادبی شہہ پارہ اپنے زمانے اور اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور اسی ماحول کی بازگشت اس میں سنائی دیتی ہے لہٰذا محقق یا مخطوطہ شناس کو اسی عہد کے مخطوطہ کو بنیاد بنا کر اپنا کام آگے بڑھانے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ حقائق اور صداقتوں کو بے نقاب کر سکے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے ایک بے انتہا معلوماتی اور پر مغز مضمون ادبی تحقیق اور حقائق''میں بالکل درست لکھا ہے کہ:

''کوئی بھی ادبی کارنامہ کتنا ہی ابدی، افاقی اور عالمگیر کیوں نہ ہو اپنے زمانے اور مقام تصنیف سے رشتہ نہیں توڑ سکتا، ہر ادبی کارنامے میں اپنے عہد کی آواز گونجتی ہے اور یہ ہی آواز ادبی محقق اور نقاد کے لیے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف روح عصر ہے بلکہ اس میں ماقبل کی آوازیں بھی شامل ہیں اور مابعد کی آوازوں میں اسے پہچانا جاسکتا ہے''۱۰

۲۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کسی مخطوطہ شناس کو اس مخطوطے کے مصنف یا شاعر کے افکار وخیالات اور احساسات وتصورات کے بارے میں بھی جاننا بھی بہت زیادہ ضروری بلکہ بعض اوقات تو لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر مصنف کے درست احساسات، خیالات اور افکار تک مخطوطہ شناس کی رسائی ہو جاتی ہے، اس کے لیے متن پڑھنے اور سمجھنے میں قدرے آسانی پیدا ہو جاتی ہے، اور ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ بعض مرتبہ غلط متن پڑھ لینے کے سبب ادب کو نا قابل تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے کہ شعر وادب کی متن کو غلط پڑھ لینے کے اثرات فوری طور پر ہمارے سامنے نہ آئیں لیکن ذرا تصور کیجئے کہ اگر کسی قانونی کتاب یا طب کے کسی رسالے کے متن کو غلط پڑھ لیا جائے اور اس غلط پڑھے ہوئے کی وجہ سے غلط معنی اکذ کر لیے جائیں، تو اس کے اثرات فوری طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں، مثلاً علم طب کی کتاب کو غلط پڑھ کر اس کے مطابق علاج کیا جائے تو اس بے چارے مریض پر اس کا کیا اثر ہو گا یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اس کا اندازہ صرف وہ ہی انسان لگا سکتا ہے جس کا اس قسم کی صورت حال سے براہ راست سابقہ پڑا ہو یہاں ایک مثال کے ذریعے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے پروفیسر نذیر احمد نے

ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اختیارات بدیعی'' طب کی، فارسی زبان میں، نہایت متداول کتاب ہے۔ اس کے ایک قلمی اور مطبوعہ کتنے میں ایک جگہ یہ فرق تھا کہ قلمی نسخہ میں بیخ وی" تھا اور مطبوعہ نسے میں ''پنج درم'' فرض کیجیے کہ بیخ وی "ہی مصنف مقصود ہو تو مطبوعہ نسخے کی بنیاد پر جو علاج کیا گیا ہو گا اس کا نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔[11]

لہٰذا مخطوطات میں غلط متن پڑھ کر غلط اصطلاحات اور نادرست تراکیب کا استعمال کرنا، ایک سنگین مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک ناقابل معافی جرم بھی ہے، غلط یا نادرست متن خوانی کے سبب متن کی حقیقی شکل، مقصد، معنی، تفہیم اور تحقیق سب ہی کچھ متاثر ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایک بڑی مصیبت بھی بن جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مخطوطات ہمارے ملک اور قومی تہذیب و ثقافت کی بیش قیمت ورثہ ہوتے ہیں اور غلط متن پڑھنے کی وجہ سے بعض دفعہ غلط نتائج سامنے آتے ہیں جس کے سبب ہمارے اس ورثے کو بہت زیادہ نقصان بھی ہوتا ہے، اور صرف ایک یا چند لوگ نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے مضر اثرات سے مستثنیٰ نہیں رہ پاتی ہیں اس لیے اس سلسلے میں مخطوط شناس کو خصوصی احتیاط اور ہوش مندی کو برائے کار لانے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ سخت محنت اور کاوش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

**۳۔** فارسی مخطوطہ شناسی کے ابتدائی مرحلوں میں ایک مرحلہ نقطوں کی پہچان کا بھی ہوتا ہے، جن کو درست طریقے سے پڑھ پانا بعض مرتبہ بڑا مشکل اور پیچیدہ مسلہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مخطوطات میں نقطوں کی پہچان حروفِ تہجی کی شناخت اور درست پڑھنے کے لیے ضروری ہے، فارسی اور اردو زبانوں میں حروف کو منقوط حروف یعنی نقطوں والے حروف اور غیر منقوط حروف یعنی بغیر نقطوں والے حروف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور نقطوں کی درست جگہ اور تعداد ہی حروف کی شناخت اور معنی میں فرق پیدا کرتی ہے، لیکن جب یہ نقطہ والے حروف یک بعد دیگر آتے چلے جاتے ہیں تو مخطوطہ شناس کے لیے درست لفظ کا تعین کرنا بہت زیادہ مشکل بلکہ بعض اوقات تو ناممکن سا ہو جاتا ہے، اسی طرح حروف کو ملا کر لکھنے کی وجہ سے، یا کبھی کبھی کاتب کی لاپرواہی کے سبب بھی نقطوں کا تقدم و تاخر

باقی نہیں رہ پاتا ہے جو مخطوطہ شناس کے کے لیے ایک ان سلجھی پہیلی بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر متن کو پڑھنے میں بڑی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ایک مخطوطہ شناس کی یہ بہت بڑی اور بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر حرف کی شکل کو بغور دیکھے اور پھر اس حرف پر نقطوں کی تعداد اور جگہ کا درست تعین کرنے کی اپنی پوری کوشش کرے، اس کے علاوہ نقطہ دار حروف کی تعداد کو صحیح طور پر پہچانے اور اگر اس کے باوجود بھی اس کو کسی مخطوطہ میں کسی حرف کی شناخت میں مشکل ہو رہی ہے تو اسے موجودہ رسم الخط کے ساتھ موازنہ و محاسبہ بھی کرنا چاہیے تاکہ درست نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔

۴۔ مخطوطہ شناسی کے پورے عمل میں شوشہ شناسی کا مرحلہ بھی خاصہ مشکل اور توجہ طلب ہوتا ہے، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ شوشہ حروف تہجی کا وہ حصہ ہے جو حروف کے آغاز میں ہوتا ہے اور اس کی شکل عموماً نوک دار یا پھر دندانے دار ہوتی ہے مثلاً کے س اور ش وغیرہ حروف کے ابتدائی حصے کو شوشہ کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ جب فارسی الفاظ آپس میں جوڑے جاتے تھے تو ان میں الگ الگ شناخت قائم کرنے کے لیے بھی شوشوں کا استعمال کیا جاتا تھا اور فارسی مخطوطات میں اکثر بلکہ زیادہ تر حروف کی نشان دہی بھی شوشوں کی مدد سے کی جاتی ہے، اور نقطے وغیرہ لگانے کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، لہٰذا بعض کاتبوں کی اسی بے احتیاطی کے سبب، کسی کسی لفظ کا سمجھنا اور پڑھنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے، فارسی زبان میں ہمیں سینکڑوں ایسے مخطوطات دیکھنے کو مل جائینگے، جو خط شکستہ میں لکھے گئے ہیں، جن میں نہ تو نقطے لگانے کا کوئی اہتمام ہے اور نہ ہی شوشے لگانے کا کوئی التزام، جس کی وجہ سے محقق کو متن پڑھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس قسم کے مخطوطوں میں محقق کو قیاس آرائی اور ذاتی فہم کی مدد سے اپنے کام کو انجام دینا پڑتا ہے۔

۵۔ قدیم زمانے میں کبھی کبھی کاتب نسخہ دیکھ کر نقل کرنے کے بجائے سن کر نقل کرنے کو زیادہ فوقیت دیتا تھا اور جانے انجانے بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہو جاتا تھا، اور جیسا کہ فارسی سے واقفیت رکھنے والے لوگوں کو بخوبی

معلوم ہے کہ اس زبان میں ہم آواز حروف اور الفاظ کی تعداد کافی زیادہ ہے، یعنی بعض الفاظ سننے یا بولنے میں تو ایک جیسے ہی محسوس ہوتے ہیں لیکن اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں جیسے سدا یا صدھا یا خوانم وخانم وغیرہ الفاظ کو سن کر دیکھ کر بجائے لکھنے میں بڑی غلطیاں اور لغزشیں ہو سکتی ہیں، اس کے علاوہ فارسی زبان میں صوری مشابہت رکھنے والے بہت سے حرف جیسے ذ، ز، ض اور ظ یا پھر ث، س، اور صفحہ وغیرہ کی وجہ سے بھی، مخطوطہ کی تدوین و تحقیق میں جس کی وجہ سے تعین حروف کا مسلہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے اور مخطوطہ شناس کو یہاں اپنی تمام تر تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے کام کو انجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۶۔ ایک اور بڑی مشکل جو اکثر مخطوطہ شناس کو کسی مخطوطہ کی تحقیق و تدوین کرتے وقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ مخطوطہ شناس بعض اوقات حروف کی درست شناخت نہیں کر پاتا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فارسی زبان کے قدیم نسخوں میں ہمیں، پ، چ، ژ اور ک کے بجائے ب، ج، ز اور گ لکھا جاتا تھا حالانکہ جدید فارسی ادب میں ایسا نہیں ہوتا ہے لیکن قدیم نسخوں میں اس طرح کے بے شمار حروف دیکھنے کو مل جاتے ہیں، اس طرح کے حروف بعض مرتبہ مخطوطہ شناس کے لیے بڑی مشکلات و ابہام پیدا کر دیتے ہیں اور محقق یا مدون یہ سمجھ نہیں پاتا کہ مصنف کی اصل منشا یا مقصد کیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال مندرج کی جا رہی ہے قدیم فارسی میں ''گ'' کو ''ک'' کی طرح لکھا جاتا تھا اب فارسی کا مصدر ہے ''گشتن'' اس کا مطلب ''ہونا'' ہوتا ہے لیکن اگر کوئی قدیم مخطوطہ نویس اس کو لکھے گا تو ''گ'' کو ''ک'' سے بدل دے گا اور اس طرح یہ ''کشتن'' پڑھا جائے گا جس کا مطلب قتل کرنا ہوتا ہے یہ ہی سبب ہے کہ محقق اس قسم کے الفاظ و کلمات کے افہام و تفہیم میں بڑی بڑی ناقابل معافی غلطیاں اور لغزشیں کر جاتے ہیں جن سے بچنے کی کوشش کرنا بے حد ضروری ہے۔

۷۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف یا شاعر وغیرہ کے درست خیالات و احساسات کی ترجمانی املا میں ظاہر نہیں ہو پاتی ہے، کبھی کسی جملے کو مختلف انداز میں پڑھنے کی وجہ سے بھی معنی کی تفہیم میں مشکل پیدا ہو جاتی ہے،

مثلا یہاں ایک جملہ دیکھئے، ''وہاں کچھ اور ہے'' یہ جملہ کئی معنی پیدا کر سکتا ہے مثلاً کوئی واقعہ، شک، تجسس یا خطرے کا کوئی اشارہ وغیرہ املا کی غلطیوں کی وجہ سے مخطوطے کے معنی اور مفہوم میں تبدیلی آسکتی ہے، اس لیے ان غلطیوں کو درست کرنا ضروری ہے، لہٰذا اس کو سیاق وسباق کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس قسم کے جملوں کی درست تفہیم کے لیے مخطوطہ شناس کو خصوصی محنت کرنا پڑے گی تبھی کسی مصنف یا شاعر کے درست افکار وخیالات تک اس کی رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔

۸۔ فارسی مخطوطہ شناسی کے عمل میں ایک مشکل یہ بھی پیش آتی ہے کہ اس زبان میں ضمیر متصل کے استعمال سے اکثر محقق شک وشبہات کا شکار ہو سکتا ہے کیونکہ ضمیر متصل جب الفاظ کے ساتھ متصل ہو جاتی ہے تو بعض الفاظ کے معنی کا درست تعین مشکل ہو جاتا ہے مثلاً ایک لفظ ''سرش'' ہے اس کا مطلب تین گز ہوتا ہے جبکہ ''سرش'' کا مطلب ''اس کا سر''، اسی طرح ایک اور لفظ کتابت اس کے دو معنی ہیں، ایک ''کتابت'' اور دوسرا ''کتابت'' یعنی تیری کتاب اسی طرح ''خوانم'' اس کے دو معنی ہیں ایک خوانم ''میں پڑھتا ہوں'' اور دوسرا ''میرا خوان یا دستر خوان''، اس قسم کی صورت حال ہمارے فارسی داں محققین کو کئی دفعہ بہت زیادہ پریشان کرتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں خصوصی ذہانت وفراست درکار ہوتی ہے تاکہ متن کو درست طریقے سے پیش کیا جاسکے۔

۹۔ یہاں ایک اور بات جو قابل ذکر ہے مخطوطہ شناسی میں علامتوں کے سمجھنے میں بھی اکثر مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں سے سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ عموماً مخطوطات میں استعمال ہونے والی علامات ہمیشہ واضح اور صاف نہیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے، بعض اوقات ان کا سمجھنا اور پھر ان کی وضاحت کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے مخطوطوں میں، علامت اضافت کا مسلہ بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ رہا ہے جس کا تاحال کوئی حل نہیں مل سکا ہے، عموماً کاتب نسخہ ترتیب دیتے وقت نقطوں اور شوشوں کی طرح علامت اضافت بھی حذف کر دیتے تھے، ایسی

صورت میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان کا باہمی رشتہ قائم کرنے میں خاصی مشکل پیش آتی ہے اور بعض اوقات متن کو سمجھنے میں بھی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۱۰۔ وہ لوگ جو فارسی اور اردو مخطوطات پر کام کرتے یا ان کے متعلق آگاہی رکھتے ہیں ان سامنے ایک بڑا اور بنیادی مسلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بائے زینت کے ب اور کلمہ نفی کے "ن" کے درمیان فرق نہیں کر پاتے ہیں، قدیم فارسی قلمی نسخوں میں اکثر کلمہ نفی کے ن کو صرف نقطے کی مدد سے ظاہر کیا جاتا تھا، اور اسی کے ساتھ بائے زینت کے ب کو بھی نقطہ ہی کی شکل میں لکھا جاتا ہے یہ ہی سبب ہے کہ بعض دفعہ محققین بائے زینت کو کلمہ نفی کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں اور کلمہ نفی کے ن کو بائے زینت سمجھ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے عبارت کا پورا کا پورا مفہوم ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ "یائے معروف" اور "یائے مجہول" اور "واؤ معروف" اور "واؤ مجہول" وغیرہ کا بھی ہوتا ہے، ان دونوں کا کوئی مقررہ قاعدہ یا املائی صورت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر معاملہ الجھ جاتا ہے پروفیسر نذیر احمد خا کہنا ہے کہ یہ صورتحال مخطوطہ شناسوں اور محققوں کو بہت زیادہ پریشان کرتی ہے اور فارسی سے زیادہ اردو کو متاثر کرتی ہے، وہ لوگ جنھوں نے مرزا غالب کے خطوط پڑھے ہیں وہ اس کی نزاکت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۱۲۔ مندرجہ بالا مسائل کے پیش نظر جناب مالک رام نے ان کا حل پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

> "مخطوطہ پڑھنے میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ کاتب پورے الفاظ نہیں لکھتے، نقطے غلط جگہ لگے ہوں گے، یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہو گا، بعض اوقات تو یائے معروف اور یائے مجہول دونوں ہی با معنی ہو سکتے ہیں، ایسی صورت میں ایک کو ترجیح دے کر اسے متن میں لکھئے اور دوسری قرات کو حاشیے میں لکھ کر تشریح کر دیجئے"۱۳

پروفیسر شریف حسین قاسمی نے بھی فارسی مخطوطات کی تدوین و تحقیق یا تصحیح کرتے وقت پیش آنے والی مشکلات اور محققین کی جانب سے کی جانے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مصنف نے در حقیقت کون سا لفظ استعمال کیا تھا، اس کا پتہ نہیں چلتا، مختلف متون میں جو صدھا اشخاص کے نام آئے ہیں، وہ کون تھے، ابھی پہچانے نہیں گئے ہیں، محققین نے ایک شاعر کے دیوان میں دوسرے شاعر یا شاعروں کے کلام کی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے ہر دیوان اور اس کے مشتملات مشکوک ہو گئے ہیں، ایک ہی کتاب کے دو چار خطی نسخے اپنے مندرجات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں، ایران و ہندوستان میں ہمارے محققین نے ان تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن بعض امور میں خود ان کوششوں کے نتائج بھی محل نظر ہیں، ہست استغفار ما محتاج استغفار ما''۱۴

**۱۰۔** فارسی مخطوطہ شناسی کے حوالے سے ایک اور قابل ذکر اور اہم بات جس کا یہاں ذکر کرنا بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ صورت حال اکثر ہمارے محققین اور مفکرین کو بہت زیادہ پریشان کرتی ہے کبھی کبھی تو جینا تک بھی حرام کر دیتی ہے، فارسی زبان وادب سے شناسائی رکھنے والے دانشور بخوبی آشنائی رکھتے ہیں کہ قدیم عہد کی فارسی میں دال حرف کو ذال کی حیثیت حاصل تھی، یعنی فارسی مصنفین ''د'' کو ''ذ'' کی شکل میں لکھتے تھے مثلاً آید، آمد، رود، شود اور بود وغیرہ کو آیذ، آمذ، روذ، شوذ اور بوذ لکھا جاتا تھا حالانکہ گزرتے وقت کے ساتھ اس کا رواج ختم ہو گیا، لیکن فارسی زبان کے قدیم مخطوطوں میں ہمیں آج بھی ''دال'' کے بجائے ''ذال'' دیکھنے کو مل جاتا ہے، لہٰذا فارسی متن کی تدوین کرتے وقت محقق یا مخطوطہ شناس کو اس دال اور ذال کے درمیان کے تفاوت کا اچھی طرح علم ہونا بے حد ضروری ہے، تاکہ کسی قسم کے شک وشبہات نہ پیدا ہوں اگر اس نے اس فرق وتفاوت پر خصوصی توجہ نہیں کی تو محقق کے لیے پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

**۱۱۔** فارسی اور اردو مخطوطہ شناسی سے متعلق ایک اور اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نسخہ نقل کرتے وقت جب کاتب کی سمجھ میں کوئی لفظ نہیں آتا تھا، تو وہ کچھ کا کچھ لکھ دیتا تھا، بعض مرتبہ ایسا بھی دیکھنے کو ملتا تھا کہ کاتب پرانے

الفاظ کی جگہ نئے الفاظ بھی شامل کر دیتا تھا اس قسم کے تصرفات بعض اوقات بڑے ادبی نقصان کا سبب بن جاتے ہیں مثلاً جمال الدین اصفہانی کا ایک شعر ہے:

وجہ محفوری تو از بوریای مسجد است

وز مسلمانی خویش آنگہ نکردی شرمسار

''محفوری'' ایک قسم کے قیمتی فرش کو کہا جاتا ہے لیکن کاتب نے ''محفوری'' کے بجائے ''مخموری'' لکھ کر نہ صرف یہ کہ شعر کی ساری لطافت اور حسن کو غارت کر دیا ہے بلکہ اس کے معنی بھی کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں، کاتبوں کے اس طرح کے تصرفات ہمیں فارسی اور اردو مخطوطات میں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں، اور اگر کوئی محقق ان سے اچھی طرح آگاہی یا واقفیت نہ رکھتا ہو، تو دوران تدوین، وہ بہت سی اغلاط اور لغزشوں کا شکار ہو سکتا ہے اور اس کی تصحیح شدہ متن میں بہت سی غلطیاں راہ پا سکتی ہیں۔۱۵

**۱۲۔** کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی زمانے میں ایک ہی تخلص کے دو شاعر ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے دانستہ اور نادانستہ طور پر ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر سے منسوب ہو جاتا تھا، عہد ماضی کے بہت سے شاعر ایسے رہے ہیں جن کا کلام محض تخلص ایک جیسا ہونے کے سبب ایک دوسرے سے منسوب ہو گیا۔ مثلاً ظہیر فاریابی کے کلیات میں بقول پروفیسر نذیر احمد کے غزلیات کا پورا کا پورا حصہ ہی ظہیر اصفہانی کا ہے، اسی طرح محمد رفیع سودا کے کلیات میں میر سوز کی سو سے بھی زائد غزلیں شامل ہیں، جن کو ایک مدت تک رفیع سودا کی غزلیں ہی سمجھا جاتا رہا تھا، اسی طرح قدیم شاعروں کے یہاں تخلص کا استعمال بھی بہت کم ہوتا تھا، عام طریقہ یہ تھا کہ کتاب کے سرورق پر مصنف یا شاعر کا نام تحریر کیا جاتا تھا، لہٰذا اگر پہلا صفحہ کسی وجہ سے کتاب سے الگ ہو جاتا تھا، تو بڑی ہی آسانی کے ساتھ کسی شاعر یا مصنف کی تخلیقات کو کسی دوسرے سے منسوب کر دیا جاتا تھا، لہٰذا اگر محقق کے سامنے مخطوطے کا

پہلا صفحہ نہ ہو تو اس کو بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا ہے اور اس مخطوطے کی درست اہمیت و حیثت ثابت کرنے کے سلسلے میں مخطوطہ شناس کو بڑی خاک چھاننا پڑتی ہے۔

**۱۳۔** مخطوطات کی تحقیق و تدوین میں ایک بڑی دشواری یہ بھی پیش آتی ہے کہ کسی نسخے کے نقل در نقل ہونے کی صورت میں ایک ہی کتاب کے، مختلف نسخوں کے درمیان خاصے اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں لہٰذا کسی بھی مخطوطہ کی درست تدوین اور تحقیق کے لیے بے حد ضروری ہے کہ مخطوطہ شناس اس مخطوطے کے زیادہ سے زیادہ قلمی نسخے حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا یا اس کے عہد کے نسخے کو بنیاد بنائے اور بنیادی نسخہ سے، دستیاب شدہ تمام نسخوں کے متن کو اپنی پوری ہوشمندی کے ساتھ ملائے اور ان کی عبارت کا آپس میں مقابلہ کرے کہ تمام نسخوں کی عبارت ایک طرح سے ہے یا اس میں کچھ فرق ہے۔ اگر کوئی اختلاف نہ ہو تو کوئی بات نہیں ہے، لیکن اگر ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف پایا جاتا ہو تو اس کو بغیر کسی کم وکاست کے حاشیے میں بیان کرے۔

ایک اور اہم اور ضروری نکتہ یہ بھی ہے کہ کسی بھی قلمی نسخے کی تدوین کے وقت موضوع کا خاص خیال رکھا جائے ،کیونکہ کسی بھی مخطوطے کی تحقیق و تدوین اس کے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے کی جاتی ہے، کیونکہ منظوم اور منثور مخطوطات کی تدوین و تحقیق کے تقاضے اور اسالیب جداگانہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا محقق اور مدون کو چاہئے، کہ وہ اگر کسی نثری مخطوطے کی جمع و تدوین کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے تمام ضوابط اور اصولوں کی ٹھیک طرح سے پابندی کرے اور اگر شعر و شاعری کے متعلق کام کرنے کا عزم رکھتا ہے تو شعری اسالیب وضوابط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرے، لہٰذا مخطوطہ شناس کے لیے گوناگوں صفات سے مزئین ہونا ضروری ہے ورنہ مخطوطہ شناسی کا عمل ناقص اور غیر منفعت بخش ثابت ہوگا، اب ذیل میں اس بات کا ذکر کیا جارہا ہے کہ مخطوطہ شناس کو کن کن صفات سے مزئین ہونا چاہیے:

۱۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی شخص کو مخطوطہ شناسی پر اس وقت تک مہارت حاصل نہیں ہو سکتی ہے جب تک وہ تحقیق و تنقید کا مزاج نہ رکھتا ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو تنقیدی شعور کا مالک ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ اگر وہ کھرے کھوٹے کے درمیان فرق کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہو گا، تو اس کی تحقیق بہت زیادہ بار آور یا منفعت بخش ثابت نہیں ہو سکے گی، لہٰذا تدوین، تحقیق اور تنقید بیک وقت تینوں ایک ساتھ چلتی ہیں اور ایک مخطوطہ شناس کو ان تینوں میں ماہر ہونا بھی ضروری بلکہ لازمی صفت مانی جاتی ہے۔ بعض اوقات کاتب سے ہی نہیں بلکہ مصنف یا شاعر بھی دوران تحریر بہک جاتا ہے اور عبارت کچھ کا کچھ لکھ دیتا ہے اس سلسلے میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی اپنے ایک مضمون مخطوطات شناسی میں بالکل درست لکھا ہے:

> ”انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی قلت تدبر سے، کبھی خطا سے تفکر سے کبھی سو فہم اور کبھی غلبہ وہم کی وجہ سے خود مصنف ایسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے کہ مصنف یا مولف اپنی تراوش فکر کو دل چسپ بنانے کی دھن میں تحقیق و تدقیق سے قطع نظر کر لیتا ہے جس کی مثال فارسی میں تذکرہ دولت شاہ اور اُردو میں آب حیات ہیں“ ۱۶

لہٰذا مخطوطہ شناس کو ایسے مواقع پر خصوصی احتیاط و دانشوری کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مخطوطہ شناس صحت متن کی درستگی کا اندازہ کر سکے اور حقیقی مقاصد کو پیش کیا جا سکے ورنہ بعض اوقات ایسی فاش غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جن کے نقصانات اندازہ لگا پانا بھی احاطہ گمان سے باہر ہے۔

۲۔ ایک محقق یا مدون کو دوران ریسرچ مختلف ادوار کی متون پر دسترس حاصل ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ مختلف زمانے کے بارے میں آگاہی نہ رکھتا ہو گا تو اس کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، کیونکہ قدیم زبان و بیان یا الفاظ و فقرات، جدید دور کی متون سے بڑی حد تک مختلف ہوتے ہیں، وہ محقق جو اس عہد کی زبان سے واقف نہیں ہو گا، جس دور میں کوئی مخطوطہ لکھا گیا ہے تو وہ متن کی درست طریقے سے تحقیق اور تدوین نہیں کر سکتا ہے، اور

نہ ہی اپنے کام کو آفاقیت بخش سکتا ہے اور عدم واقفیت کے سبب اس کا بے انتہا محنت سے تیار کیا گیا نسخہ اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کرنے کے بجائے غیر منفعت بخش اور غیر اہم تصور کیا جائے گا اور گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا جیسا کہ فارسی زبان کے مشہور و معروف مورخ اور مخطوطہ شناس پروفیسر نذیر احمد نے لکھا بھی ہے:

"قدیم مخطوطات کے سلسلے میں آج کے پیمانے کا استعمال غلط نتیجے پر پہنچائے گا، نہ جانے کتنے الفاظ واصطلاحات اب متروک ہو چکے ہیں،، الفاظ کے معنی بدل چکے ہیں، املا اور تلفظ میں فرق واقع ہو چکا ہے"۱۷

**۳۔** اس کے علاوہ ایک مدون اور محقق جو اردو یا فارسی نثر پر کام کر رہا ہے تو اس کو لغت نویسی پر بھی خاطر خواہ دسترس حاصل ہونا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات کسی مخطوطے یا متن میں ایسے الفاظ یا فقرے بھی آجاتے ہیں جو جدید دور میں مستعمل نہیں ہیں، اور اگر وہ شعری متن کی تحقیق و تدوین کر رہا ہو تو اس کو عروض و قافیہ کے اصول و قواعد کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

**۴۔** محقق کو مدون کو تاریخی حقائق اور دیگر علمی مسائل سے بھی آگاہی ہونا چاہیے، اور جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ مخطوطہ شناس اور محقق اس عہد کے رسم الخط، جلد سازی، کاغذ، روشنائی وغیرہ کے بارے میں بھی جاننا بہت زیادہ ضروری بلکہ بعض اوقات تو لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں کی مدد سے مخطوطے کے زمانے کا درست تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور اگر کسی مخطوطے کی قدامت کو ثابت کرنے میں کسی قسم کی کمی و بیشی یا کوئی جعل سازی کی گئی ہے، تو ان چیزوں کی درست معلومات کے سبب مخطوطے کی اصل حیثیت و اہمیت کو بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

**۵۔** ہمیں یہ جاننا بھی بے حد ضروری ہے تحقیق و تدوین کی تمام تر بنیاد، محقق کی دیانت داری اور حق گوئی پر ہوتی ہے، لہٰذا مخطوطہ شناسی کے پورے عمل میں یہ کوشش کرنا چاہیے، مخطوطہ شناس اپنی تحقیق اور تدوین کے دوران

جن منابع وماخذ کا سہارا لیتا ہے ان کا اقرار پوری صداقت و دیانت داری کے ساتھ کرے، ایسا کرنے سے اس کے تحقیقی کام اور علمی معیار میں کمی نہیں آتی، بلکہ اس کو کامیابی و کامرانی ہی حاصل ہوتی ہے، رشید حسن خان نے ایک کامیاب و کامران محقق اور مخطوطہ شناس کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے بالکل درست کہا ہے:

> ''تدوین کے لیے مزاج کا تحقیق آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کی تدوین کی شرائط سے اور اس کے اصولوں سے آدمی کماحقہ واقف ہو اور عملی مسائل سے بھی کم آشنا نہ ہو یعنی اسے یہ معلوم ہو کہ تدوین کا طریقہ کیا ہے، صحت متن کا مفہوم کیا ہے، اختلاف نسخ کا مطلب کیا ہے اور ایسے ہی دوسرے متعلقّات سے بھی بخوبی واقف ہو۔ فارسی اچھی طرح جانتا ہو۔ جس عہد کی تصنیف مرتب کرنا چاہتا ہو، اس عہد کی زبان کا خاص طور پر اس نے مطالعہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ اس عہد کے مصنفین کے کلام کا مفصل مطالعہ کیا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ باخبری سے مراد یہ نہیں کہ سنی سنائی پر قناعت کی جاچکی ہو''۱۸

جیسا کہ قبلاً بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ہندستان کی بے شمار ایسے کتب خانے اور سرکاری و غیر سرکاری ادارے موجود ہیں جہاں فارسی، عربی اور اردو وغیرہ زبانوں کے مخطوطات کا بڑا نایاب ونادر ذخیرہ پایا جاتا ہے لیکن بہت ہی افسوس و تاسف کے ساتھ ہمیں بار بار یہ کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہمارا یہ سرمایہ ہماری سہل پسندی اور لاپرواہی کے سبب بہت تیزی کے ساتھ ضائع ہوتا چلا جارہا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں لوگوں کے ذاتی ذخیرے بھی کچھ کم اہمیت کے حامل قرار نہیں دیئے جاسکتے ہیں، مگر فارسی زبان سے عدم واقفیت اور بے اعتنائی کے سبب یہ ذاتی ذخائر بھی انتہائی خراب وخستہ حالت میں ہیں اور بعض تو ایسے ہیں کہ دستبرد زمانہ کے ہاتھوں فنا ہو کر صفحہ قرطاس سے اپنے نام ونشان محو کر چکے ہیں، لیکن ہمیں یہ بات ہر گز بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، کہ یہ مخطوطات انسانی تہذیب و ثقافت کی اساس اور جدید تمدن کا شاندار ستون ہیں۔ اور یہ ہی سبب ہے کہ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں مخطوطات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ہمارا

بیشتر قدیم علمی وادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہی آج ہمارے پاس محفوظ ہے۔ قدیم تواریخ و تذکرے، سوانح وسیرت، داستانیں، مثنویات اور شعرا کے دواوین وغیرہ سب کے سب مخطوطات کی شکل میں ہی موجود ہیں اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا بے حد ضروری ہے کہ ان مخطوطات کے بغیر ہم اپنی ادبی روایات کی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتے ہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ عصر حاضر میں:

> ''تمام تر آسانیوں اور آسائشوں کے باوجود مخطوطہ شناسی کی روایت معاصر تحقیقی منظر نامے میں سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ بنیادی بات یہ ہے علم (Knowledge) کے بجائے محض معلومات (Information) کو ہی فوقیت دینے کے اس ماحول میں نوجوان محققین سرعت رفتاری کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں جب کہ ماضی کے مخطوطات تک پہنچنے، سمجھنے اور اپنانے کا عمل انتہائی احتیاط اور دقت نظری کا متقاضی ہے۔ ماضی سے کٹنے اور ان دیکھے مستقبل میں اپنی جگہ بنانے کی دوڑ میں معیار کے بجائے مقدار کا پہلو مقدم ہے۔ مسابقت اور معاشی گرانی کا ماحول پہلے ہی اہل علم کی ناک میں دم کیے ہوئے ہے، تن آسانی اور مشقت سے گریز کے باعث پتہ ماری کرنے والے قدیم علما کی تقلید کی توقع خام خیالی سے زیاد کچھ نہیں، ایسے میں اخلاص کے حامل اہل علم ودانش دن میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے''۱۹

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا یہ بیش قیمت ورثہ ہمارے ملک کے کونے کونے میں بکھرا پڑا ہے، جس کو محفوظ ومدون کرنے کی سخت ضرورت ہے، یہ بیش قیمت مخطوطات ہماری بے اعتنائی اور عدم توجہی کا شکار ہوکر آہستہ آہستہ صفحہ قرطاس سے اپنے نقش ونگار محو کرتے چلے جارہے ہیں، ان کی ناقدری کو دیکھ کر بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ صورت اسی طرح حال برقرار رہی اور وقت رہتے ہم نے ان کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہیں کی تو ہماری قوم ہمارے اسلاف کے اس قیمتی اثاثے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجائے گی اور پھر ہماری آنے والی نسلیں ہماری اس بے اعتنائی، لاپرواہی اور بے حسی پر کف افسوس ملتی رہیں گی، موجودہ وقت میں مخطوطہ شناسی کی روایت کو زندہ وتابندہ رکھنے والے لوگ، آٹے میں نمک کے برابر بھی باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ بڑی بڑی دانش

گاہوں میں بھی مخطوطہ شناسی پر ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی سطح پر تحقیقی کام کرنے طلبا اوراس موضوع پر کام کروانے والے اساتذہ دونوں ہی کی تعداد دن بہ دن کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہے جو یقیناً ہم سب کے لیے بہت تشویشناک بلکہ افسوس ناک بات ہے۔اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے، کہ مخطوطات کی تحقیق وتدوین کی سرپرستی پر معمور ہمارے سرکاری ادارے بھی اس سلسلے میں بہت زیادہ سرگرم اور پرجوش دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ماضی کی درخشاں اور تابندہ روایات سے اپنا رشتہ توڑ کر، ہم اپنے مستقبل کو روشن نہیں کرسکتے۔ مایوسی کے اس ماحول میں، ہمیں اصلاح احوال کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضمن میں فوری طور پر جو اقدام اٹھانے ضروری ہیں ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ جامعات میں مخطوطہ شناسی کی ارزش واہمیت پر سیمینار اور کانفرنسز کرائے جانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ، عالمی سطح پر سند یافتہ، مخطوطہ شناسی کے ماہرین سے مسلسل روابط ومراسم قائم رکھے جائیں اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے، اورایسے مخطوطات جو مرکزی یا ریاستی حکومتوں کی سرپرستی میں شائع کئے جاتے ہیں، انھیں ہر خاص وعام تک پہنچانے کا بندوبست کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ریاستی اور مرکزی سرکاروں کے زیر تحت آنے والی دانش گاہوں میں ریسرچ اسکالرز سے معیاری مقالات لکھوانے پر زور دیا جائے جائے اور ایسے اسکالرز جو مخطوطہ شناسی کے میدان میں خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی کی مالی معاونت یعنی Financial Support بھی کی جائے۔ اور سب سے بڑھ کر ہر خاص وعام کو اپنی اس میراث کی قدر وقیمت کا احساس کرانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے اقدامات کیے جائیں، اور ان کی جانب ہونے والی سنجیدہ تحقیقی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ اس بیش قیمت علمی میراث کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں کامیابی اور کامرانی حاصل ہوسکے اور بقول حافظ۔:

تازخواہی داشتن گر داغ ہائ سینہ را

گاھی گاھی بازخوان این قصہٗ پارینہ را

**ترجمہ:** اگر تو اس بات کا خواہش مند ہے کہ تیرے سینے کے داغ تازہ رہیں مراد اپنے اسلاف کے کارنامے تجھ کو یاد رہیں، تو کبھی کبھی ان پرانے قصوں کو پڑھ لیا کر۔

## ماخذ و منابع


۱۔ قواعد تحقیق و تدوین، شفیق انجم، پورب اکیڈمی، اسلام آباد پاکستان، ۲۰۱۵، ص ۹۹۔

۲۔ اصول تحقیق، عبد الحمید خان عباسی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۵، ص ۱۹۱۔

۳۔ تشکیل ( آن لائن اردو ریسرچ جرنل ) مضمون نگار اعجاز رازق اعوان، جلد ۲۔ شمارہ ۲، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۴، ص ۲۵۔۲۶۔

۴۔ اردو جامع انسایکلوپیڈیا، جلد دوم، حامد علی خان، مولانا مدیر اعلی، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۷، ص ۱۸۸۲۔

۵۔ رسالہ فکر و نظر ۷، مضمون نویس، ڈاکٹر انجم رحمانی، مخطوطات، ۲۰۱۵، ص ۳۴۔

۶۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی، مضمون فارسی میں تحقیق کی روائت، تحقیق و تدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۶، صفحہ نمبر ۵۵۔

۷۔ تحقیق و تدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۴۸۔۴۹۔

۸۔ تحقیق و تدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ۹۴۔

۹۔ تحقیق و تدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۱۱۹۔

۱۰۔ تحقیق و تدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۳۵۔

۱۱۔ تصحیح و تحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، احمد برادرز، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۰، ص ۱۸۔

۱۲۔ تصحیح و تحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، احمد برادرز، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۰، ص ۲۰۔

۱۳۔ مخطوطات، مالک رام، تلاش قرات وترتیب مشمولہ تحقیق وتدوین (سید محمد ہاشم) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۸، ص ۱۳۹۔
۱۴۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی، مضمون فارسی میں تحقیق کی روائت، تحقیق وتدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۶، صفحہ نمبر ۵۶۔
۱۵۔ تصحیح وتحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، احمد برادرز، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۰، ص ۲۲۔
۱۶۔ فن خطاطی ومخطوطہ شناسی، مرتب ڈاکٹر فضل الحق، جمال پرنٹنگ، ۱۹۸۶، ص ۱۶۔۱۷۔
۱۷۔ تصحیح وتحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، احمد برادرز، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۰، ص ۴۱۔
۱۸۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، الفیصل ناشران، لاہور پاکستان، ۲۰۰۳، ص ۹۴۔
۱۹۔ تشکیل (آن لائن اردو ریسرچ جرنل) مضمون نگار اعجاز رازق اعوان، جلد ۲۔ شمارہ ۲، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۴، ص ۲۵۔۲۶۔

***

# منشی پریم چند کا افسانہ 'نمک کا داروغہ' تاریخ کے پس منظر میں

ڈاکٹر محمد محسن
کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

## ملخص

زیر نظر افسانہ 'نمک کا داروغہ' منشی پریم چند کا مشہور ترین افسانہ ہے جو پریم چند کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی جہات پر مبنی ہے۔ اس افسانے سے مصنف نے حق شناسی اور ایمانداری کا پیغام دیا ہے۔ مقالے کی ابتدا تمہید میں برطانوی حکومت کے ذریعے نمک پر لگائے گئے ٹیکس کے قانون پر مدلل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مظلوم ہندوستانیوں پر انگریز حکمران نے جو ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے۔ پس اس بربریت کو مفصل پیش کیا ہے۔ بجز اس کے منشی پریم چند کی سوانحی پس منظر، تعلیمی سفر، تدریسی خدمات، ادبی سرگرمیوں اور تصانیف وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعدہٗ آخر میں افسانہ 'نمک کا داروغہ' پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

افسانہ نمک داروغہ پریم چند بنسی دھر الوپی دین انگریز
ٹیکس سول نافرمانی

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلیہ سلطنت کے نظام کو درہم برہم کرنے کے بعد متحدہ ہندوستان پر اپنی ناجائز حکومت مسلط کرلی تھی۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستانیوں پر آئے دن طرح طرح کے ظلم وستم کے ساتھ ساتھ مختلف نوعیت کے ٹیکس لگا کر غریب کمزور عوام کی کمر توڑ رکھی تھی۔ انہی خراج میں سے ایک ''نمک کا ٹیکس'' ہے۔ برصغیر کی عوام نے حکومت انگریز کے خلاف ایک تحریک چلائی تھی جو نمک ٹیکس کی مخالفت میں تھی۔ اس تحریک سول نافرمانی میں ملک گیر طور پر عوام، خواتین اور بچوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء (لاہور) کو کانگریس نے مکمل خود مختاری کا دعویٰ پیش کیا۔ قرار داد میں یہ پاس کیا گیا کہ انگریزی حکومت کو ٹیکس نہیں دیا جائے۔ اس قرار داد کے بعد برصغیر کی عوام نمک ٹیکس کے خلاف علم بردار ہوگئے۔ موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر کیا کہ نمک ٹیکس کے سبب ہی ہندوستانی عوام جذام میں مبتلا ہورہے ہیں۔ اس لیے نمک ٹیکس کے خلاف قانون شکنی میں ہندوستانی عوام صف آرا ہوگئے۔

تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو موریہ سلطنت اور مغلیہ دور میں بھی نمک پر ایک بڑا محصول عوام سے وصول کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کی عوام پر دکھ اور درد کا پہاڑ یہ بلند کیا کہ نمک کی پیداوار اور کاروبار پر رفتہ رفتہ اجارہ داری قائم کرلی۔ نمک ٹیکس میں اس قدر دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا کہ ہندوستانی ناتواں عوام اس لگان کو ادا کرنے سے قاصر تھے۔ کیوں کہ عوام اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی حکومت نہیں ہوتی وہ قوم غریب ونادار ہو جاتی ہے۔ جس قوم کی حکومت ہوتی اس کا خزانہ لبریز ہوتا ہے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا غیر انسانی فعل اس حد تک آپہنچا کہ ہندوستانی عوام کی نمک پیداوار اور اس کی تجارت پر مکمل طور پر روک لگادی اور قانون نافذ کیا کہ اس کے خلاف ورزی کرنے والے پر چھ ماہ بامشقت قید کی سزا دی جائے گی۔ مزید بر آں کہ وائسرائے رارڈ ریڈنگ کے عہد میں ۱۹۲۳ء میں نمک پر لگان دوگنا کرنے کی قرارداد پاس کی گئی۔

۵/اپریل ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے گجرات کے شہر احمد آباد میں موجود سابرمتی آشرم سے سرگرم ساتھیوں کے ساتھ ایک پیدل مارچ کا آغاز کیا۔ یہ پیدل مارچ ۳۸۵کلومیٹر کی مسافت طے کرکے گجرات کے ایک ساحل ڈانڈی پر پہنچ کر احتجاج کا سراپا بلند کیا اور گاندھی جی نے اپنے ہم راہوں کے ساتھ مل کر ۶/اپریل ۱۹۳۰ء کو نمک پیداوار کرکے انگریزی حکومت کی کھلے طور پر حکم عدولی کی۔

اس تحریک میں مرد وخواتین دونوں پیش پیش شامل تھے۔ چٹوپادھیائے نامی ایک خاتون بھی سول نافرمانی تحریک میں شامل تھیں۔ ان کی رہنمائی میں کافی تعداد میں خواتین ۱۶/اپریل ۱۹۳۰ء کو بمبئی کے قرب وجوار کے سالٹ ڈیپو کی طرف ہجوم لے کر رواں دواں ہوئیں۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوئیں اور اس جھڑپ کے دوران چٹوپادھیائے زخمی بھی ہو گئیں لیکن احتجاج ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ نیز ہجوم لے کر نمک کے ٹیلے کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔

بہر حال مہاتما گاندھی نے نمک پر محصول کے خلاف ستیہ گرہ تحریک جاری رکھا اور پیغام دیا کہ برصغیر کے عوام اس تحریک میں پیش پیش رہ کر نمک قانون کے خلاف ورزی میں اپنا نمایاں رول ادا کریں۔ لیکن اس تحریک میں اشتعال انگیزی و تشدد سے بچنے کی تلقین کی۔

سورت (گجرات) سے ۴/ مئی ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی کو گرفتار کرلیا اور وہاں سے منتقل کرکے انہیں پونا میں قید میں رکھا گیا لیکن کسی طرح کی کوئی قانونی کارروائی سے گریز کی گئی۔ مزید یہ کہ ان سے پہلے کانگریس پارٹی کے ایک عظیم لیڈر جواہر لال نہرو کو سول قانون کی نافرمانی پر قید کرلیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی کی قید کی خبر آگ کی چنگاری کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق ستیہ گرہ میں شامل ہونے لگے۔ ۵/ مئی ۱۹۳۰ء کو مشہور مؤرخ عرفان حبیب کے دادا عباس طیب اور مہاتما گاندھی کی اہلیہ کستوربا کی سرپرستی میں ستیہ گرہ احتجاج کی رہنمائی ہو رہی تھی۔ البتہ انہیں دھرسنا پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کرلیا اور تین مہینے کے لیے جیل میں بند کردیا گیا۔

بہر کیف اس تحریک میں سروجنی نائیڈو منسلک تھیں اور انہوں نے مضبوط قیادت سنبھال لیں۔ ان کی سرپرستی میں ہزاروں پیروکار موجود تھے۔ جنہوں نے دھرسنا میں نمک کی ایک کارگاہ پر چڑھائی کیں۔ اس عمل پر پولیس اشتعال انگیز ہو کر بھیڑ پر جبر و ظلم کی قہر ڈھایا۔ جس بنا پر سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں کے سر پھٹے، ہاتھ ٹوٹے اور جانیں گئیں پھر بھی مرد و زن کی جم غفیر احتجاج سے پیچھے نہیں ہٹے۔ یہاں تک کہ لوگ بے حواس ہو کر گڑے پڑے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر سو زمین پر خون ہی خون نظر آرہا تھا جو زندہ تھے وہ اپنے زخموں سے کراہتے ہوئے اس احتجاج کو پورے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے ایسے خوف زدہ عالم میں بھی پولیس (انگریز) اپنے وحشیانہ فعل سے باز نہیں آرہی تھی اور ہر طرح کے جبر و بربریت کے پہاڑ برپا کر رہے تھے اور لاشوں کو ٹھکانے لگا رہے تھے۔

اس خوفناک منظر کو یونائیٹڈ پریس کے نمائندے ویب ملر نے اپنی جدوجہد سے انگریز حکمران کی اس غیر انسانی فعل کو دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ اس دردناک سانحہ کو سیکڑوں اخبارات میں شائع کیا گیا۔

مندرجہ بالا المیہ کے بعد مہاتما گاندھی کی نمک ستیہ گرہ سے بیرون ممالک بھی آشنا ہو چکے تھے۔ جس سے اس تحریک کو پوری دنیا میں ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا گیا۔ نمک ستیہ گرہ کو کامیاب بنانے میں سیکڑوں ہندوستانی زخمی ہوئے، جیل گئے اور ساتھ ہی ساتھ شہید بھی ہوئے۔ بالآخر یہ تحریک ۱۹۳۱ء کی ابتدا تک قائم رہی۔

آخر کار انگریز سرکار نے مہاتما گاندھی کو جیل کی قید سے آزاد کیا تا کہ مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کے مابین باہمی گفتگو کی جائے۔ پہلی نشست کی بات چیت کے بعد دوسرے دور کی گفت وشنید کے لیے حالات ساز گار ہوئے اور گاندھی جی گول میز کانفرنس کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن تشریف لے گئے۔ بعدہٗ گاندھی جی کی رہنمائی میں تحریکیں چلتی رہیں اور بالآخر متحدہ ہندوستان ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہو گیا۔ بالخصوص ہم اپنے اسلاف کی قربانیوں کے سبب ہی ایک آزاد ملک میں خوشنما زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا تحریک پر اس لیے تفصیل سے بحث کی گئی ہے کیونکہ منشی پریم چند کو اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ الفت وانسیت تھی۔ وہ ہمیشہ آزادی کے لیے بے قرار رہتے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ وہ گاندھی جی کی تحریک ''عدم تعاون'' سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانہ ''نمک کا داروغہ'' لکھ کر ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ فرض سے آگاہی کا پیغام دیا جس کے نتیجے میں لوگ شدّت سے غلامی کو محسوس کرنے لگے۔ یوں تو انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام اپنی قربانی پیش کرتے آرہے تھے۔ لیکن پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کا افسانہ ''نمک کا داروغہ'' لوگوں کو بیدار کرنے میں امتیازی رول ادا کیا۔ بیداری کے سبب ہی گاندھی جی کی تحریکیں ''عدم تعاون'' اور ''سول نافرمانی'' (نمک ٹیکس) وغیرہ میں ہندوستانی عوام اپنی قربانی دینے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے۔

منشی پریم چند ایک علم رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت جہاں دیدہ شخصیت کے مالک تھے اور ادب کے عظیم افسانہ اور ناول نگاروں میں ان کا نام صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی ادبی صلاحیت اعلیٰ درجے کی تھی۔ جس صلاحیت کو بروئے کار لا کر انہوں نے افسانہ اور ناول کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ جو ان کی لافانی ادبی خدمات شمار کی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے اور ناولوں میں کئی موضوعات پر خامہ فرسائی کی مثلاً دیہات، کسان، مفلسوں کی بے کسی، مساواتی، بے راہ روی اور معاشرے کی برائی وعیب وغیرہ موضوعات کو شدت کے ساتھ اپنی تخلیقی کارکردگی سے اُجاگر کیا۔ انہوں نے اپنی سادہ اور عام فہم زبان سے فکشن کو ایک نئی روش عطا کی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے پرانی روش رومانوی طرز نگارش سے نجات دلا کر حقیقت پسندانہ تحریر کی جانب مائل کیے۔

اردو فکشن کے عظیم قلم کار منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور احباب خانہ انہیں نواب رائے کے نام سے پکارتے تھے۔ اس عظیم ہستی کی پیدائش ۳۱؍جولائی ۱۸۸۰ء کو اتر پردیش کے تاریخی شہر بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لمہی میں منشی عجائب رائے کے گھر میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس عہد کے مطابق حسبِ معمول گاؤں کے ہی اسکول میں ایک مولوی صاحب کے اتالیق مکمل ہوئی۔ منشی پریم چند کے والد منشی عجائب رائے ڈاک خانے میں ایک معمولی سرکاری ملازم تھے۔ ہمیشہ ان کی زندگی تنگ دستی میں گزرتی تھی۔ جس کی بنا پر گھر کے مالی حالات بہتر نہیں تھے۔ کچھ عرصے بعد ان کے والد محترم کا تبادلہ گورکھپور کے ایک ڈاک خانے میں ہو گیا تھا، جب وہ وہاں گئے تو ساتھ میں اپنے لائق وفائق بیٹے منشی پریم چند کو بھی لے گئے وہاں گورکھپور کے ایک اسکول میں حصولِ تعلیم کی غرض سے داخلہ کرا دیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہاں تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ البتہ جلد ہی بدلی ہو کر اپنے گاؤں لمہی میں مقیم ہو گئے اور ملازمت کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ اس اثنا میں منشی پریم چند کی والدہ ماجدہ اس دارِ فانی سے دارالبقاء کی طرف کوچ کر گئیں۔ اس وقت پریم چند کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ والدہ کی وفات ہونے کی وجہ سے ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور پریم چند کی زندگی اذیت اور مصیبت میں گزرنے لگی۔ چونکہ والد محترم نے دوسری شادی کر لی تھی۔ مزید یہ کہ منشی پریم چند زیر تعلیم تھے اور وہ میٹرک بھی نہیں کیے تھے کہ ظلم وستم کا یہ عالم رہا کہ ان کے والد گرامی نے پریم چند کی شادی ان سے زیادہ عمر کی ایک بدصورت لڑکی سے منحرف ہونے کے باوجود کر دی۔ ظاہر ہے کہ پریم چند کی اس وقت ازدواجی زندگی بہتر نہیں تھی۔ تعلقات میں تلخیاں تھیں۔ خلیج بڑھ گئی جس کی وجہ سے نباہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس تکلیف دہ دور میں والد محترم کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ پسماندگان میں سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کی معاشی ذمہ داری منشی پریم چند پر ہی آپڑی۔ منشی پریم چند کوسوں دور ننگے پاؤں پیدل ٹیوشن پڑھانے کی غرض سے صبح میں بنارس تشریف لے جاتے اور شب کی تاریکیوں میں گھر واپسی ہوتی تھی۔ گھر آکر چراغ کی مدھم روشنی میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں یک سوئی کے ساتھ لگ جاتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اردو اور فارسی کی مشہور معتبر تصانیف گلستاں بوستاں، آبِ حیات، طلسم ہوش ربا، فردوس بریں، امراؤ جان ادا، فسانۂ آزاد وغیرہ کتابوں کا مطالعہ بغور کر چکے تھے۔ اس دوران مطالعے میں مصروفیت کی بنا پر اکثر اوقات کھچڑی پکا کر ہی کھاتے تھے کیوں کہ کھچڑی پکانے میں ایک ہی برتن کا استعمال تھا۔ ایک برتن

ہونے کی وجہ سے صفائی میں بھی وقت کم لگتا تھا۔ منشی پریم چند ۱۸۹۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد وہ آگے کی تعلیم بھی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن بد قسمتی یہ رہی کہ حساب کے پرچے میں کم نمبر ہونے کی وجہ سے انہیں اس وقت کالج میں داخلہ نہیں مل سکا۔ ایک اسکول میں معلم کی حیثیت سے ملازمت قبول کرلی۔ کچھ مدت کے بعد الہ آباد کے ایک ٹریننگ اسکول سے درس و تدریس کا کورس مکمل کرنے کے بعد انہیں ایک سرٹیفکٹ تفویض کی گئی اور اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں کانپور کے ایک اسکول میں انہیں سرکاری نوکری مل گئی۔

منشی پریم چند اور زوجۂ اوّل کے مابین روز بروز تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جس کے سبب بیگم نے علٰحیدگی اختیار کر کے اپنے مائیکے چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد منشی پریم چند نے اپنے خاندان اور سماج کے خلاف جا کر ایک کم عمر بیوہ عورت شیورانی دیوی سے دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیوی سے ان کے کل تین اولاد ہوئیں۔ جن میں ایک بیٹی کا نام کملا اور بیٹوں کا نام شری پت رائے اور امرت رائے تھا۔

کانپور میں ملازمت کے دوران پریم چند کی ملاقات جریدہ 'زمانہ' کے مدیر منشی دیانارائن نگم سے ہوئی دونوں کا آپس میں دوستانہ اور یارانہ رشتہ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں پریم چند کا تبادلہ مہوبا ضلع ہمیر پور میں ڈپٹی اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے ہوگیا۔ یہاں ایک دہائی قیام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں تبدیل ہو کر گورکھپور تشریف لے آئے۔ بعدہٗ یہاں آکر کچھ دن بعد انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

منشی پریم چند مہاتما گاندھی سے بہت متاثر تھے۔ انہیں ملک کا ایک عظیم رہنما مانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان ایک دن ضرور برطانوی حکومت سے آزاد ہو گا۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تحریک ''عدم تعاون'' سے متاثر ہو کر اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ نے پریم چند کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر تحریک ''عدم تعاون'' اور ''سول نافرمانی'' تحریک میں تحریری طور پر حصہ لیا۔ نوکری چھوڑنے کے بعد پریم چند کی زندگی ایک بار پھر سے مفلسی کے شکار ہوگئی۔ اس بدحالی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے چرکھوں کی تجارت شروع کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ کافی خسارہ ہوا، پھر تنگ آکر کانپور کے ایک اسکول میں ملازمت اختیار کرلی، یہاں بھی گزارا نہیں ہوسکا۔

بنارس میں انہوں نے سرسوتی پریس قائم کیا لیکن اسے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ جس کی وجہ سے بند کر دیا۔ آخر کار لکھنؤ چلے آئے اور یہاں انہوں نے نول کشور پریس میں نوکری کرلی۔ بجز اس کے انہوں نے نصابی کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ رسالہ 'ہنس' اپنی نگرانی میں نکالا۔ ۱۹۳۴ء میں پریم چند مایا نگری چمک دمک کی دنیا بمبئی تشریف لے گئے۔ یہاں فلم 'مزدور' کی کہانی انہوں نے بذاتِ خود لکھی اور اس فلم میں مزدور کے لیڈر کا کردار بھی ادا کیا۔ لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ رسوخ دار طبقے نے بمبئی میں اس فلم کی نمائش نہیں ہونے دی۔ لاہور اور دہلی میں دکھائی گئی لیکن وہاں بھی صنعت کاروں نے اپنی طاقت کا استعمال کر کے روک لگادی۔ باطنی طور پر پریم چند کو فلمی دنیا کی زندگی پسند نہیں تھی۔ فلموں کے لیے تحریری کام اچھا خاصا مل رہا تھا لیکن بمبئی کی زندگی راس نہیں آنے کی وجہ سے وہ اپنے آبائی وطن بنارس واپس لوٹ آئے۔ لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس ۱۹۳۶ء میں منعقد کی گئی تھی۔ جس کانفرنس کی صدارت کا شرف منشی پریم چند کو حاصل ہوا۔

اردو فکشن کا ایک معزز و نامور شخصیت کا حامل منشی پریم چند اپنی زندگی کے آخری ایام میں غربت و ناداری سے جوجھ رہے تھے۔ طویل علالت کے عالم میں اپنے ہی گاؤں لمہی میں ۱۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو فانی دنیا سے باقی دنیا کی طرف منتقل ہو گئے۔

منشی پریم چند کی تخلیقی کام کی طرف نظر ڈالی جائے تو انہوں نے ابتداءً دو ڈرامے تحریر فرمائے تھے لیکن کسی بنا پر وہ ڈرامے چھپ نہیں سکے۔ کچھ عرصے بعد باضابطہ طور پر ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناول ''اسرارِ معابد'' سے ہوا۔ جو ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان ایک ہفت روزہ اخبار 'آوازۂ حق' میں بتدریج اور حصہ در حصہ شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار شاہکار ناول منظر عام پر آئے۔ جس میں تکنیکی اعتبار سے 'میدانِ عمل' ایک لازوال ناول ہے لیکن جو شہرت و مقبولیت ان کے ناول ''گئودان'' کو ملی وہ دیگر کسی اور ناول کو نہیں ملی۔

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز باضابطہ طور پر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' ہے یہ افسانہ رسالہ 'زمانہ' کانپور میں نواب رائے کے نام سے اپریل ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ کچھ مہینے بعد پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل پانچ افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن''، ''شیخ مخمور''، ''یہی میرا وطن ہے''، ''صلۂ ماتم'' اور ''عشق دنیا اور حب

وطن"شامل تھے۔اس مجموعے کو انگریزی حکومت نے ضبط کر کے اسے آگ کی نذر کر دیا اور منشی پریم چند پر مقدمہ عائد کیا جس کی وجہ سے انہیں قید کر لیا گیا۔مہاتما گاندھی کی مدد سے جیل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئے ۔بہر حال پریم چندنے ان سب مشکلات کے باوجود بھی اپنی تخلیقی کام کو ترک نہیں کیا اور پائے استقلال میں استقامت قائم رہی اور انہوں نے پریم چند کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ تاحیات قائم رہا۔پریم چند کی اردو افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔پہلا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۷ء تک کے عہد کا ہے۔جس میں ان کے دو افسانوی مجموعے "سوزِ وطن"(۱۹۰۸ء) اور پریم پچیسی حصہ اول(۱۹۱۵ء) منظر عام پر آئے۔دوسرا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک کو قرار دیا جاتا ہے۔اس زمانے میں کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جس میں پریم پچیسی حصہ دوم (۱۹۱۸ء) پریم بتیسی حصہ اول(۱۹۲۰ء) ،پریم بتیسی حصہ دوم (۱۹۲۰ء) ،خاک پروانہ (۱۹۲۸ء) ،خواب وخیال (۱۹۲۸ء)،فردوس خیال(۱۹۲۹ء)،پریم چالیسی حصہ اول(۱۹۳۰ء) اور پریم چالیسی حصہ دوم(۱۹۳۰ء) ہیں۔آخری دور جسے تیسرا دور کہا جاتا ہے۔اس کا عہد ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے۔اس دور میں کل چار افسانوی مجموعے طبع ہوئے۔ان میں آخری تحفہ (۱۹۳۴ء)،زادِ راہ(۱۹۳۶ء)،دودھ کی قیمت (۱۹۳۷ء)،واردات(۱۹۳۸ء) ہیں۔غور طلب امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا کے کسی بھی مجموعے میں پریم چند کا شاہکار افسانہ کفن شامل نہیں ہے۔۔اس کے علاوہ اور کئی افسانے بھی شامل ہونے سے قاصر رہے۔پروفیسر قمر رئیس اس طرح رقم کرتے ہیں:

> "ان مجموعوں میں پریم چند کی (ہندی سے اخذ ترجمہ) طویل کہانی 'روٹھی رانی' شامل نہیں جو الگ سے شائع ہوئی۔ان کے علاوہ 'سیر دوریش' اور 'کفن' جیسی کہانیاں بھی مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں۔ان سب کی مجموعی تعداد ۱۹۵ ہوتی ہے۔جب کہ ہندی مجموعوں میں شائع ہونے والی ان کی کہانی کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔"

(پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ڈاکٹر قمر رئیس۔صفحہ نمبر۔۱۳)

زیرِ بحث پریم چند کا افسانہ 'نمک کا داروغہ' ہے جو ۱۹۱۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس افسانے کا مرکزی کردار "منشی دھر" ہے جس میں فرض کی ادائیگی اور ایمانداری کے جذبے کی علامت پائی جاتی ہیں۔افسانے کی کہانی اس طرح ہے:

یہ بات اس وقت کی ہے جب انگریزی حکمران نمک پر پابندی عائد کی ہوئی تھی۔اس افسانے کا ہیرو بنسی دھر ہے اور پورا افسانہ بنسی دھر کے ہی ارد گرد گھومتا ہے۔ بنسی دھر کے والد پنڈت جی جہاں دیدہ شخص تھے انھوں نے اپنے بیٹے بنسی دھر کو بلایا اور گھر کے سارے حالات کا ذکر کیا کہ اب میرے اندر اتنی سکت باقی نہیں رہی اور تمہاری بہنوں کی عمر گنگا جمنا کے پانی کی طرح بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ کچھ ایسا کام کرو کہ باہر کی آمدنی ہو تا کہ گھر کے حالات بہتر ہو سکے۔ایک طویل نصیحت امیز کلمات سننے کے بعد بنسی دھر پنڈت جی سے رخصت لیا اور کام کی تلاش میں نکل پڑے،اس وقت نمک صیغہ میں نوکری کی بحالی ہو رہی تھی۔ عوام تو عوام وکیل اور پٹواری بھی اس نوکری کے طلب گار تھے۔ بنسی دھر گھر سے ضرور کچھ میٹھا کھا کر نکلا ہو گا اس پر بھگوان کی کرپا اور پنڈت جی کی دعا تھی کہ بنسی دھر کو داروغۂ نمک کے عہدے پر نوکری ملی۔ بنسی دھر نے خط کے ذریعے بوڑھے باپ اور بیوی کو خبر بھیجی۔ پنڈت جی رشک کرنے لگے اور پڑوسیوں میں حسد و کینہ نظر آرہا تھا۔اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ”بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال،اپنا رفیق،اپنی ہمت،اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔خوبیِ قسمت ساتھ تھی،صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ معقول،بالائی رقم کچھ ٹھکانہ نہ تھا،بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سندلی،پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔“

(پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ڈاکٹر قمر رئیس۔ صفحہ ۳۷)

بنسی دھر حسبِ معمول نوکری پر تھے اور روزانہ کی طرح اپنے آفس میں موجود رہتے رات کو وہیں آرام کرتے تھے ۔پانچ چھ مہینے کا عرصہ ہو چکا تھا۔ایک رات شور شرابا کی آواز بنسی دھر کو نیند سے جگادی۔ بنسی دھر جب آنکھ کھول کر باہر دیکھا تو بیل گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر بنسی دھر کو محسوس ہوا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ فوراً اٹھے ،وردی پہنی اور بندوق کو کمر میں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو کر نکل پڑے۔ کچھ ہی وقت میں بنسی دھر بیل گاڑیوں کے

قافلے تک آ پہنچے۔ اور انھیں تیز گرج کی آواز سے روک دیا! اور ان سے سوال کیا کہ کس کی بیل گاڑیاں ہیں؟ کچھ دیر خاموشی کے بعد جواب ملا "پنڈت الوپی دین" کی۔ بنسی دھر نے حکمران کی حیثیت سے برق آواز سے پوچھا کون پنڈت الوپی دین؟ جواب ملا "داتا گنج والے" یہ جواب سن کر بنسی دھر تعجب میں پڑ گئے اس لیے کہ پنڈت الوپی دین اس علاقے کا سب سے امیر آدمی تھا۔ لاکھوں میں ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے سے بڑے انگریزی حکام ان کے یہاں آتے اور سلام پیش کرتے تھے۔ ان کے ساتھ شکار پر جاتے اور طرح طرح کے دل جوئی کا کھیل کھیلتے تھے۔

بنسی دھر تھوڑی خاموشی کے بعد پھر سوال کیا۔ کہ بیل گاڑیوں میں کیا ہے؟ سب خاموش رہے، بنسی دھر خود گھوڑے کو آگے بڑھا کر ایک بیل گاڑی کے قریب لے گیا اور اسے معائنہ کر کے دیکھا تو پتا چلا کہ ان پر نمک کے ڈھیلے لدے ہوئے ہیں۔ اور یہ قانون کے خلاف تھا۔ کچھ ہی دیر میں یہ خبر پنڈت الوپی دین تک پہنچی پنڈت جی اپنے خوبصورت گھوڑا گاڑی میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ خبر سن کر بہت آرام سے جواب دیا کہ چلو آ رہے ہیں۔ الوپی دین کو مال و دولت پر بڑا فخر تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ پیسے سے جنت بھی خریدی جا سکتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں الوپی دین داروغہ نمک کے پاس آ گئے۔ اور مسکراہٹ کے ساتھ ان سے کلام شروع کیا ۔ برہمنوں کا حوالہ دینے کے بعد کہا کہ داروغہ صاحب آپ کے علاقے سے بیل گاڑی جا رہی ہیں اور آپ کو چڑھاوا نہیں ملا دراصل میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحفہ پیش کرنا چاہ رہا تھا۔ الوپی دین نے اپنے منشی کو ایک ہزار کا نوٹ نکال کر دینے کا حکم دیا۔ داروغہ صاحب نے سخت لہجے میں جواب دیا کہ آپ نے غیر قانونی کام کیا ہے ابھی آپ کو حراست میں لیا جا رہا ہے اور جمعدار بدلو سنگھ کو ہتھکڑی پہنانے کا حکم دیا! بدلو سنگھ بھی چونک گیا اور وہاں موجود سارے لوگ یہ سن کر ہکّہ بکّہ رہ گئے۔ الوپی دین یہ سن کر دنگ رہ گئے اور داروغہ صاحب کے قریب آئے اور بولے صاحب ایسے میری ساری عزت مٹیا میل ہو جائے گی۔ مہربانی کر کے لے دیکر معاملہ رفع دفع کیجیے۔ الوپی دین نے چالیس ہزار روپے دینے تک جا پہنچا لیکن داروغہ صاحب نے ایک نہ سنی اور الوپی دین کو حراست میں لے لیا۔ صبح تک یہ خبر آگ کی چنگاری کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔

داروغہ بنسی دھر نے الوپی دین کو کل ہو کر کوٹ میں پیش کیا، کوٹ میں چپراسی سے لے کر جج تک الوپی دین کے ہی خیر خواہ تھے۔ کچھ وقت بحث کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی کہ الوپی دین ایک ممتاز شخص ہے اور

داروغہ صاحب کے پاس کوئی پختہ ثبوت موجود نہ ہونے کی وجہ سے الوپی دین کو باعزت رہا کر دیا جاتا ہے۔ داروغہ صاحب کے پاس ایمانداری کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ ان پر لوگ طرح طرح کے طنز کس رہے تھے اور پنڈت الوپی دین کے چرچے ہی چرچے ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد داروغہ صاحب کو نوکری سے معطل کر دیا جاتا ہے اور وہ مایوسی کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ گھر پر بیوی، بوڑھے ماں باپ سب صدمے اور غم میں مبتلا تھے ۔ کوئی بھی سیدھے منھ بات نہیں کر رہا تھا۔ والد صاحب نے بہت کھرے کھوٹا سنایا۔ کچھ دن کے بعد پنڈت الوپی دین کی رتھ بنسی دھر کے گھر پر آ کھڑی ہوئی یہ دیکھ کر بنسی دھر کے پِتا دوڑتے ہوئے آئے اور آؤ بھگت میں لگ گئے اور ان کے سامنے ہی اپنے بیٹے پر لعن طعن بھیجنے لگے۔ اس سے اچھا ہوتا کہ بھگوان مجھے بے اولاد ہی رکھتا۔ الوپی دین نے سمجھایا کہ آپ اپنے بیٹے پر رشک کیجیے اس طرح کے ایماندار بیٹا کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد پنڈت الوپی دین بنسی دھر سے مخاطب ہو کر گزارش کی کہ میں برہمن ہوں جب تک آپ میری بات نہیں مانیں گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا اور ایک کاغذی دستاویز بنسی دھر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے پڑھنے کے بعد بنسی دھر کی آنکھوں سے آنسوں نکل پڑے اور عرض کیا کہ مالک میں ایک معمولی آدمی ہوں اتنے بڑے عہدے کا حقدار نہیں ۔ الوپی دین بنسی دھر کو اپنے پورے جائیداد کا خود مختار بنانے کا حلف نامہ پر دستخط کرنے کی گزارش کر رہا تھا اور کہا کہ بابو میں پوری دنیا گھوم چکا ہوں اور ہر ایک کو پیسے کے سامنے اپنا ضمیر بیچتے ہوئے دیکھا ہے لاکھوں لوگوں سے ملا ہوں سب ایک نہ ایک وقت میں اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کافی لمبی گفتگو کے بعد بنسی دھر ان کاغذات پر دستخط کر دیتا ہے۔

افسانہ میں ایک موقع پر ایسا لگتا ہے کہ حق وصداقت کی ہار ہو گئی ہے۔ لیکن افسانہ کے اختتام پر سچائی اور حق کی ہی جیت ہوتی ہے۔ الوپی دین بنسی دھر کے ایمانداری کے سامنے اپنا سر خم کر دیتا ہے اور انھیں اپنی پوری جائیداد کا خود مختار بنا دیتا ہے۔ چھ (٦) ہزار روپیے سالانہ اور اس کے علاوہ روز کے خرچے، سواری کے لیے گھوڑا گاڑی اور رہنے کے لیے مکان بھی دیتا ہے۔

الغرض 'افسانہ نمک کا داروغہ' کے ذریعے منشی پریم چند نے حق وصداقت کا پیغام دیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بنسی دھر اور پنڈت الوپی دین ہے۔ بنسی دھر نے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کیا، اپنی نوکری سے بھی معطل ہوئے

لیکن اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا اور حق و باطل کے مابین ایک پہاڑ کی مانند کھڑا رہا۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ غلام تھا۔ انگریز قوم سازش، تعصب اور فریب سے صدیوں تک متحدہ ہندوستان پر مسلط تھی۔ مصنف کے دل میں آزادی کا جذبہ لبریز تھا۔ وہ مسلسل اپنی تخلیقی کارکردگی کے ذریعے ہندوستانی عوام کو فرض شناسی کا پیغام دے رہے تھے تاکہ غلامی کی زنجیروں سے نجات ملے۔

حوالہ جات:


۱۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے (پروفیسر قمر رئیس)

۲۔ افسانہ نمک کا داروغہ (منشی پریم چند)

۳۔ پریم چند فکر و فن (پروفیسر قمر رئیس)

۴۔ منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے (پروفیسر قمر رئیس)

۵۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل (پروفیسر گوپی چند نارنگ)


***

# برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح اور فکری بیداری میں حالی کا کردار

Md. Habibullah Muskan
Researcher, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

**Abstract:** The decline that overtook Indian Muslims after the collapse of the Mughal Empire and the unsuccessful revolt of 1857 marked a decisive moment in the history of South Asia. Political marginalization, cultural inertia and a growing intellectual vacuum created conditions in which reformist thinkers became indispensable. In this troubled period, Altaf Husain Hali (1837-1914) emerged as one of the most influential voices advocating moral and intellectual renewal. Closely associated with Sir Syed Ahmad Khan and the wider Aligarh Movement, Hali used poetry and prose as practical instruments for awakening communal consciousness and guiding Muslims towards balanced religious understanding, social reform and modern education. His celebrated work, Musaddas-e-Hali, not only recounts the rise and fall of Islamic civilization but also serves as a pointed reminder that progress requires discipline, unity and a willingness to abandon outdated and unproductive attitudes.

This article explores Hali's reformist project from several angles: his diagnosis of Muslim decline; his emphasis on ethical and educational uplift; his advocacy of women's rights in writings such as Majalis-un-Nissa, Chup ki Daad, and

Munaajat-e-Bewah and his efforts to recast Urdu literature as a vehicle of national service. The discussion also considers his association with Anjuman-e-Punjab (The Punjab Literary Society) and his evolution from a conventional ghazal poet to a major architect of modern Urdu poetry. The study shows that Hali's impact reached far beyond literature. His ideas encouraged self-reflection, promoted communal harmony and helped prepare the intellectual foundations for later reform and nationalist movements. Ultimately, Hali's enduring significance lies in his ability to offer a coherent vision for the moral and intellectual revival of Indian Muslims, making him one of the defining reformers of the nineteenth century.

**Keywords:** Altaf Husain Hali, Muslim Reform in India, Intellectual Awakening, Aligarh Movement, Urdu Literary Modernism, Social and Moral Reform, Educational Reform, Women's Rights in Urdu Literature

.....

مغلیہ سلطنت کے زوال اور ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد ہندوستانیوں خصوصا امت مسلمہ پر شاید قہر سا برسنے لگا تھا۔ ادھر عثمانی خلافت کا چراغ بھی ٹمٹما رہا تھا اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر کالی گھٹا چھانے لگی۔ ہندوستان جو کہ مغلیہ دور میں اپنی مثال آپ تھا انگریزوں کے دور حکومت میں اسے سیاسی اور سماجی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام کی ذہنیت دھیرے دھیرے بد سے بدتر ہوتی گئی۔ انگریزوں کی مخالفت میں انہوں نے کب جدیدیت

کے مثبت پہلوؤں کی مخالفت کر دی اس کا اندازہ انہیں بھی نہیں تھا۔ جس کا خمیازہ آگے چل کر کئی نسلوں کو اٹھانا پڑا۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوؤں میں تیزی سے توہم پرستی کا رجحان فروغ پانے لگا اور یوں ہندوستانیوں کو پستی اور جہالت نے اپنے احاطے میں داخل کر لیا۔ لیکن اس دور میں چند ایسے وطن پرست، انسان دوست اور دین اسلام سے رغبت رکھنے والی شخصیات موجود تھیں جنہوں نے آگے چل کر برصغیر کے لوگوں خصوصا مسلمانوں کو بیدار کیا۔ ان میں اردو ادب کے عناصر خمسہ قابل ذکر ہیں۔ سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) اور ان کے رفقا نے جس جدوجہد کا آغاز کیا تھا اس نے آگے چل کر ہندوستانیوں میں ان اصلاحی پروگرام کے زیر اثر بے پناہ شعور بیدار کیا اور یوں ۱۹۴۷ء میں مکمل طور پر ہمیں انگریزوں سے آزادی مل گئی۔

سر سید کے ان رفقاء کو اگر ایک فہرست میں جگہ دی جائے تو اکثر و بیشتر محققین کے نزدیک مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کا نام اول نمبر پر آئے گا۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، نثر نگار اور مصلح قوم و ملت تھے۔ انہوں نے اپنی حیات میں ہر ممکن کوشش کی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کی قدیم شان و شوکت کی یاد دلائی جائے اور ان میں غیرت و بیداری کا عنصر پیدا ہو سکے۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے انہوں نے ایک نعرہ بلند کیا تھا جو آج بھی کافی مشہور ہے:

سدا ایک ہی رخ ناؤ نہیں چلتی
چلو ادھر کو ہوا ہو جدھر کو[i]

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں بڑے بڑے بزرگان دین اور صوفیاء گزرے ہیں۔ ان کا شجرہ نصب صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ان کا اصلی نام الطاف حسین اور حالیؔ ان کا تخلص تھا۔ غالب کے مشورہ پر انہوں نے اس تخلص کا استعمال کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ خستہ تخلص کرتے تھے۔ جب ان کی عمر محض نو برس کی تھی تو ان کے والد خواجہ ایزد بخش انصاری کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کے ہاتھوں سپرد ہوئی۔ حالیؔ نے اپنے لڑکپن میں ہی قرآن کریم کا حفظ کر لیا تھا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ دہلی چلے آئے۔ انہوں نے عربی

کے لیے مولوی نوازش علی اور شعر و ادب کے لیے غالب کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں کلیکٹر کے دفتر میں ان کا تقرر ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حالیؔ جہانگیر آباد میں شیفتہ کے پاس چلے گئے اور ان سے شعر و شاعری کی اصلاح لینے لگے۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کا شمار اس دور میں اعلی پایہ کے شاعروں اور رئیسوں میں ہوتا تھا۔ حالیؔ کے قول کے مطابق وہ اپنی ادبی زندگی میں دو شخصیات سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ ایک تو ان کے عزیز استاد غالب تھے، جن سے انہوں نے خیالات میں وسعت اور فلسفیانہ رجحان کا درس حاصل کیا۔ اور دوسرے شیفتہ جن سے انہوں نے ان کٹھن فلسفیانہ افکار کو بڑی آسانی سے ادا کرنے کا انداز سیکھا۔ جیسا کہ حالیؔ خود کہتے ہیں:

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا، معتقد ہوں میر کا[ii]

حالیؔ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں:

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننیہال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے۔ جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے۔ اور زمانہ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔[iii]

مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) کا شمار بر صغیر کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے امت مسلمہ کو فکری راہ دکھائی، اپنی عظمت رفتہ سے آگاہ کیا اور ادب میں نئے نئے زاویے تراشے۔ ان سے پہلے بھی اگرچہ باقیوں نے ادب و صحافت کے ذریعہ مسلمانوں میں اصلاح اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی کوشیش کی، مگر ان کی طرح کسی کی کوششیں کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ خود علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) انہیں اپنا اول درجہ کا سفیر اور ان کی مسدس کو آخرت کے لئے ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی اور بابائے اردو مولوی عبد الحق جیسی شخصیتیں ان کی تعریفوں کے پل باندھتی ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق لکھتے ہیں:

مولانا حالی کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی دوسری درد دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔[iv]

ویسے تو حالیؔ مختلف النوع شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر خدمت گار قوم و ملت اور ماہر ادیب تھے۔ مسلمانوں کی زندگی ان کی شخصیت اور فن دونوں سے متاثر ہوئی ہے۔ حالیؔ نے جس دردمندی اور خلوص نیت کے ساتھ اسلامی قدروں کو اپنے فکر و فن کا محور بنایا ہے اسے اردو کے بہت کم شاعروں نے اپنے کلام میں ڈھالہ ہے۔ پرانی غزلوں کو چھوڑ کر ان کی شاعری کا شاید ہی کوئی جزو ہو جس میں آن حضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیرت اور پیغام کا عکس صاف نظر نہ آئے۔[v]

حالیؔ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہم ان میں تین طرح کے رجحانات دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا پہلا ادبی دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے عام شاعروں کی طرح غزلیں لکھیں۔ مگر ان کی شہرت کا اصل راز ان کے دوسرے اور تیسرے دور میں مضمر ہے۔ دوسرا دور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۵ء پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے جدت پسندی اختیار کی اور حب وطن اور انسانیت کے مختلف موضوعات پر اشعار لکھے۔ ان کا تیسر اور آخری ادبی دور ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۲ء تک قرار پاتا ہے۔ جہاں انہوں نے رباعیات اور مسدس لکھ کر اسلامی نظریات کو فروغ دیا اور مسلمانان ہند کو گہری نیند کی چپیٹ سے جگانے کی کوشش کی۔ حالیؔ اپنے کلام کے محاسن کی قدر و قیمت اور گوہر نایاب سے ابھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ اس وقت مرزا اسد اللہ خان غالب نے ان کی پوشیدہ قابلیت کو پہچان لیا تھا۔ غالب نے ایک ایسے چراغ کو اپنی نگاہ دور رس سے بھانپ لیا تھا جو مستقبل قریب میں روشن ہونے والا اور اپنے آب و تاب سے نظام ادب میں ایک نئی روش کی بنیاد رکھنے والا ہو۔ حالیؔ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

جس زمانے میں میر ادلی جاناہوا تھامرزااسد اللہ خان غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔

ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یافارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ:

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی اصلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔"

مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔[vi]

انیسویں صدی میں جب اسلامی تہذیب و تمدن مغرب کی ناپاکی اور عریانی سے دو چار ہو رہی تھی تو ایک مخلص امتی اور وحدانیت پرست کی حیثیت سے حالیؔ کا دل پاش پاش ہو گیا۔ وہ باقیوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہے۔ بلکہ سب سے پہلے اپنے شدید غم کا اظہار کیا، امت مسلمہ کو اپنی تابناک ماضی کی یاد دلانے کی کوشش کی اور چاہا کہ مسلمانوں میں ایک دفعہ پھر وہی دبدبہ اور اخلاقیات قائم ہو جو کہ کبھی خلافت راشدہ کے دوران موجود ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ نبوی تعلیم اور تہذیب کو سچا جانا اور مغربی تہذیب و تمدن کے منفی پہلوؤں کی مذمت کی۔ جس کا اظہار وہ مسدس حالی یعنی 'مد و جزر اسلام' نظم میں کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

وہ قومیں جو ہیں آج غمخوار انساں  درندوں کی اور ان کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں  بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے  وہ تھے بھیڑیئے آدمی خوار سارے[vii]

مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جس میں چھ چھ مصرعے کا بند ہوتا ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے متحد القوافی ہوتے ہیں۔ اور باقی دو مصرعے جداگانہ کافیوں میں ہوتے ہیں۔[viii] مسدس حالی میں مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) نے اسلام کے عروج وزوال کی داستان کو بڑے دردناک اور دل نشیں پرائے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کا اصلی نام مدوجزر اسلام ہے جو ۳۵۶ بند پر مشتمل ہے۔ ہر ایک بند مسدس کے انداز میں لکھنے کی وجہ سے یہ مسدس حالی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں وہ مسلمانوں کی پست ذہنیت اور نامرادی و ناکامی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس مسدس میں حالیؔ نے مسلمانوں کی قدیم ناموری، شان و شوکت اور ایک طویل مدت کے بعد زوال اور زبوں حالیؔ کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخر میں ان کی فریاد بھی موجود ہے کہ کس طرح ہم ان کٹھنائیوں سے نجات پاسکتے ہیں۔ حالیؔ نے مسدس کے دیباچے میں اس کی بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتہ سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس آب رحمت سے امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے۔ جس میں آکر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔[ix]

مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کی نظم شکوۂ ہند اردو کی ابتدائی قومی اور اصلاحی شاعری میں ایک اہم سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ یہ نظم ۱۸۸۴ء کے قریب لکھی گئی اور مختلف رسائل میں شائع ہوئی۔ اس کا تعلق حالیؔ کے اس دور سے ہے جب مسدس حالی کے بعد وہ ہندوستانی قوم کی اخلاق اور معاشرتی بگاڑ پر سخت ترین تنقید کرنے لگے تھے۔ اس نظم کا بنیادی ڈھانچہ خطابیہ شکوے کے انداز پر قائم ہے۔ مگر شکوہ کسی فرد، گروہ یا حکومت سے نہیں بلکہ خود ہندوستان کی جانب سے ہے جو اپنے باشندوں کے رویوں پر اعتراض کرتا ہے۔ حالیؔ نے ہندوستان کو ایک زندہ اور حساس کردار بنادیا ہے، جو کہتا ہے کہ میری تباہی کسی بیرونی قوت کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ میرے اپنے لوگوں کی غفلت، بداعمالی، باہمی دشمنی اور اخلاقی زوال کی وجہ سے ہوئی۔ وہ فرقہ وارانہ اختلافات، تعلیمی بے توجہی، اخلاقی کمزوری،

سیاسی بے بصیرتی اور قومی بکھراؤ کو ایسی خرابیاں قرار دیتے ہیں جنہوں نے ملک کو کمزور کیا اور ترقی کے راستے بند کیے۔

یہ نظم صرف جذباتی مکالمہ نہیں بلکہ اخلاقی نصیحت، سماجی تجزیہ اور تہذیبی تشخیص پر زور دیتی ہے۔ اور یہی اسے حالیؔ کے دوسرے اصلاحی کاموں سے جوڑتا ہے۔ لائٹنز، آزاد اور انجمنِ پنجاب کی اصلاحی فکر نے حالیؔ کے ذہن میں جو تبدیلی پیدا کی تھی اس کا صاف اثر اس نظم کی زبان اور لہجے میں ملتا ہے۔ نظم میں نہ تصنع ہے، نہ مبالغہ آرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان سادہ، سہل اور بامقصد ہے۔ شکوۂ ہند کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو پہلی بار یہ احساس دلایا کہ قوموں کی تباہی باہر سے نہیں آتی، بلکہ اندرونی ماحول اسے پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ نظم اردو میں قومی شعور کی تشکیل میں ایک مضبوط دلیل بن گئی اور آج بھی اسے اخلاقی، اصلاحی اور اجتماعی خود احتسابی کی بہترین مثال سمجھا جاتا ہے۔ نظم 'شکوہ ہند' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پر گلا یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ  وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کر دیا بالکل گدا
آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں  خاک میں آخر دیئے اسے ہند سب تو نے بلا
یاد ہو گا تجھ کو یہاں آئے تھے ہم کس شان سے
تجھ کو سوگند اپنے ست جنگ کی بتا ایمان سے [x]

سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کی تحریک علی گڑھ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں ذہنی و فکری بیداری پیدا کرنا تھا۔ سر سید نے اصلاح معاشرت کے لیے سب سے پہلے پرانے تعلیمی نظام کو بدل کر نئے مغربی تعلیمی نظام کو اپنایا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانان ہند مغربی جدید تعلیم اور سائنسی حقائق کی طرف راغب نہ ہوئے تو اس قوم کے لئے کامیابی کی راہ پر گامزن ہونا ناممکن ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے علی گڑھ تحریک کی سنگ بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ آگے چل کر اسی کالج نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے ظہور پایا۔

علی گڑھ تحریک میں حالیؔ سرسید کے اس انقلابی سفر کے ایک اہم رفیق کار اور ترجمان بنے۔ سرسید اور مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) نے ہندوستان کے زوال پذیر مسلم معاشرے کو بیداری کے گیت سنانے کے لیے فکری، عملی، تہذیبی اور تعلیمی سطح پر مشترکہ طور پر جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو علمی طور پر عقلیت پسندی، سائنسی شعور اور جدید تعلیم کی اہمیت پر توجہ مرکوز کرائی۔ حالیؔ نے سرسید کے ان اقدامات کو ادبی اور منظوم جامہ پہنا کر حسن اخلاق اور سماجی بصیرت کے ساتھ آگے بڑھایا۔ اصلاح معاشرت کی اس جدوجہد میں حالیؔ اور سرسید کا تعلق کافی گہرا ہو چکا تھا۔ سرسید نے مسلم سماج کو فکری جمود سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی جو حالیؔ کے دل کو بھا گئی۔ اس کے علاوہ سرسید اور حالیؔ نے مل کر قوم کو خرافات، بدعات اور روایت پرستی سے نکالا اور جدید دنیا کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی دعوت دی۔ حالیؔ نے سرسید کی ان کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حیات جاوید (۱۹۰۱ء) کے نام سے سرسید کی زندگی، ادبی کارناموں اور اصلاحی اقدامات پر ایک مفصل کتاب تصنیف کی۔

چونکہ وہ دور شعر و شاعری کا تھا۔ اس لیے سرسید کو ضرورت تھی کہ شعر و ادب کے ذریعے ہی مسلمانان ہند میں یہ فکری بیداری پیدا کی جائے۔ اور اس کام کے لیے ان کے نزدیک حالیؔ سے بڑھ کر دوسرا کوئی بھی شخص مفید ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا سرسید کی درخواست پر حالیؔ نے ایک دلکش اور پر درد نظم "مسدس حالی" قلمبند کر کے مسلمانوں کی رگوں میں ایمان کی حرارت کو دوبارہ جگانے کی کوشش کی۔ حالیؔ مسلمانوں کی ابتری، زبوں حالی اور خواب غفلت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے  فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے  چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم
پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے  تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں رعونت وہی ہے  ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ

نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ [xi]

مسدس حالی کے متعلق سر سید احمد خان کا قول کچھ یوں ہے:

بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس حالی لکھوا کر لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ [xii]

مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) نے بر صغیر میں جس فکری بیداری کی بنیاد رکھی تھی اس کی ایک اہم کڑی انجمن پنجاب سے جڑی ہے۔ انجمن پنجاب لاہور میں واقع ایک ثقافتی تنظیم تھی جو اردو ادب میں نئے رجحانات کے فروغ کے لیے کام کر رہی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں یہ تنظیم لاہور میں قائم ہوئی۔ یورپی مستشرق ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کا نام بطور بانی پایا جاتا ہے۔ اس تنظیم کے ذریعے انہوں نے بر صغیر کے علمی اور ادبی شعور کی تجدید کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں اردو ادب تصنع و بناوٹ، مبالغہ آرائی اور روایت پرستی کا گہوارہ بن چکا تھا۔ حقیقی زندگی کے مفاد کے لیے ادب میں کسی طرح کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ انجمن پنجاب نے ان ادبی پابندیوں کو توڑ کر ادباء و عوام میں زندگی کی حقیقتوں پر مبنی ادبی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ لاہور میں محفل مشاعرہ کی جگہ پہلی بار محفل مذاکرہ نے اپنے قدم جمائے۔ شاعری کہنے کے بعد واہ واہ کی صدا کی بجائے اب شاعری کی اہمیت، اس پر تنقید اور عملی زندگی میں اس سے وابستگی کے ذرائع پر بحث ہونے لگی۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) جب ۱۸۷۰ء کی دہائی میں لاہور آئے تو دیکھا کہ یہاں محمد حسین آزادؔ (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء) کی کوششیں یہ ثابت کر رہی تھیں کہ شاعری محض لفظی کھیل نہیں بلکہ زندگی کی حقیقی تصویر اور قوم کے فکری حال کا بیان ہے۔ آزاد کی یہی سعی حالیؔ کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑ گئی۔ انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ سادگی اور حقیقت بیانی بھی شاعری کی مضبوط بنیادیں بن سکتی ہیں۔ یہی تجربات آگے چل کر حالیؔ کی اصلاحی شاعری کی بنیاد بنے۔ حالیؔ کی شہرہ آفاق نظم "مدو جزرِ اسلام" کی فکری جڑیں انہی نشستوں میں پیوست ہیں۔ انہی محفلوں نے انہیں یقین دلایا کہ شاعری قوم کو خوابِ غفلت سے جگا سکتی ہے، اس کی کمزوریوں کو آئینے کی طرح دکھا سکتی ہے اور

اس میں قوم کی اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ انجمنِ پنجاب نے حالیؔ کی سوچ کو وہ وسعت دی جس نے اردو ادب میں اصلاحی اور حقیقت پسندانہ رجحان کو مضبوط کیا اور دیرپا اثرات کے طور پر اس کی بنیاد فراہم کی۔

انجمن پنجاب کے ذریعہ حالیؔ نے اپنے اشعار میں حب وطن اور فطری عناصر کو پہلی مرتبہ جگہ دی۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) اور محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء) کے علاوہ کوئی بڑا نام نہیں ملتا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حالیؔ نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام کل ۴ مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ دہلی واپسی کے بعد بھی حالیؔ کی شاعری میں وہ رنگ و آہنگ نکھرتا چلا گیا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے مدو جزر اسلام، چپ کی داد، مناجات بیوہ اور شکوہ ہند جیسی نظمیں تصنیف کیں۔ انجمن پنجاب کے کل دس مشاعروں میں سے حالیؔ نے جن چار مشاعروں میں ہی شرکت کی تھی انہیں اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل پیش کیا جاتا ہے:

| نظم | تاریخ | موضوع | تعداد |
|---|---|---|---|
| برکھارت | ۳۰ نئی ۱۸۷۴ء | برسات | ۱۴۴ اشعار |
| نشاط امید | ۱۳ اگست ۱۹۷۴ء | امید | ۸۹ بند |
| حب وطن | ۱ ستمبر ۱۹۷۴ء | وطن کی محبت | ۲۰۴ اشعار |
| مناظرہ رحم وانصاف | ۱۴ نومبر ۱۸۷۴ء | رحم اور انصاف کا مناظرہ | ۱۱۱۱ اشعار |

حالیؔ نے ان مشاعروں میں پیش کردہ ہر نظم میں برصغیر کے مسلمانوں کی فکری بیداری کے لئے پیغام دیا ہے۔ مثلا مناظرہ رحم وانصاف نظم میں حالیؔ نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایک انسان کے اندر رحم اور انصاف کا متوازن مقدار میں ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ حالیؔ کہتے ہیں:

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر یہ کی  اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اس کی

رہی باقی نہ فریقین کو جائے انکار  چار ناچار کیا ایک جہتی کا قرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک

مل کے ہو جائیں جیسے کہ دو دریا ایک[xiii]

چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسی لیے حالیؔ کا مقصد صرف لوگوں میں مذہبی رجحان کو فروغ دینا نہیں تھا۔ بلکہ ان کی زندگی کو سنوارنا اور تسکین کی نعمت سے آراستہ کرنا بھی تھا۔ اسلام ہمیں خواتین کی عزت کرنا سکھاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھرانے کی خواتین کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ ایک حدیث مبارکہ مشہور ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ[xiv]

آسان الفاظ میں اس سے یہ مراد ہے کہ ماں کے قدموں کے تحت اولاد کی جنت واقع ہے۔ مفسرین کے قول کے مطابق اگر اولاد اپنی ماں کی خدمت کریں اور اس کی رضا حاصل کر کے وفات پائے تو اس کے لیے جنت میں جانا طے ہے۔ یعنی اس حدیث نے ماؤں یعنی عورتوں کے عزت و وقار کو عالی مقام عطا کیا ہے۔ حالیؔ جس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے وہ دور سماجی و سیاسی انتشار اور توہم پرستی کا تھا۔ اس وقت بہنوں بیٹیوں کی حیثیت گرد و غبار سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ مولانا حالیؔ اپنے کلام کے ذریعے ہندوستان کی عورتوں پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں۔ حالیؔ سے پہلے خواتین کی مشکلات کو موضوع بنا کر شعر و شاعری کرنا اردو ادب میں محال تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے مناجات بیوہ اور چپ کی داد جیسی نظمیں لکھ کر بڑے درد انگیز الفاظ میں ہندوستانی خواتین کی لاچاری کو بیان کیا ہے۔ ان کی مناجات بیوہ اور چپ کی داد نظمیں بالترتیب ۱۸۷۴ء اور ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئیں۔ ایک مقام پر حالیؔ عورتوں کی عزت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے ماؤں بہنو بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں

غمگین دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے[xv]

حتی کہ بیوہ عورتوں کے رنج و غم کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

میں لونڈی تیری دکھیاری دروازے کی تیری بھکاری
بات سے نفرت کام سے وحشت ٹوٹی آس اور بھی طبیعت
دن بھیانک رات ڈراؤنی یوں گزری ساری یہ جوانی[xvi]

انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلم خواتین میں شدید پسماندگی، علمی بحران اور جہالت کا عنصر غالب آچکا تھا۔ دوسری طرف وہ بے جا رسومات، توہمات اور معاشرتی پابندیوں کے بندھن میں مقید ہو چکی تھیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے تعلیم نسواں کو مسلم سماج کی ترقی کے لیے لازمی قرار دیا۔ اور سرسید کی ترغیب سے حالیؔ نے مجالس النساء کے نام سے ایک مؤثر اصلاحی رسالہ شائع کر دیا۔

مجالس النساء کہانی کی صورت میں لکھی گئی حالیؔ کا ایک مشہور اخلاقی اور اصلاحی رسالہ ہے جو دو حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ یہ رسالہ ۱۸۷۴ء میں لاہور سے شائع کیا گیا تھا جس کی بدولت حالیؔ کو چار سو روپے کا انعام ملا۔ مجالس النساء کو مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کی اصلاحی نثری تصنیفوں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جس میں انہوں نے مکالماتی صورت میں خواتین کی تعلیم و تربیت اور ذہنی بیداری کے پہلو پر زور دیا تاکہ ان میں اخلاقی بلندی و پائیداری کی تلقین کی جاسکے۔ اس کی زبان میں نہایت سادگی، سلاست اور روزمرہ کے مکالمات شامل ہیں۔ حالیؔ نے اس کتاب میں شریف گھرانے کے ہندوستانی مسلم و غیر مسلم ہر طبقہ کی عورتوں کی زبان کو یکساں اہمیت دی ہے۔ عورتوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوئی۔۔ اس کتاب کے بارے میں منشی دیانرائن نگم فرماتے ہیں:

اس وقت کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کو یہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے لارڈ ناتھ بروک گورنر جنرل ہند سے سفارش کر کے مولانا حالی کو اس تصنیف کے صلے میں چار سو روپے کا انعام دلایا اور پنجاب میں لڑکیوں کے مدرسوں میں یہ کتاب مدتوں پڑھائی جاتی رہی۔[xvii]

ہندوستان میں جدید تعلیم کی اشاعت و فروغ میں بھی مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) کا نام سر فہرست ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہاں کے مسلمان مغربی جدید اور سائنسی تعلیم پر عبور حاصل نہ کر سکیں تو آگے چل کر انہیں ہندوؤں اور یورپی اقوام سے سخت شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء - ۱۸۱۹۸ء) کا ساتھ دے کر علی گڑھ تحریک کو بھی اشاروں کنایوں میں فروغ دیا۔ خاص طور پر اپنے ادبی کارناموں کے ذریعے جدید طرز تحریر کو سماج میں رواج دیا۔ جدید تعلیم کے معاملے میں سر سید سے وہ بے حد متاثر تھے۔ مزید یہ کہ ان کی فرمائش پر انہوں نے اپنا لازوال کارنامہ مسدس سے حالیؔ تصنیف کی تھی۔ حالیؔ سے پہلے اردو شعر و ادب میں تنقید اور سوانح عمریاں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید اور حیات سعدی جیسی کتابوں کی تصنیف کر کے اردو علوم و فنون میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں نیچرل مضامین کی طرف بے حد توجہ دی۔ انسانیت اور حب وطن جیسے موضوعات سے عوام کو روشناس کرایا۔ اپنے کلام کے ذریعہ انہوں نے نوجوانوں میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا۔ ان کی مثنوی حب وطن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نام ہے کیا اسی کا حب وطن جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے  کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
کیا وطن کی یہی محبت ہے  یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند اس سے خالی نہیں چرند و پرند [xviii]

اگرچہ شاعری کے ابتدائی دور میں حالیؔ نے غزل گوئی کی طرف توجہ مرکوز کی تھی۔ لیکن جیسے جیسے ان میں شعور بیدار ہوتا گیا وہ نظموں کی طرف راغب ہونے لگے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پرانی طرز کی غزلیں صرف ہمارے لیے تفریح طبع کا سامان مہیا کرتی ہے۔ جبکہ جدید شاعری اور اس طرز کی نظمیں ہمیں ایک موضوعاتی پہلو عطا کرتی ہے۔ حالیؔ سے پہلے اردو شعر و ادب خصوصاً غزل کا محور محض حسن و عشق تھا۔ لیکن حالی کے زور قلم سے اس سلف میں

ایک انقلاب برپا ہوا۔ انہوں نے غزل میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر عوام کے دکھ درد، خواتین کی لاچاری، غریبوں کی آہ و پکار، سماج کے فلاح و بہبود کے ذرائع اور اخلاقیات پر قلم اٹھایا۔ مغربی طرز کی تقلید میں آزاد نظم کا رواج کیا۔ اردو ادب جو کہ صدیوں سے ادب برائے ادب کی زنجیر میں بندھا تھا۔ اسے ہماری زندگی میں کارآمد کرانے کے لیے اپنے کلام میں ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جس سے ادب برائے زندگی طرز کو فروغ ملے۔ ڈاکٹر شجاعت علی کے قول کے مطابق:

وہ نیک نیتی کے ساتھ اس نظریہ پر یقین رکھتے تھے کہ اردو شاعری کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے۔ اسے صداقت، خلوص اور سادگی سے قریب تر ہونا چاہئے اور جھوٹ، مبالغہ، غلو، لفظی شعبدہ بازی اور تصنع و تکلف سے دور ہونا چاہیے ۔ غرض اس کا تعلق انسانی زندگی سے قریب اور مستحکم ہونا چاہئے۔[xix]

حالیؔ کے دل میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ انہوں نے مختلف جگہوں میں خاتم النبیین کے لئے نعت گوئی کی۔ مسدس حالی میں لکھی گئی ان کی نعت سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا[xx]

صرف شاعری کے میدان میں ہی نہیں حالیؔ کے نثری کارناموں نے بھی اردو ادب میں جدت طرازی کی ہیت کو فروغ دیا۔ تریاق مسموم، مجالس النساء، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید، مقالات حالی، عربی کا رسالہ مولود شریف، تاریخ محمودی پر منصفانہ رائے، شواہد الالھام، تذکرہ رحمانیہ، طبقات الارض، اصول فارسی، مضامین حالی، مکتوبات حالی اور مکاتیب حالی وغیرہ کتابوں کا شمار حالیؔ کے نثری کارناموں میں ہوتا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں انہوں نے شاعری کے اصولوں اور ضوابط پر بحث کی ہے۔ چاہے نثر ہو یا نظم حالیؔ

کو زبان دانی پر مہارت حاصل تھی۔ مہاتما گاندھی خود حالیؔ کے انداز بیان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

اگر ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایک ہی زبان کا درجہ دیا جائے تو وہ زبان حالی کی مناجات بیوہ کی زبان ہو گی۔[xxi]

حالیؔ تشدد کے حامی نہیں تھے۔ بلکہ انکے نزدیک تمام مذاہب امن کا درس دیتی ہیں۔ خاص طور پر ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہمیں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے عزت سے پیش آنے کا حکم دیا۔ حالیؔ بھی تمام مذاہب کے درمیان ایک دوستانہ تعلق کے قائل تھے۔ جس کے اشارے ان کے خطوط میں بھی ملتے ہیں۔ حالیؔ نے ایک دفعہ رسالہ 'العصر' (لکھنؤ) کے ایڈیٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کو مخاطب کرتے ہوئے ۱۸ جون ۱۹۱۳ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں وہ کہتے ہیں:

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ شاید کوئی اس بات کا آرزو مند نہ ہو گا کہ ہندوستان کے ہندو و مسلمان اور مسیحی سب ایک دوسرے کے ایسے دوست ہوں جیسے ایک سگا بھائی دوسرے سگے بھائی کا دوست ہوتا ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسی حالت ایک صدی سے دور ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکتی۔[xxii]

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں امت مسلمہ کی فکری بیداری میں جن ادیبوں نے سرگرم کردار ادا کیا تھا ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) امتیازی شہرت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم و نثر سے ادب برائے زندگی طرز کو فروغ دیا۔ مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر شاعری کے اصول اور ضابطے بنائے اور ساتھ ہی اردو تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ سر سید، غالب اور سعدی پر سوانح حیات لکھ کر اردو نثری ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جدید شاعری لکھ کر نیچرل مضامین کو اردو میں متعارف کرایا۔ مسدس حالی کے ذریعے اسلام کے عروج و زوال کی داستان پیش کی۔ اپنے کلام کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ ہندوستان کی خواتین کی زندگی کی مشکلوں کو ہمارے سامنے اجاگر کیا۔ انسانیت کے موضوع پر لکھنے لگے۔ اردو غزلوں کی روایتی حسن و عشق کو ترک کر کے موضوعاتی نظموں کو فروغ دیا۔ اور ناصحانہ مضامین لکھ کر ہندوستان کے نوجوانوں کو نئی امید کی کرن دکھائی۔ اور یوں ان کی عمر بھر کی کوششوں نے

لاکھوں ہندوستانیوں کو بیدار کر دیا۔ اور اس شعوری بیداری نے آگے چل کر ہندوستان کو انگریزوں کے دامنِ قید سے آزاد کرایا۔ لیکن مسلمانوں میں جس قدر اخلاقی عروج کی ضرورت تھی وہ آج بھی ناپید ہے۔ اسی لیے حالیؔ افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے![xxiii]

---

## حوالہ جات:


[i] الطاف حسین حالی، مضمون زمانہ، مضامین حالی، ادارہ ادبیات اردو، پنجاب، بھارت، سنہ ۱۸۱۸ء، ص ۱۳

[ii] رام بابو سکسینہ، تاریخ اردو ادب، منشی نول کی شور پریس، لکھنؤ، بھارت، سنہ ۱۹۲۹ء، ص ۴۰۵

[iii] رام بابو سکسینہ، تذکرہ بالا، ص ۴۰۴

[iv] مولوی عبد الحق، چند ہم عصر، انجمن ترقی اردو، پاکستان، سنہ ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۱

[v] ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی نعتیہ شاعری، حلقۂ نیاز و نگار، کراچی، پاکستان، ۱۹۷۴، ص ۱۳

[vi] خواجہ الطاف حسین حالی، مقالات حالی (حصہ اول)، جمال پرنٹنگ پریس، نئی دہلی، بھارت، سنہ ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۴

[vii] خواجہ الطاف حسین حالی، مدسس حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، بھارت، سنہ ۱۹۹۵، ص ۳۰

[viii] پروفیسر نظیر صدیقی، علم بلاغت اور علم عروض، پاک کتاب گھر، ڈھاکہ، بنگلہ دیش، ۱۹۶۴، ص ۵۰

[ix] الطاف حسین حالی، مدسس حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ ص ۷

[x] خواجہ الطاف حسین حالی، شکوہ ہند، مطبع روز بازار، امرتسر، بھارت، سنہ ۱۹۸۸، ص ۳

[xi] خواجہ الطاف حسین حالی، مدسس حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، بھارت، سنہ ۱۹۹۵، ص ۱۴

[xii] HaaliMusaddas/ wikipedia.org. ur

[xiii] خواجہ الطاف حسین حالی، مجموعہ نظم حالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس،، علی گڑھ، بھارت، سنہ ۱۹۹۸، ص ۶۸

[xiv] مسند الشهاب القضاعي ط مؤسسة الرسالة - بيروت: ۱/ ۱۰۲ (رقم الحديث: ۱۱۹

[xv] خواجہ الطاف حسین حالی، چپ کی داد، حالی بک ڈپو، پانی پت، ڈھاکہ، سنہ ۱۹۳۷، ص ۲

[xvi] خواجہ الطاف حسین حالی، مناجات بیوہ، مثنویات حالی، ناشر: شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور، پاکستان ۱۹۶۶ء ص ۱۵۸

[xvii] خواجہ الطاف حسین حالی، مجالس النساء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، سنہ ۲۰۱۲ء، ص ۶

[xviii] خواجہ الطاف حسین حالی، مثنویات حالی، ناشر: شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور، پاکستان، ۱۹۶۶، ص ۱۲۴

[xix] ڈاکٹر شجاعت علی، حالی بحیثیت شاعر، ادارہ فروغ ادب، لکھنو، بھارت، ۱۹۷۱ء ص ۱۵۸

[xx] خواجہ الطاف حسین حالی، مدسس حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، لاہور، سنہ ۱۹۹۵، ص ۹۵

[xxi] ڈاکٹر محمد عبداللہ، مسلم جاگرنے کیک جن کوی ساہتیک (اسلامی بیداری میں متعدد ادباء و شعراء)، اسلامک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۰، ڈھاکہ، بنگلہ دیش، ص ۱۲۲

[xxii] خواجہ الطاف حسین حالی، مکاتیب حالی، آل انڈیا اردو مرکز، لکھنؤ، بھارت، ۱۹۵۰، ص ۱۱۰

[xxiii] خواجہ الطاف حسین حالی، مدسس حالی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، لاہور، سنہ ۱۹۹۵، ص ۱۳

***

# خانقاہ شیخو شریف کی ادبی خدمات کا جائزہ

Muhammad Riaz ul Qadri
MPhil Urdu Scholar, Riphah International University, Faisalabad, Pakistan
Dr Shabbir Ahmad Qadri
Associate Professor, Riphah International University, Faisalabad, Pakistan

Abstract
Khanqah Sheikhu Sharif, Okara, Pakistan stands as one of the most influential spiritual and intellectual centers of the region, distinguished for its enduring contribution to religious scholarship, cultural refinement, and literary advancement. Rooted in a centuries-old Sufi tradition, the Khanqah cultivated an environment where ethical training, spiritual discipline, and knowledge transmission flourished simultaneously. This article examines the historical significance of the Khanqah and highlights its vital role in shaping the literary and cultural landscape of the area. including poetry, Special emphasis is placed on its rich literary heritage produced by devotional writings, historical narratives, and spiritual discourses the scholars and Sufi figures associated with the institution. Through an analytical study, the paper demonstrates how Khanqah Sheikhusharif evolved into a distinctive literary school that integrated spirituality with intellectual creativity, leaving a lasting impact on the literary traditions of the subcontinent. The findings suggest that the Khanqah's multifaceted contributions warrant deeper academic attention and recognition within contemporary literary scholarship.

**Keywords**:
Khanqah, Sheikhu Sharif, Literary Services, Saut-e-Hadi Analysis,

خانقاہِ شیخو شریف برصغیر کی روحانی و علمی تاریخ میں ایک ایسا روشن سنگِ میل ہے جس نے صدیوں پر محیط عرصے میں علم، تہذیب اور روحانی الہام کے دریچوں کو وا رکھا۔ یہ خانقاہ ایک روحانی مرکز اور ایک ایسا ادارہ ہے جہاں رشد و ہدایت کے ساتھ فکری تربیت اور علمی آراستگی کی روایت پروان چڑھی۔ یہاں کے مشائخ نے اپنے اخلاق، تقویٰ، اور تدریسی مزاج سے اس خطّے میں دینی و علمی شعور کو بیدار کیا اور اسے نئی وسعتیں عطا کیں۔ شیخو شریف کی

خانقاہی روایت میں ضبطِ نفس، خدمتِ خلق اور علم دوستی وہ عناصر ہیں جنہوں نے اسے دیگر روحانی مراکز سے ممتاز مقام بخشا۔ شیخو شریف کی ادبی روایت اپنی گہرائی، فکری بالیدگی اور تخلیقی تنوع کے سبب ایک مستقل دبستان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں کے مشائخ اور اہلِ قلم نے نعت، منقبت، قصیدہ، تصوف، تاریخ اور نثری ادب میں ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کیں جنھوں نے مقامی اور علاقائی ادب کو نئی سمت دی ہے۔ خانقاہ کے مکتوبات، خطبات، تحقیقی رسائل اور شخصی سوانح اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ یہاں ادب کو اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ روحانی تربیت، اخلاقی استحکام اور فکری ارتقا کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیخو شریف کا ادبی سرمایہ اپنی انفرادیت اور فکری وقعت کے باعث آج بھی محققین، ادبا اور اہلِ ذوق کے لیے ایک معتبر حوالہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اصغر علی بلوچ لکھتے ہیں:

> ''شیخو شریف کی سرزمین نے مراتب اختر اور ناصر شہزاد جیسے شاعروں کو جنم دیا ہے اور روحانی و متصوفانہ روایات کو مستحکم کیا ہے۔ لہلہاتے کھیتوں میں جو خوشبو سب سے زیادہ متاثر کن ہے وہ شیخو شریف کے مزارات پر عود و عنبر اور دیسی گھی کے جلتے چراغوں کی خوشبو ہے جس میں ادب و تصوف کا خوبصورت امتزاج ہے اور ایک عجیب روح پرور سرشاری پائی جاتی ہے۔''(۱)

اس خانوادے کی چند نامور ہستیاں جنہوں نے شعر و ادب کی خدمت میں گراں قدر حصہ لیا، درج ذیل ہیں:

## حضرت شیخ محمد غوث گیلانی (پ:۱۴۰۱ء، م:۱۵۱۷ء)

محمد غوث گیلانی سادات شیخو شریف کے جد امجد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ علم و عرفان کے ساتھ اپنے بلند شعری ذوق کے لیے بھی معروف تھے۔ ان کی دو فارسی تصانیف ''مفتاح الاخلاص'' اور ''دیوان قادری'' ان کے ادبی ذوق اور تخلیقی مہارت کی عکاس ہیں۔ ''مفتاح الاخلاص'' عربی تصنیف ''خلاصۃ المفاخر'' کا منظوم فارسی ترجمہ ہے، جبکہ ''دیوان قادی'' ان کی غزلیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ ان کی شعری عظمت کا اندازہ اس بات سے

لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا عبد الرحمٰن جامی جیسی شخصیت انھیں اپنے تصنیف کردہ اشعار بھیجتے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اپنی تصنیف ''اخبار الاخیار فی احوال الابرار'' میں ان کے شعری ذوق کے بارے یوں رقمطراز ہیں:

> ''آپ کو شعر گوئی سے بھی رابطہ تھا۔ حضرت غوث اعظم کی شان میں اکثر نظمیں لکھی ہیں آپ کا ایک دیوان بھی ہے۔ قادری تخلص کرتے تھے صاف و سلیس زبان میں ترجیع بند بھی کہے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامی آپ کی برتری شعر گوئی کی وجہ سے آپ کی خدمت میں اشعار روانہ کیا کرتے تھے''(۲)

''دیوانِ قادری'' جو علمی اور روحانی ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے، ۲۰۲۱ء میں منگانی شریف ضلع جھنگ سے پیر طاہر حسین قادری کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ اس تصنیف کی تصحیحِ متن کی ذمہ داری ڈاکٹر سائرہ خانم نے بڑی دقت نظر اور تحقیقی مہارت سے انجام دی ہے جبکہ اردو ترجمہ اویس عبد اللہ منگانوی نے اپنے ادبی ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ترتیب و تدوین، مقدمہ نویسی، اور ضمیمہ جات کی تیاری کے فرائض پیر طاہر حسین قادری نے نہایت اہتمام اور علمی سلیقے سے انجام دیے ہیں۔ یہ دیوان اردو ادب اور صوفیانہ روایت میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے اور قارئین کے لیے فکر و ادب کا بیش بہا خزینہ فراہم کرتا ہے۔ ''دیوان قادری'' میں شامل ایک غزل ملاحظہ کریں۔

دیدہ از دیدن دیدار تو نوری دارد
چشم مخمور تو از بادہ غروری دارد
گر شود جان بہ خیال تو زخود محو چہ باک
دل آشفتہ ازان وجد حضوری دارد
دولت شادی تو از غم عشقم گفتی
آری آری غم عشق تو سروری دارد
ناصح از عشقتم اگر منع کند عیبی نیست
ظاہر آن است کہ در دیدہ قصوری دارد

همہ را روی بہ تست از همہ رو دید ستم
آفتاب رخت از ذرہ ظہوری دارد
چند گویی سخن از وعدہ فردا صوفی
نقد امروز دل از وعدہ نقوری دارد
بسر کوی ملامت دل و جان باخت بہ عشق
قادری کی ھوس جنت و حوری دارد
(۳)

سید مجتبیٰ گیلانی المعروف الشیخ فضلیؒ (پ:۱۶۵۷ء،م:۱۷۱۲ء)

حضرت سید مجتبیٰ گیلانی فضلیؒ سلسلۂ گیلانیہ کے ان جلیل القدر اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے اپنے علم و عرفان، زہد و ورع اور فیضانِ طریقت سے برصغیر کی روحانی فضا کو منور کیا۔ ان کی ولادت ۱۰۶۸ھ بمطابق ۱۶۵۸ء میں ایک ایسے خانوادۂ مجددین و مشائخ میں ہوئی جو قرونِ متقدمین سے سلسلۂ قادریہ و گیلانیہ کی روحانی امانت کا امین چلا آرہا تھا۔ انھوں نے طفولیت ہی سے علومِ شریعت و طریقت میں شغف رکھا اور اپنے وقت کے اجلّہ مشائخ و علماء سے کسبِ فیض کیا۔ ان کی حیاتِ طیبہ علم و عرفان، تواضع و انکسار اور تزکیۂ نفس کا حسین مرقع تھی۔ وہ محض سجادہ نشین نہ تھے بلکہ اہلِ علم و قلم میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کی ذات میں صوفی و عالم، محقق و شاعر، اور مربی و معلم کے اوصاف یکجا تھے۔ ان کا کلام عارفانہ ذوق، دقیق فکری رموز اور روحانی تجربے کی آمیزش سے مزین ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف کے اسرار و معانی پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ حضرت فضلیؒ کے مزاج میں ایک خاص توازنِ علم و حال نمایاں تھا۔ ان کے اقوال و اشعار میں عرفانِ ذات اور قربِ حق کے اثرات جابجا محسوس ہوتے ہیں۔ یہی جامعیت انھیں محققینِ تصوف کے ہاں ممتاز کرتی ہے۔ ان کا وصال "شجرۃ الانوار" کے مطابق لاہور میں ۱۱۲۳ھ بمطابق ۱۷۱۲ء کو ہوا۔ تدفین داتا شاہ چراغ لاہوری کے روضہ کے باہر غربی دیوار کے ساتھ ان کے والد سید مصطفیٰ گیلانی کی مرقد کے پہلو میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلسلۂ گیلانیہ علمی و روحانی اعتبار سے اپنے عروج پر تھا اور ان کی ذات اس تسلسل کی درخشندہ کڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھوں نے نہ صرف اپنے خانوادے کی روحانی میراث کو

محفوظ کیا بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی شامل کیں۔ سید مجتبیٰ فضلی گیلانیؒ کی علمی و عرفانی یادگار ''عین التصوف'' تصوف کی تاریخ میں ایک گراں قدر اور نادر تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ محض ایک تذکرہ نہیں بلکہ تصوف و سلوک، تاریخ و سوانح، اور عرفان و تحقیق کے سنگم سے تشکیل پانے والی ایک ہمہ جہت دستاویز ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے خانوادۂ گیلانیہ کی پہلی اندرونی تحریر ہے جس میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد، شیوخ، ہم مشرب احباب اور ہم عصر صوفیہ کے حالات نہایت سادہ، مگر عالمانہ و محققانہ انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

پہلا حصہ تصوف کے اصولی و نظری مباحث پر مشتمل ہے، جہاں مصنف نے سلوک و معرفت، تزکیۂ باطن، ذکر و مراقبہ، طہارتِ قلب، اور منازلِ عرفان جیسے دقیق موضوعات کو نہایت جامع اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسرا حصہ ایک تذکرہ نما مجموعہ ہے جس میں مصنف نے اپنے مشائخ و مشاہیر خاندان کے حالات، ہم عصر اولیاء و علما کے احوال، اور اپنے روحانی مشاہدات کو محفوظ کیا ہے۔ اسی حصے میں ان کی آٹھ عرفانی غزلیات اور حضرت سید محمد غوث بالا پیرؒ کے مناقب بھی شامل ہیں، جو کتاب کے روحانی و ادبی حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

یہ نادر مخطوطہ ایک طویل عرصے تک گوشۂ گمنامی میں رہا، یہاں تک کہ اسے پیر محمد طاہر حسین قادری حنفی (منگانی شریف، ضلع جھنگ) نے دریافت کیا۔ چونکہ حضرت سید مجتبیٰ فضلی گیلانیؒ ان کے مشائخ میں شمار ہوتے تھے، اس لیے پیر صاحب نے اس مخطوطے کی تحقیق و تدوین کو اپنی روحانی ذمہ داری سمجھا۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی اور علمی دیانت کے ساتھ متن کی ترتیب و تصحیح، مقدمہ نویسی، تعلیقات و حواشی پر کام کیا، اور اس کے علمی پس منظر کو واضح کیا۔ مزید برآں، اس کی اردو ترجمے کا اہتمام کیا گیا جسے کوثر عباس علوی اور اویس عبداللہ منگانوی نے بڑی احتیاط، وفاداری اور فکری باریکی کے ساتھ مکمل کیا۔

ان تمام مساعی کے نتیجے میں ''عین التصوف'' پہلی بار جون ۲۰۱۷ء (۱۴۳۸ھ) میں خانقاہِ منگانی شریف (جھنگ) سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس اشاعت نے نہ صرف ایک تاریخی متروک سرمایہ کا از سرِ نو احیاء کیا بلکہ صوفیانہ ادب کے سرمایہ میں ایک مستند اضافہ بھی کیا۔

پیر طاہر حسین قادری کی علمی بصیرت اور تدوینی محنت کے باعث یہ کتاب آج تاریخِ تصوفِ پنجاب کے معتبر مراجع میں شامل ہوگئی ہے۔ انھوں نے متن کی صحت، اصطلاحات کی تشریح، اور خانوادۂ گیلانیہ کے تاریخی تسلسل کو

نہایت تحقیق و توازن کے ساتھ مرتب کیا۔ عین التصوف" محض ایک تصنیف نہیں، بلکہ سلسلۂ گیلانیہ کی روحانی خودنوشت ہے۔ یہ کتاب اس خانوادے کی علمی و باطنی زندگی، فکری ارتقاء اور صوفیانہ روایت کا آئینہ دار ہے۔ مصنف چونکہ خود اس روحانی نظام کے رکن تھے، اس لیے ان کا بیان ایک شہادتِ باطنی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں روایت و تجربہ، مشاہدہ و استناد اور علم و عرفان کی مثلث یکجا ہے۔

''عین التصوف''میں موجود سید مجتبیٰ گیلانی فضلیؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

چو عینک میشود کثرت بہ پیشِ چشمِ نظاراں
نمائد اندر وحدت سراسر جلوہ ای یاراں
چناں نسبت کند پیدا زراہ عشق ھر عاشق
کہ خود معشوق میکرد بنزد فھم عیاراں
چو از شرب صبوحی چشم را گلگو نہ میسازد
ذبیح اللہ میکردند بہ بیش جملہ خونخواراں
زتعبیر حقیقت جملگی لال اند برحق اندً
نفھمد فھم ھر قاصر معما را از اشواراں
محبت را سزاوار است کہ بیحد آفرین گوئم
بمن نمود محبوبی بوجہی رسم غمخواراں
توئی معشوق تو عاشق توئی مطلوب تو طالب
ز فضلیؔ بشنو ایں نکتہ اگر ھستی ز دلداراں

(۴)

سید امام حیدر بخش گیلانی (پ:۱۶۸۸ء، م:۱۷۶۲ء)

سید حیدر بخش، جن کا تخلص حیدر اور حیدر شاہ تھا، علم و ادب اور شعری ذوق کی نمایاں شخصیت تھے، جنہیں حیدر امام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کا ذوق انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا تھا، اور

وہ صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاہم، لاہور میں سکھا شاہی کے دوران میں یہ علمی ورثہ تباہ ہو گیا۔ سکھ حکمرانوں نے انھیں اپنے درباری امرا میں شامل کرنے کی کوشش کی، تاکہ مسلمانوں کو حکومت سے تعاون پر راضی کیا جاسکے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی اور لاہور کے تاریخی و مذہبی مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ مقبرہ داتا شاہ چراغ اور اس سے متصل شاہجہانی فن تعمیر کے نادر آرائشی پتھر اور قیمتی نوادرات اکھاڑ لیے گئے۔ ان مظالم کے دوران میں سید حیدر بخش کا نادر دیوان بھی ضائع ہو گیا، جو علمی و ادبی اعتبار سے ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ حضرات گیلانیہ کے معروف مؤرخ سید علی اصغر گیلانی نے ''شجرۃ الانوار'' میں اس دیوان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''سید حیدر بخش شاہ المشہور حیدر شاہ فقیری بودندہ بوس ودیوان در نظم دارند بعہد تسلط سکھان بر لاہور۔'' (۵)

''فقر نامہ'' ان کی مشہور تصنیف تصوف کے دقیق و عمیق مباحث پر مشتمل ایک منظوم سی حرفی ہے، جس میں پیچیدہ روحانی مسائل کو شائستگی اور سادگی کے ساتھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ مبتدی سالکین کے لیے فقر کی منازل طے کرنا نہایت سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے اشعار سلسلہ قادریہ شیخو شریف کے اوراد وظائف میں شامل ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

الف۔ اللہ کو ایک کر مانو
ب۔ ترک سبھی سے کریے
ث۔ ثابت کر پاؤں دھریے
ج۔ جلال اسی سے ڈریے
ح۔ حرام کی ڈھونڈ نہ کریے
خ۔ خالی مت یاد سے ہو
د۔ دنیا کو دل سے دھو
ذ۔ ذکر کر اسی کا نت

ر۔ ریا کی نہ کر چت

ز۔ زاری بن بات نہ کریئے

س۔ سراسر عجز موں رہیے

ش۔ شر مت جی پہ ٹھانو

ص۔ صبر کا راہ پہچانو

ض۔ ضمیر پہ شان نہ دھریے

ط۔ طالب بن مان نہ کریئے

ظ۔ ظلم سے بہتا بھاگو

ع۔ عالی درجات کر تیاگو

غ۔ غرور مت عمر پہ کر

ف۔ فنا کو آگے دھر

ق۔ قلب جب کیا پاک

ک۔ کل تب دیکھی خاک

ل۔ لاہوت تبھی پہچانو

م۔۔ ملکوت جب انکاجانو

ن۔ ناسوت سبھی بھلاوے

و۔ وصل تب انکا پاوے

ہ۔ ہادی بن نا ہیں بات

ء۔ ان بن کچھ نہ آوے ہات

ی۔ یقین تو مت کر اور

بن ہادی کے ناہیں ٹھور

حیدر کہی ہے اتنی بات
کسو کسو پائی ان کی گھات

(۶)

سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں (پ:۱۷۱۹ء،م:۱۷۸۰ء)

برصغیر کی علمی و روحانی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی جلوہ گر ہوتی ہیں جن کے کردار کی خوشبو اور قلم کی روشنی صدیوں کے فاصلے پر بھی محسوس کی جاتی ہے۔ سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں انہی درخشندہ شخصیات میں سے تھے۔ ان کا زہد، ان کی بینش، ان کی زبان و قلم سے صادر ہونے والے خیالات اور ان کے فیضِ صحبت سے اُبھرنے والے روشن دل سب مل کر ایک ایسی شخصیت کا نقشہ بناتے ہیں جو اپنے عہد ہی نہیں، آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغِ راہ ثابت ہوئی۔ وہ مردِ حق جن کی محفل درسگاہ اور سکوت تفسیرِ حیات ہوا کرتا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھنے کے بعد علم و حکمت کی ایک کہکشاں پھیلتی، اور ان کی گفتگو سننے والا خود کو نئے معنوں کی دنیا میں داخل پاتا۔ ان کے الفاظ میں تاثیر اور جملوں میں حرارتِ ایمان ایسی تھی کہ دلوں کے بند روشن دریچوں میں بدل جاتے۔ وہ قادرالکلام شاعر بھی تھے اور علومِ دینیہ کے ایسے ماہر کہ تفسیر، فقہ اور حدیث کے دقیق مباحث بھی ان کے سامنے گویا کھل کر گفتگو کرتے۔ عربی و فارسی پر ایسی قدرت رکھتے تھے کہ اظہار میں لطافت اور استدلال میں پختگی ان کی تحریر کا امتیاز بن جاتی تھی۔ حسنین سائیں نے محض ملفوظات ہی نہیں چھوڑے، بلکہ ایک قابلِ قدر قلمی ذخیرہ بھی اپنے پیچھے یادگار چھوڑا مگر افسوس کہ ان کا یہ علمی سرمایہ وقت کی گرد اور حالات کی بے دردی میں بکھر گیا۔ اولاد اور عقیدت مندوں نے اسے تبرک جان کر تقسیم تو کر لیا، مگر چراغ کو صراحی میں رکھ دینے کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی ان کی تصانیف کا ہوا۔ روشنی دب گئی، فائدہ محدود ہو گیا، اور ورق ورق بکھر کر اجنبی ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے بارے ان کے سوانح نگار سید افضال حسین گیلانی یوں لکھتے ہیں:

> ''آپ نے خاصہ قلمی اور کتابی ذخیرہ اولاد و عقیدت مندوں کیلئے چھوڑا ہے۔ اور ان میں ''سی حرفی'' اور ''جدی کرسی'' کو زیادہ شہرت بھی حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ذخیرہ ان ہاتھوں میں ہے جن میں نہ تو خود فائدہ حاصل کرنے کی

صلاحیت ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو دینے کی سکت ہے۔چند دریدہ، خستہ اور
بھر بھرے اوراق احقر کو تبرکاً اپنے ماموں حاجی سید حسن سے ملے تھے، جن کے
بارے میں ان کا کہنا تھا کہ برخوار دار! مجھے تو یہی کچھ اوراق حسنین سائیں کی
کتابوں کے اپنے بھائیوں سے تقسیم وراثت کے طور پر تبرکاً ملے۔"(۷)

''یہ ذخیرہ ایسے ہاتھوں میں ہے جن میں نہ خود استفادے کی صلاحیت ہے، نہ کسی اور کو دینے کی سکت۔ "یہ فقرہ صرف ان کے قلمی آثار کی بے قدری نہیں بتاتا بلکہ ہمارے معاشرتی رویے کی بھی گہری تصویر پیش کرتا ہے کہ علم کو وراثت سمجھ کر تقسیم تو کر دیا جاتا ہے مگر اس کے تحفظ کی ذمہ داری نہیں نبھائی جاتی۔ حسنین سائیں کے وہ ملفوظات جو تحریری یا زبانی روایت کے ذریعے محفوظ رہے، ان کے علمی ذوق کی رفعت اور روحانی تجربے کی گہرائی کا آئینہ ہیں۔ ان کے جملوں میں نزاکت بھی تھی اور حکمت بھی، اور ان کے خیالات میں وہ صفائے باطن تھا جو محض الفاظ نہیں، سلوک کے چراغ ہوتے ہیں۔ یہ ملفوظات آج بھی بتاتے ہیں کہ ان کی نظر میں دین اصولوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سیرت کا اسلوب ہے، اور علم محض مطالعے کا حاصل نہیں، بصیرت کی بیداری ہے۔ حسنین سائیں صرف عالمِ با عمل اور شاعرِ ذی وقار ہی نہیں تھے، وہ صاحبِ غیرت مجاہد بھی تھے۔ سکھوں کے خلاف جہاد میں انھوں نے نہ صرف عملی حصہ لیا بلکہ اس راہ میں اپنی پوری جائیداد تک چھوڑ دی یہ وہ جذبہ ہے جو مردانِ حق کے خمیر میں شامل ہوتا ہے۔ اسی روح کے ساتھ انھوں نے خانقاہِ شیخو شریف کی بنیاد رکھی، جس نے بعد ازاں علمی و روحانی حیات میں ایک مستقل مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کو بدلتے حالات میں پھر سے تازہ کیا، اور علاقے کے عوام کو اسلامی اصولوں، اخلاق اور تربیت سے آگاہ کیا۔ وہ فرنگی محل لکھنؤ کے تربیت یافتہ تھے، اور بانی درسِ نظامی مولوی نظام الدین جیسے جلیل القدر استاد کے فیض یافتہ شاگرد۔ یہی نسبت ان کی علمی گہرائی، فقہی بصیرت اور متانتِ فکر کی بنیاد بنی۔ حسنین سائیں کی شاعری میں صوفیانہ لطافت بھی ہے اور فکری وقار بھی۔ ان کی نظموں اور اشعار میں کشفِ ذات کا سفر بھی دکھائی دیتا ہے اور عرفانِ الٰہی کی جستجو بھی۔ ان کے اشعار میں فارسی کے رنگ بھی ہیں اور عربی کی صلابت بھی، مگر اس امتزاج میں طبیعت کی روانی اور معنی کی صفائی برقرار رہتی ہے۔

نمونہ کلام پیش خدمت ہے:

حمد

حمد گوئم بے قیاس از جان و دل
آنکہ پیدا کرد آدم راز گل
خلقت ہژدہ ہزار عالم نمود
از عدم نجشید تشریف وجود
(۸)

نعت

اشرف انساں محمد احمد است
ہر دو عالم مست جام از او شد است
رحمت اللعالمین فرمود ، حق
بر سر آدم ازاں دارد سبق
(۹)

ان کے فارسی کلام سے شجرے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایکہ از فیض قدم مکنون اسرار آمدی
باچناں اسمائی حسنٰی خود باظہار آمدی
نقطۂ احمد شدی از تو حسین غائت ظہور
در محیط فیض عالم ختم پرکار آمدی
بہر حل عقیدہ معنی ز سر جوش کرم
صورت مشکل کشا مولائی مختار آمدی
از پئے ہر تشنہ لب خود ساقی کوثر حسین
خاص از جام شہادت مست سرشار آمدی

(۱۰)

سی حرفی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ان میں اس وقت کی اردو جو اس خطے میں بولی جاتی تھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

الف۔ اللہ حسنین کا شاہ حیدر پیر
ب۔ بتائی انکو راہ طریق
سید مجتبی شاہ صاحب تحقیق
پ۔ پکڑ نام شاہ محمود
دین و دنیا کہ ان سے ہے مقصود
ت۔ تونگر مصطفیٰ سید پیر
ہادی و مرشد ہیں دستگیر

(۱۱)

سید محمد حسین گیلانی (پ:۱۳۱۵ھ،م:۱۳۷۸ھ)

سید محمد حسین گیلانی مسلم لیگ اور قائداعظم کی ٹیم کے ایک خاموش مگر انتہائی مؤثر مجاہد تھے اور تحریکِ پاکستان کے فکری و تنظیمی محاذ پر بھی ان کی خدمات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری میں جس اخلاص سے عملی کردار ادا کیا وہ ان کی سماجی بصیرت اور ملی احساس کی روشن دلیل ہے۔ تاہم ان کی اصل پہچان اُن کی ادبی، علمی اور اشاعتی خدمات ہیں، جنھوں نے تاریخِ ادب میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔ وہ ''ادارہ صوتِ ہادی شیخوشریف'' کے بانی تھے، ایک ایسا ادارہ جس نے ان کے بعد بھی اردو ادب کو مسلسل نثر اور شاعری کی قیمتی کتب سے مالامال کیا۔ ان کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا ماہنامہ ''الہادی'' محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک ایسا ادبی و فکری مجلہ تھا جس نے اپنے دور میں علمی، تہذیبی اور دینی مباحث کو وقار، ترتیب اور دلیل کے ساتھ پیش کیا۔ ماہ نامہ ''الہادی'' کے مستقل لکھنے والوں میں ایسے اصحابِ قلم شامل تھے جن کی علمی جہت اور فکری تربیت براہِ راست سید محمد حسین گیلانی سے وابستہ تھی۔ مولانا محمد بخش مسلم بی۔اے کے مضامین دینی علوم،

فقہی مباحث اور ملی مسائل کے حوالے سے ''الہادی'' کا فکری ستون تھے۔ وہ سید محمد حسین گیلانی کے قریبی رفیق اور مشیر تھے، اور ان کی تحریری جہتوں میں گیلانی صاحب کے ذوقِ تحقیق کی جھلک نمایاں رہتی تھی۔ صاحبزادہ پیر فیض الحسن آلومہاروی کے مضامین تصوف، اخلاقیات اور اصلاحِ باطن کے موضوعات پر رسالے کا روحانی رنگ متعین کرتے تھے۔ وہ فکری طور پر سید محمد حسین گیلانی کے نہایت قریب تھے اور خانقاہی روایت کی علمی ترجمانی میں ان کے ہم آواز سمجھے جاتے تھے۔ ابو الفیض منشی علم الدین کے مضامین اوخود سید محمد حسین گیلانی کے اپنے مضامین، ان کے اداریے، تحقیقی نکات، تربیت پر مبنی تحریریں اور عصری مسائل پر مباحث ''الہادی'' کی فکری سمت اور ادبی وقار کا اصل معیار تھے۔ ان کی نثر واضح، متین، تحقیقی اور تربیتی شان کی حامل تھی۔ انھوں نے علمی مکالمے کو سنجیدگی، وقار اور استدلال کے ساتھ نئی سمت عطا کی۔ سید محمد حسین گیلانی کی ادبی خدمات کا محور ''الہادی'' اور بعد ازاں ''ادارہ صوتِ ہادی'' ہے۔ یہ وہ پلیٹ فارم ہے جس نے اردو نثر، مذہبی ادب، تحقیقی روایت اور خانقاہی فکری میراث کو نئی زندگی عطا کی۔ ان کی محنت نے اپنے دور کو بھی متاثر کیا اور آنے والی نسلوں کو بھی ایک مضبوط ادبی سرمایہ فراہم کیا۔

سید مراتب اختر گیلانی (پ:۱۹۳۹ء، م:۱۹۸۸ء)

سید مراتب اختر دبستان شیخوشریف کے وہ ستارے ہیں جنھوں نے کم عمری سے شعر کہنا شروع کیا اور ایک عرصے تک لاہور کے ادبی منظر نامے پر اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ سجاد باقر رضوی نے اردو ادب میں تخلیقی تحریکات کو فروغ دینے کے لیے ''ینگ رائٹرز'' کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی جس کے ذریعے نوجوان ادیبوں کے لیے ایک تربیتی پلیٹ فارم مہیا کیا گیا۔ سجاد باقر رضوی کی قیادت میں یہ سوسائٹی ادبی رجحانات کے فروغ کا مرکز بنی، جبکہ مراتب اختر اس انجمن کے سب سے روشن ستارے تھے۔ مراتب اختر کی شاعری جدید غزل میں ایک اہم مقام رکھتی ہے، جہاں انھوں نے روایت اور عصری تقاضوں کو ہم آہنگ کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ان کی شاعری اور خصوصاً غزل کے بارے لکھتے ہیں:

> ''مراتب اختر زمانہ طالب علمی میں ہی بہت پختہ گو شاعر تھے۔ وہ مصرعِ تر کے شاعر نہیں تھے۔ لیکن شعر میں اس قدر پختگی، ابلاغ اور کشش تھی کہ سننے والا داد دیئے بغیر نہیں رہتا تھا، مراتب اختر جس طرح خود زندگی سے لبریز تھے ان کی

شاعری بھی خلوص، سچائی اور انفاس تازہ سے مالامال تھی۔وہ غزل لکھتے تھے۔غزل میں سوچتے تھے اور غزل ہی میں زندہ رہنے کی خواہش رکھتے تھے۔"(۱۲)

غزلوں میں داخلی تجربات اور عصری مسائل کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جس نے ان کے کلام کو فکری گہرائی اور لسانی تازگی بخشی۔ مجید امجد نے کہا تھا کہ مراتب اختر کے اشعار پر مکاشفوں کا گمان ہوتا ہے اور غزلوں کو نظمینے کہا۔ان کا تخلیقی طرزِ اظہار اور انفرادیت انہیں اپنے معاصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ان کے کلام میں انفرادی غم اور اجتماعی مسائل کا امتزاج جدید غزل کو ایک نیا افق عطا کرتا ہے۔انور سدید لکھتے ہیں:

"مراتب اختر نے عروس غزل کو نیا چہرہ دیا تھا، اسی کی غزل سے نئے امکانات ہویدا ہوتے تھے اور اس کی اپنی سرشار کیفیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ قاری کو منتقل ہو جاتی تھی۔"(۱۳)

سید مراتب اختر اور مجید امجد اردو ادب کے وہ منفرد شعرا تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں روایت اور جدت کو یکجا کیا۔ دونوں شعرا کی ادبی زندگی میں فکری ہم آہنگی کے باوجود، ان کی تقدیر مختلف رہی۔ مجید امجد کو ایک باصلاحیت نقاد ملا جس نے ان کے کلام کو ادبی حلقوں میں زندہ رکھا، جب کہ مراتب اختر، شہرت سے گریز اور معاصرین کی بے توجہی کے سبب، اپنے حقیقی مقام سے محروم رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد کراچی میں مقیم ان کے ایک قریبی دوست انوار الحق کی جانب سے ان کا کلام اپنے نام سے شائع کرنا، ادبی بد دیانتی کی خلاف ورزی کی ایک گھناؤنی مثال ہے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی مردِ قلندر، کوئی صاحبِ ذوق و صاحبِ جگر اہلِ قلم اٹھے، جو زمانے کی بے حسی اور فراموشی کی دبیز تہوں میں دبے ہوئے ایک عہدِ خلوص کے شاعر، مراتب اختر کے چراغِ فن کو دوبارہ روشن کرے، اور ان کے کلام کو ان کے اپنے نام کے ساتھ شائع کرے۔ یہ ذمہ داری ان کے دوستوں کے لیے تو اب ممکن نہیں رہی۔ سجاد باقر رضوی، امجد اسلام امجد، مجید امجد، افتخار جالب، جعفر شیرازی، گوہر نوشاہی سب کے سب تاریخِ ادب کے اوراق میں امر ہو چکے ہیں، اور جو دو اہلِ نظر باقی ہیں، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری، وہ بھی عمر و علالت کے اس مرحلے پر ہیں جہاں اس علمی امانت کو اٹھانا ان کے لیے دشوار ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ لاہور سے کراچی تک کے تمام ادبی حلقے اس صداقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انوار الحق کے نام سے کوئی شاعر تھا ہی

نہیں، اور یہ کہ کتاب ''ستارے، ہوا، چراغ'' کی غزل کا ہر شعر، ہر مصرع، ہر بحر، ہر آہنگ، ہر تاثر اور ہر لرزتی صدا اپنے خالق کا نام مراتب اختر کے طور پر پکارتی ہے۔ ساہیوال کے اہلِ قلم اور نقادانِ فن اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اس مجموعے کا ہر جذبہ، ہر اضطراب، ہر نغمگی مراتب اختر ہی کے تخلیقی وجدان کا مظہر ہے۔ راقم الحروف اس موضوع پر اس لیے خامہ فرسائی کر رہا ہے کہ اس کے سامنے خود سید ناصر شہزاد، سید سید علی ثانی کو بارہا یہ کہتے رہے کہ یہ تمام غزلیں درحقیقت مراتب اختر کی تخلیق ہیں۔ انھی لمحات کی بازگشت آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ شاید اسی لیے جب راقم نے مراتب اختر کا تعارف قلم بند کیا تو ناصر شہزاد کا وہی درد، وہی کرب، اور ان کے لہجے کی سچائی میری تحریر میں در آئی۔ یہ صرف بیان نہیں بلکہ ایک گواہی ہے۔ اب یہ صرف ایک تنقیدی یا ادبی فریضہ نہیں رہا، بلکہ ادب اور انصاف دونوں کا قرض ہے، کہ مراتب اختر کے نام سے ان کے گم گشتہ فن کو اس کا اصل تعارف لوٹایا جائے۔ یہ عمل نہ صرف ایک شاعر کی روح کے ساتھ انصاف ہو گا بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سچائی کی بازیافت بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی صاحبِ درد قلمکار اس فراموش شدہ میراث کو نئی نسل تک پہنچائے، تاکہ مراتب اختر کے لفظوں کی لو پھر سے فروزاں ہو، اور ان کا چراغ ہمیشہ کے لیے ابدیت کی روشنی بن کر جلتا رہے۔ مراتب اختر کی زندگی اور ادبی خدمات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ان کے کام کو تحقیقی بنیادوں پر دوبارہ دریافت کیا جائے اور ان کے کلام کی ادبی اہمیت کو اردو ادب میں مناسب مقام دیا جائے۔ ان کی شخصیت اور شاعری اردو ادب کے ان خاموش گوشوں میں شامل ہیں جہاں فکری بلندی اور تخلیقی انفرادیت کے باوجود مناسب اعتراف نہ ہو سکا۔

مراتب اختر کے شعری مجموعوں میں ''جنگل سے پرے سورج''، ''حصارِ حال''، ''گنجِ گفتار'' اور ''گزرا بن برسے بادل'' شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں مجموعہ زیر نظر ہے اوراق منتشر ہیں،

نمونہ کلام:

غزل

یوں نہ اپنوں کی نگاہوں میں پرائے ہوتے
ایک بے درد کی باتوں میں نہ آئے ہوتے
میری صبحوں میری شاموں کی سمن زاروں میں

تو نہ ہوتا تو ترے درد کے سائے ہوتے
اب دلیلوں سے مرے درد کا مداوا نہ کرو
رک گئے تھے تو مرے پاس بھی آئے ہوتے
تم سے گر ہم کو شکایت ہے تو بس اتنی سی
تم نے جو عہد کیے تھے ، وہ نبھائے ہوتے
(۱۴)

غزل

سو چکی جاگتے لمحات کی دنیا بیٹھو
اٹھ کے تم چل بھی دیے۔۔۔ اور ذرا سا بیٹھو
لوگ گھڑ لیتے ہیں افسانے انہیں باتوں کے
بند کمرے میں سر شام نہ تنہا بیٹھو
کس قدر تیز ہوا چلنے لگی ہے باہر
بند کر دو یہ دریچے میرے پاس آ بیٹھو
آو تنہائی کی دیوار سے لگ کر بیٹھیں
پھر نہ چمکے گا یہ گھنگھور اندھیرا بیٹھو
یاد ہے آج بھی وہ رات ،وہ خلوت، وہ ترا
تھام کر ہاتھ مرا پیار سے کہنا بیٹھو
جب بھی اٹھتے ہیں قدم گھر کی طرف رات گئے
دل یہ کہتا ہے وہ آیا کوئی سایا بیٹھو
(۱۵)

ناصر شہزاد مجید امجد کے شاگرد خاص اور قریبی لوگوں میں سے تھے اور مراتب اختر کے ماموں زاد تھے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں'' ۱۹۶۴ء میں، دوسرا شعری مجموعہ ''بن باس'' ۲۰۰۴ء اور تیسرا شعری مجموعہ ''پکارتی رہی بنسی'' ۲۰۰۸ میں چھپا۔ ناصر شہزاد کی نثری تخلیقات میں ''کون دیس گئیوں'' (حیاتِ مجید امجد) کے علاوہ خطوط پر مشتمل نسخہ ''خط لکھیں گے'' اور دیباچوں کا مجموعہ ''ناصر شہزاد کے دیباچے'' قابل ذکر ہیں۔ ناصر شہزاد کا شعری شعور اور ذوق اردو غزل کی روایت میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری میں شیخوشریف کی ادبی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے، جو ان کے کلام کو ایک منفرد تہذیبی اور روحانی پس منظر عطا کرتی ہے۔ انھوں نے غزل کو محض جمالیاتی تجربے کی بجائے ثقافتی اور روحانی ورثے کی تجسیم بنایا۔ ان کے کلام میں پرانے قصوں، لوک گیتوں، اور علاقائی روایتوں کی بازگشت اس انداز سے سنائی دیتی ہے کہ یہ روایتی غزل کی محدودیت سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا تشکیل دیتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ''ناصر شہزاد کے یہاں احساس حسن، تحسین جمال کی حد میں رہتا ہے۔ حسن کے تصور یا تذکرے کے ساتھ کہیں جنسی ہیجان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ تاہم بعض مقامات پر جنسی احساس کی کچھ نازک لرزشیں محسوس ضرور ہوتی ہیں جو یہ باور کراتی ہیں کہ ان کے یہاں حسن اکائی ہونے کے باوجود ہمہ گیر نہیں ہے۔ یعنی ان کا تصور حسن ارضی ہے اور اس میں مابعد الطبعیی عناصر شامل نہیں ہیں۔ وہ جمال کی ارضیت کو قائم رکھتے اور اسی کو محترم جانتے ہیں، اسے ماورا سے جوڑنے کا اقدام نہیں کرتے، دوسرے لفظوں میں وہ ان رومانیت پسندوں کی مانند نہیں جو ارضی جمال کو بطور علامت لیتے ہیں۔ حسن فطرت کو خالق فطرت کی صفت گردانتے ہیں۔ یوں ایک پیراڈاکس کا شکار ہوتے ہیں، اثبات فطرت میں نفی فطرت کی صورت تلاش کر لیتے ہیں۔ جبکہ ناصر شہزاد ارضی جمال کی اپنی ارضی نہاد کو قائم رکھتے ہیں۔''(۱۶)

ان کے اشعار میں الفاظ زندہ تجربے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جہاں ہر لفظ نہ صرف معنی کی گہرائی کا حامل ہے بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔ ناصر شہزاد نے اپنی تخلیقی بصیرت سے غزل اور گیتوں کو علاقائی ثقافت کے رنگوں، محبت کی لطافتوں، اور روحانی ادراک کی وسعتوں سے روشناس کیا، جس نے ان کے کلام کو ان کے معاصرین سے ممتاز کیا ہے۔

نمونہ کلام:

پھر لہلہا اٹھا سمے آموں پہ بور کا
جانے سکھی کب آئے مسافر وہ دور کا
اس گاؤں کے نشیب میں بہتی ہے اک ندی
ندی پہ ایک پیڑ جھکا ہے کھجور کا
نیلم سی مرگ نین نگہ دل کے آر پار
جیون کے ارد گرد کرن کنڈ نور کا
اک پل ملاپ پھر کڑے کڑوے کٹھن ویوگ
مقصد تھا بس یہی ترے میرے ظہور کا
پکی سڑک کے داہنے قبریں کنواں وہ گاؤں
گاؤں کی اور چھور سماں سیم تھور کا
کچھ رات اداس کچھ کٹے جنموں جگوں کی پیاس
کچھ تیرے میرے جسم میں سودا فتور کا
یادیں وہ دور دیس وہ گھر اور وہ سامنے
سیمیں بدن سیاہ لباس ایک حور کا

(۱۷)

غزل کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے احساس کی قندیل میں ڈھل جاتا ہے
کوئی عالم ہو میری آگ میں جل جاتا ہے
روز آ آ کے خیالوں کے سمن زاروں میں
کوئی مسلے ہوئے پھولوں کو مسل جاتا ہے
رُت پلٹتی ہے تو بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
عطرِ غم پیرہنِ زیست پہ مل جاتا ہے
زندگی جب بھی کسی شئے کی طلب کرتی ہے
میرے ہونٹوں پہ تیرا نام مچل جاتا ہے
(۱۸)

پھر یوں ہوا کہ مجھ سے وہ یوں ہی بچھڑ گیا
پھر یوں ہوا کہ زیست کے دن یوں ہی کٹ گئے
اخروٹ کھائیں تاپیں انگیٹھی پہ آگ آ
رستے تمام گاوں کے کہرے سے اٹ گئے
(۱۹)

ہم وہ لوگ ہیں جو چاہت میں
جی نہ سکیں تو مر رہتے ہیں
(۲۰)

سید افضال حسین گیلانی(پ:۱۹۴۲ء،م:۲۰۲۰ء)

سید افضال حسین گیلانی، مراتب اختر کے چھوٹے بھائی اور مجید امجد کے شاگردِ خاص تھے۔ ان کے کلام کی ابتدائی اصلاح مراتب اختر نے کی، جبکہ باقاعدہ استاد مجید امجد ہی تھے۔ وہ انھیں دو ہستیوں سے مستنیر تھے البتہ علمِ عروض انھوں نے ڈاکٹر مخدوم غلام جیلانی سے سیکھا۔ انھوں نے نہ تو مشاعرے پڑھے اور نہ شہرت کی طلب رکھی۔

ان کی زندگی گوشہ نشینی میں گزری، جس کے باعث ان کے کلام میں گہرائی اور خلوص نمایاں ہیں۔ سید افضال حسین گیلانی پنجابی شاعری کی بیش تر اصناف میں اپنی فنی مہارت کے لیے معروف ہیں لیکن کافی اور دوہڑہ ان کے خاص میدان شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ غلام فرید کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کافی کی صنف کو سرائیکی زبان سے خالص پنجابی میں منتقل کیا اور اسے اپنے عہد کے فکری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی کافی میں معنوی گہرائی، جذبات کی شدت، اور زبان کی لطافت کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، سید افضال حسین گیلانی نہ صرف پنجابی زبان کے ایک عمدہ شاعر تھے بلکہ اردو نثر کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھیں راست فکر ادیب، عالم دین، مورخ، اور سوانح نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے تحریری کام نے اردو ادب کو انمول خزانے دیے، اور ان کی تحقیقی کاوشیں ان کے علمی کمالات کی گواہ ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف ایک عہد کا ادبی ورثہ ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ احمد راہی جیسے ممتاز شاعر نے ان کے کلام کو پڑھا تو انہیں "خواجہ غلام فرید ثانی" کے لقب سے نوازا۔ ان کی لکھی نعتیں، قصیدے، دوہڑے، اور گیت بہت مقبول ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں:

نثری کتب:

ا۔ ''حیات الامیر''(دو جلدیں) ۲۔ ''حیات سید سید محمد سائیں'' ۳۔ ''سوانح حیات سید حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں'' ۴۔ ''ہمارے آباو اجداد شیعہ نہ تھے'' ۵۔ ''تصوف کیا ہے؟''(مقالہ) ۶۔ ''تذکرۃ الابرار''

شعری مجموعے:

ا۔ ''وناں دی چھاں تے سسی'' ۲۔ ''کافی اے یار داویہڑا'' ۳۔ ''عشق، عجیب، طبیب'' ۴۔ ''بدلے رنگ دھریکاں'' ۵۔ ''آہیں + آڑنگ = آہر'' ۶۔ ''کالی چپ''

کلام کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

نعت:

دل وچ شوق ازل دا ۔۔۔۔ عربی ڈھول مٹھل دا

اوہ ڈنہہ کرماں والا ۔۔۔۔۔ شہر مدینیوں شالا
آوے خیر دا ولدا ۔۔۔۔۔ عربی ڈھول مٹھل دا

جھکڑے تے سر کردے۔۔۔۔۔ہکڑے دردے بردے
ہے فیضان عدل دا ۔۔۔۔۔ عربی ڈھول مٹھل دا

تاہنگ تہوار نہ بھلدی ۔۔۔۔۔ او جھڑ راہیں رلدی
لبھ لبھ کھوج جمل دا ۔۔۔۔۔ عربی ڈھول مٹھل دا

شکر کرے افضال اے ۔۔۔۔۔ حال تھیا خوش حال
اے
وٹھڑا مینہہ فضل دا ۔۔۔۔۔ عربی ڈھول مٹھل دا
(۲۱)

کافی:

درداں دے قصے میں کہنوں سناواں
مٹھڑی نہ بھاواں بھیناں بھراواں

محرم نہ ملدا۔۔۔۔ ایہہ دل نہ کھلدا
ہر دم اندیشا ہڈیاں نوں چھلدا
باہجھوں مہانے بیڑا نہ ٹھلدا
پیتاں تے بیٹھی رووواں ڈھہاواں

اکھیاں نے باہروں ساون وسایا
آہیں نے اندروں آڑنگ بنایا
موجھاں موجھایا، سخناں ستایا
چوڑا نہ چھنکے سنجیاں نے باہواں

افضالؔ تیکوں کیوں بچھدے لوک اے؟
لاون پئے بھنڈیاں، آون پئے ہوکے
رل وسدے سارے مارن ٹنوکے
کیہڑے جرم دیاں ملیاں سزاواں
(۲۲)

دوہڑا:

نازک پیر ملوک سسی دے، جنہاں بھار حنانہ چائے، تھل وچہ آئے
حُسن تے جوبن دے پھل کلیاں، گئے لُو دے وچہ کُرمائے، گئے مرجھائے
کدی تھک کے باندھی کدیں کوک کے اٹھدی کدی ٹُردی پیر لنگا اے۔ آبلہ پا اے
افضالؔ شہادت بند بند دیسی، جیویں سسی وقت لنگھائے۔ جو سر آئے
(۲۳)

سید سَید علی ثانی گیلانی (پ:۱۹۷۷ء)

سید سِید علی ثانی گیلانی معاصر دور کی اُن علمی شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے بر صغیر میں سلسلۂ قادریہ کی تاریخ، مشائخ کی سوانح اور روحانی روایات کی تحقیق کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ وہ ''ادارہ صوت ہادی'' کے منتظم اعلیٰ

اور سید حسن بخش (بانی شیخوشریف) کے علمی و روحانی وارث ہیں۔ اس نسبت نے ان کی علمی کاوشوں کو داخلی بصیرت عطا کی ہے اور انھیں خاندانی روایات تک براہِ راست رسائی کا وہ درجہ نصیب ہوا ہے جو بیرونی محققین کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ان کا امتیاز صرف نسلی نسبت نہیں، حقیقی امتیاز اُن کی تحقیق، تنقید، تجزیے اور تاریخی مواد کی چھان پھٹک میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ہمیشہ معروضی طرز کو مقدم رکھا اور ہر روایت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کیا ہے۔ یہ وصف انھیں صوفیانہ تذکرہ نگاروں، روایتی مصنفین اور عام مؤرخین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی کتب کو محققین نے مرجع، مستند اور محققانہ تدوین کے طور پر قبول کیا ہے۔ ان کے قلم میں ادبی نرمی بھی ہے اور تنقیدی سختی بھی، روایت کا احترام بھی اور حقیقت کی تلاش بھی۔ سید سَید علی ثانی جیلانی کی علمی، ادبی اور خانقاہی خدمات برصغیر کے فکری ورثے کا اہم باب ہیں۔ وہ موثر منتظم، بصیرت افروز معلم، صاحبِ طرز نثر نگار اور اصلاحِ باطن کے علم بردار ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے جو ایک طرف روایت کے تسلسل کو مضبوط کرتی ہے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے فکری تقاضوں کا ادراک بھی فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ادارہ صوتِ ہادی'' کی تنظیمِ نو ہو یا علمی و تربیتی نشستوں کا اہتمام، دروس و خطبات کا سلسلہ ہو یا مخطوطات کی حفاظت و اشاعت ہر میدان میں ان کی محنت، حکمت اور بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے خانقاہی نظام کو رسوم تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اسے علم، تحقیق، اخلاق اور خدمتِ خلق کے ایسے مرکز میں تبدیل کیا ہے جو اپنی روحانی حرارت اور علمی سنجیدگی دونوں کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ ان کے خطبات میں فکری نظم، تاریخی شعور، صوفیانہ آہنگ اور اصلاحی پیغام ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں، جبکہ تحریروں میں سادگی، شستگی اور تحقیق پر مبنی طرزِ بیان سامنے آتا ہے۔ ان اوصاف نے ان کو اس عہد کے معتبر صوفی، موثر مفکر اور صاحبِ طرز محقق کا درجہ عطا کیا ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کتابیں محض مصنف کہلانے کی غرض سے نہیں لکھتے بلکہ ہر وہ موضوع جس پر علمی کمی یا تحقیق کا خلا محسوس ہو، اسی کو اپنی کاوش کا مرکز بناتے ہیں۔ انھی اصولوں کے تحت ان کی تحریریں ظاہری جلوہ آرائی سے بے نیاز، تحقیقی گہرائی اور فکری دیانت پر قائم دکھائی دیتی ہیں۔ برصغیر کی صوفیانہ تاریخ میں اہلِ چشت کی خدمات کا ایک طویل اور روشن سلسلہ موجود ہے۔ ان کے ہاں تصوف، سوانح اور تذکرہ نگاری کا ذخیرہ وافر اور متنوع ہے۔ اس کے برعکس سلسلۂ قادریہ، جو دائرۂ تصوف میں سب سے وسیع تر اور اثر انگیز سلسلہ شمار ہوتا ہے، اپنے علمی و تحقیقی ذخیرے کے اعتبار سے ایک خلا رکھتا

ہے۔ اس وسیع سلسلے میں عبد الحق محدث دہلویؒ کے بعد کوئی ایسی جامع علمی روایت دکھائی نہیں دیتی جو سلسلہ قادریہ کی تاریخ، تعلیمات اور روحانی تسلسل کو منظم صورت میں پیش کرتی ہو۔ یہی وہ کمی ہے جسے سید سید علی ثانی نے باریک بیں تحقیق، تاریخی مطالعے اور منظم تدوین کے ذریعے پورا کیا ہے۔ انھوں نے صرف اَسناد کی فہرستیں جمع نہیں کیں بلکہ پوری تاریخِ قادریت کو ایک مربوط سلسلے کی طرح مرتب کیا ہے، جس میں سوانح، افکار، مشاہدات اور عملی نقشِ قدم سب کچھ باکمال احتیاط سے جمع کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے کئی وارثانِ سلسلۂ قادریہ کے طرزِ عمل سے بے اطمینانی رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف محض سلسلے کی نسبت یا خاندانی وراثت کا نام نہیں، بلکہ عمل، اخلاق، خدمت اور باطن کی تہذیب سے عبارت ہے۔ اسی لیے ان کی کتابیں محض تاریخ نہیں بلکہ ایک طرح کی اصلاحی دستاویزات بھی ہیں، ایسی تحریریں جو صاحبزادگان اور وارثانِ سلسلہ کو ان کے اسلاف کے کردار کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ ''ادارہ صوت ہادی'' کی تنظیم نو ہے، جس کے ذریعے انھوں نے سید محمد حسین گیلانی اور مولانا ظفر علی خان کے مشن کو نہایت مؤثر انداز میں جاری رکھا ہے۔ سَید علی گیلانی اس وقت ''ادارہ صوت ہادی'' کے منتظمِ اعلیٰ ہیں اور علمی و تحقیقی میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف مختلف حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ اردو نثر میں ان کے تحقیقی کام نے اہم نقوش چھوڑے ہیں، اور ان کی تصانیف علمی و ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کی مطبوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ ''شجرۃ الاشراف'' ۲۔ ''عقد العقائد'' ۳۔ ''اکمال الافضال فی الاوراد والاشغال'' ۴۔ ''حسب مراتب'' ۵۔ ''انیس المظاہر، سیرت السید عبد القادر جیلانی'' ۶۔ ''رائے احمد خان کھرل شہید'' ۷۔ ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ اور قیام پاکستان میں خانقاہ شیخو شریف کا کردار'' ۸۔ ''سیرت و سوانح حضرت سید عبد الرزاق گیلانی المعروف داتا شاہ چراغ لاہوری'' ۹۔ ''افادات جیلانی'' ۱۰۔ ''تذکرۃ الابرار'' ۱۱۔ ''تذکرۃ الانبیا'' (مترجم) ۱۲۔ ''شہر غزل کے بعد'' ۱۳۔ ''خطبات شیخو شریف'' (دو جلدیں)

ان کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ''خدا، انسان اور شیطان'' زیرِ طبع ہے، جس سے ان کے فکری اور تحقیقی رجحانات کا علم ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار شفیع صاحب ان کے مضامین پر مشتمل کتاب ''مقالات جیلانی'' بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ سید سید علی گیلانی کی تصانیف ان کے گہرے مطالعے، تحقیق کی باریکیوں سے واقفیت اور تاریخی و دینی

موضوعات پر ان کی گرفت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کے کام نے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ ان کی تحریریں نسلِ نو کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سید عون الحسن غازی (پ:۱۹۷۱ء)

سید عون الحسن غازی، معروف شاعر اور ادیب، مراتب اختر کے بھانجے ہیں۔ انہوں نے مراتب اختر پر تحقیقی کتاب ''نقدِ مراتب'' ۲۰۰۴ء میں مرتب کی، جس میں متعدد اہم شخصیات کے مضامین شامل کیے گئے۔ سید عون الحسن غازی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''سیاہ آسمان'' ۲۰۰۷ء اور دوسرا شعری مجموعہ ''شمائل'' کے نام سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ ایک پنجابی شعری مجموعہ ''ویلے دا پر چھاواں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کی تخلیقات میں معاصر سیاسی، سماجی، اور تہذیبی مسائل کا گہرا شعور جھلکتا ہے۔ خانقاہی ماحول اور درویشی فضا نے ان کے فن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جو ان کی شاعری میں واضح نظر آتے ہیں۔

نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رسول پاک کا ذکر جمال کرتے ہوئے
قلم ،ورق پہ نگوں ہے کمال کرتے ہوئے
لرز سا جاتا ہوں لکھتے ہوئے میں وصف حضور
تمام حد ادب کا خیال کرتے ہوئے
در حضور پہ جھکتا ہے روشنی کے لیے
ہر اک روز کا سورج زوال کرتے ہوئے
ثنا گر شہ عالم ہوں اس لیے غازی
خجل سا ہوگیا فکر مآل کرتے ہوئے

(۲۴)

غزل

ہم سفر میں تھے، یہی رخت سفر جانا تھا

دھوپ کو سایہ تو سورج کو شجر جانا تھا
خشک پتوں کو اڑائے لیے پھرتی تھی ہوا
اُن کو اڑنا تھا مگر ہم کو ٹھہر جانا تھا
آگ کا کھیل ضروری تو نہیں ہے کہ ہمیں
لے کے سورج کو ہتھیلی پہ گزر جانا تھا
یوں بکھر کر تری محفل سے نکل آئے تھے ہم
جیسے بہتے ہوئے دریا کو اُتر جانا تھا
اب تصور میں اُسی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے
ہم نے پیپل کو ترا یاد نگر جانا تھا
اب وہاں دھول سی اڑتی نظر آتی ہے ہمیں
جس کو منزل کے لیے راہ گزر جانا تھا
دیکھ کر اک تری تصویر مری آنکھوں کو
اشک بن کر سرِ قرطاس بکھر جانا تھا
تو نہیں تھا تو مرے رنگِ سماعت نے یہاں
تیری آواز کو جینے کی خبر جانا تھا
وہ تو تنہائی میں میری طرح روتا ہوگا
اور غازیؔ مری آنکھوں ہی کو بھر جانا تھا

(۲۵)

کشمیر

ہر طرف خون ہے

خون ہی خون ہے

جس چمن میں کبھی پھول کھلتے تھے
اور سبز رو کیاریوں میں گل ولالہ ملتے تھے
اب اس چمن زار
شاداب خطے میں
ہر شے لہو رنگ ہے
رات سے بڑھ کے تاریک دن ہے
جہاں سَرد راہیں مہکتی تھیں
اب اس سمن زار وادی میں
بس۔۔۔۔۔راکھ اڑتی ہے
بس۔۔۔۔۔خون بہتا ہے
میں سوچتا ہوں
خدا جانے کب
اس چمن میں بہاریں بسیرا کریں گی!
دہکتی ہوئی رات کو پھر سویرا کریں گی!

(۲۶)

فراق کے زیر عنوان نظم ملاحظہ ہو:

آج قمری مہینے کی چودہ ہے
آج پھر چاند آسمان پر جگمگائے گا
ہاں! یہی تو رات تھی
اس سے بچھڑے جانے کی
ہاں۔۔۔!

آج پھر اس کی یاد میں
دل آنسو بہائے گا(۲۷)

## حوالہ جات


(۱)ڈاکٹر اصغر علی بلوچ:مراتب اختر(شخصیت و فن)پر ایک نظر، مضمون مشمولہ:مراتب اختر(شخصیت و فن)، مرتب:مشتاق عادل کاٹھیہ ، مہکاں پبلشر، ساہیوال، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲

(۲)عبدالحق دہلوی، محدث دہلوی:"اخبار الاخیار"، مترجم:مولانا اقبال الدین احمد، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸۲

(۳)شیخ محمد غوث گیلانی:"دیوان قادری" مرتب:طاہر حسین قادری، منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۲۱ء، ص ۳۲۶

(۴)سید مجتبیٰ گیلانی فضلیؔ:"عین التصوف" مرتب:پیر محمد طاہر حسین قادری، کتابخانہ ابن کرم خانقاہ منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۱۷ء، ص ۶۳۔۶۴

(۵)سید اصغر علی گیلانی لاہوری:"شجرۃ الانوار"(قلمی نسخہ)، گیلانی لائبریری، شیخوشریف، ص ۱۴۵

(۶)سید افضال حسین گیلانی:"تذکرۃ الابرار" مرتب:سید علی ثانی گیلانی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۵ء، ص، ۷۷۔۷۸

(۷)سید افضال حسین گیلانی:"سوانح حیات حسن بخش المعروف داتا حسنین سائیں" ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۶ء، ص ۶۳

(۸)سید افضال حسین گیلانی:"تذکرۃ الابرار" مرتب:سید علی ثانی گیلانی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۵ء، ص ۱۵۱

(۹)ایضاً، ص ۱۴۷

(۱۰)ایضاً، ص ۱۴۳

(۱۱)ایضاً، ص ۱۴۸

(۱۲)ڈاکٹر گوہر نوشاہی:مراتب اختر کی یاد میں، مضمون مشمولہ:نقد مراتب، مرتب:عون الحسن غازی، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۴ء، ص ۶۵

(۱۳)انور سدید:گنج گفتار، مضمون مشمولہ:نقد مراتب، ص ۵۰

(۱۴)سید مراتب اختر:"جنگل سے پرے سورج" ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۶

(۱۵)ایضاً، ص ۵۶

(۱۶)ڈاکٹر ناصر عباس نیر:بن باس پر ایک نظر، مضمون مشمولہ:سہ ماہی صوت ہادی(ناصر شہزاد نمبر)، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۹ء، ص ۴۱

(۱۷)سید ناصر شہزاد:"بن باس" الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۳۔۲۰۴

(۱۸)سید ناصر شہزاد: "چاندنی کی پتیاں" مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۹۵

(۱۹)سید ناصر شہزاد: "بن باس" الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۳

(۲۰)ایضاً، ص ۱۰۲

(۲۱)سید افضال حسین گیلانی، سید: "آہیں + آڑنگ = آہر" ادارۂ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۰ء، ص ۲۳

(۲۲)ایضاً، ص ۱۳۱

(۲۳)سید افضال حسین گیلانی: "وناں دی چھاں تے سسی"، ادارہ صوت ہادی شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۱

(۲۴)سید عون الحسن غازی: "شمائل" ادارہ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۲۰ء، ص ۳۱

(۲۵)سید عون الحسن غازی: "سیاہ آسمان" ادارہ صوت ہادی، شیخوشریف، اوکاڑہ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

(۲۶)ایضاً، ص ۹۳

(۲۷)ایضاً، ص ۲۵

References In Roman


1. Dr Aṣghar ʿAlī Baloch: Marātib Akhtar (Shakhṣiyyat o Fan) Par Ek Naẓar, Maẓmūn Mashmūlah: Marātib Akhtar (Shakhṣiyyat o Fan), Murattib: Mushtāq ʿĀdil Kāṭhīah, Mahikān Pablishar, Sāhīwāl, 2014, p. 12
2. ʿAbd al-Ḥaqq Dihlawī, Muḥaddiṡ Dihlawī: "Akhbār al-Akhyār", Mutarajjim: Maulānā Iqbāl al-Dīn Aḥmad, Dārul Ishāʿat, Karāchī, 1997, p. 282
3. Shaikh Muḥammad Ghauṡ Gīlānī: "Dīwān Qādirī" Murattib: Ṭāhir Ḥusain Qādrī, Mangāṇī Sharīf, Jhang, 2021, p. 326
4. Sayyid Mujtabā Gīlānī Faẓlī: "ʿAin al-Taṣawwuf" Murattib: Pīr Muḥammad Ṭāhir Ḥusain Qādrī, Kitābkhānah Ibn-e Karam Khānqāh Mangāṇī Sharīf, Jhang, 2017, ṣ. 63-64
5. Sayyid Aṣghar ʿAlī Gīlānī Lāhaurī: "Shajrat al-Anwār" (Qalamī Nuskhah), Gīlānī Lā'ibrerī, Shaikho Sharīf, p. 145
6. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Tadhkirat al-Abrār" Murattib: Sayyid ʿAlī Ṡānī Gīlānī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2025, p. 77-78
7. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Sawāniḥ Ḥayāt Ḥasan Bakhsh al-Maʿrūf Dātā Ḥasnaīn Sā'īñ" Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2006, p. 63
8. Sayyid Afẓāl Ḥusain Gīlānī: "Tadhkirat al-Abrār" Murattib: Sayyid ʿAlī Ṡānī Gīlānī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2025, p. 151
9. Ibid, p. 147
10. Ibid, p. 143
11. Ibid, p. 148

12. Dākṭar Gauhar Naushāhī: Marātib Akhtar Kī Yād Meñ, Maẓmūn Mashmūlah: Naqd-e Marātib, Murattib: ʿAun al-Ḥasan Ghāzī, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2004, p. 65
13. Anwar Sadīd: Ganj-e Guftār, Maẓmūn Mashmūlah: Naqd-e Marātib, ṣ. 50
14. Sayyid Marātib Akhtar: "Jangal Se Pare Sūraj" Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2007, p. 56
15. Ibid, p. 56
16. Dākṭar Nāṣir ʿAbbās Naiyyar: Ban Bās Par Ek Naẓar, Maẓmūn Mashmūlah: Sehmāhī Ṣaut-e Hādī (Nāṣir Shahzād Number), Shumārah Janwarī tā Mārch 2009, Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2009, p. 41
17. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Ban Bās" Alḥamd Pablishanz, Lāhaur, 2004, ṣ. 203-204
18. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Chāñdnī Kī Pattiyāñ" Maktabah Adab-e Jadīd, Lāhaur, 1965, p. 95
19. Sayyid Nāṣir Shahzād: "Ban Bās" Alḥamd Pablishanz, Lāhaur, 2004, p. 123
20. Ibid, p. 102
21. Sayyid Afżāl Ḥusain Gīlānī: "Āheñ + Āṛang = Āhar" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2020, p. 23
22. Ibid, p. 131
23. Sayyid Afżāl Ḥusain Gīlānī: "Wanāñ Dī Chhāñ Te Sassī", Idārah Ṣaut-e Hādī Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2018, p. 131
24. Sayyid ʿAun al-Ḥasan Ghāzī: "Shamā'il" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2020, p. 31
25. Sayyid ʿAun al-Ḥasan Ghāzī: "Siyāh Āsmān" Idārah Ṣaut-e Hādī, Shaikho Sharīf, Okāṛah, 2007, p. 45
26. Ibid, p. 93
27. Ibid, p. 25

***

# عہد حاضر میں سرزمین مدھیہ پردیش کے غزل گو شعراء: ایک جائزہ

عصمت خاتون
**ریسرچ اسکولر، شعبۂ اردو، پاٹلی پتر یونیورسٹی، پٹنہ**

**تلخیص:** ملک ہندوستان کی مردم خیز سرزمین مدھیہ پردیش قدیم زمانے ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہی۔ اس سرزمین کی خاک سے بے شمار اہل قلم، سیاست داں،، فنکار اور شاعر پیدا ہوئے جس کی ایک سنہری تاریخ قلمبند ہے۔ مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کو تو شہر غزل کے نام سے جانا جاتا ہے کیوں کہ یہاں اردو غزل کی ایک شاندار روایت رہی ہے جہاں کئی معروف و مقبول شاعر نے جنم لیا۔ سرزمین مدھیہ پردیش کا شاید ہی ایسا کوئی خطہ ہو جہاں شاعر و ادیب نے جنم نہ لیا ہو۔ یہاں کی مٹی اور فضا علمی و ادبی شقافت کے لئے قدیم زمانے سے ہی ساز گار رہی اور موجودہ عہد میں بھی اس شاندار روایت کی پاسداری ہمارے شعراء و ادبا اپنے خونِ جگر سے کر رہے ہیں۔

**کلیدی الفاظ:** روایت،# شقافت# فنکار# خطہ# ساز گار# پاسداری# گہوارہ# ضمیر# قومی یکجہتی# اقتداری# فرقہ پرستی# قربت

عہد حاضر میں سرزمین مدھیہ کے غزل گو شعراء کی ایک لمبی فہرست ہمارے سامنے موجود ہے جن میں چند نامور غزل گو شعرا کا یہاں جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلا نام قمرؔ گوالیر صاحب کا آتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری میں دورِ حاضر کے سیاسی و سماجی مسائل کو بروئے کار لایا ہے۔ دور حاضر میں ہندوستان کے اردو غزل گو شعراء میں جناب قمرؔ گوالیر صاحب کا نام کافی نمایاں ہے۔ آپ کا تعلق گوالیر (مدھیہ پردیش) سے ہے۔ موصوف کا مجموعہ کلام "کشش" (۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا نمونہ کلام

زندگی کیا ہے پوچھیے ان سے
لوگ جو حادثوں میں پلتے ہیں

بڑھتی جا رہی ہے روز مہنگائی
رنگ لائے گی آدمی کی بھوک

فرقہ پرستی ،نفرتیں اور مذہبی جنون
دنیا میں آ کے تم نے یہ دنیا کو کیا دیا

اس جگہ مفلوج رہتا ہے شعورِ زندگی
جس جگہ مزدوریاں سستی ہوں،مہنگائی بہت

حلف اُ ٹھا کے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے
ہمارے حق میں صحیح فیصلہ نہیں ہوگا

یہ زندگی کا موڑ خطرناک ہے قمرؔ
جنگل کی آگ آگئی کھیتوں کے آس پاس

ملمعؔ اوڑھے ہوئے مل نہ جائے تانبہ تمہیں
تم اصلی سونے کے گہنے چلے ہو بنوانے

تنگ دل ،تنگ نظر ہوں گے جہاں لوگ قمرؔ
کیا نظر آئے بھلا ایسے کسی گھر میں کشش

وقت کے بے گھر سدا ما کو ہے کانہا کی تلاش
ورنہ ملنے کو ملے ہر گام پر بھائی بہت

:حبیب انجم دیتاوی

اردو غزل کی دنیا کا ایک معروف و مقبول نام حبیب انجمؔ دیتاوی کا تعلق شہر بھوپال سے ہے۔ان دو شعری مجموعے پہلا" ضمیر کی آواز"(۱۹۹۸ء)اور دوسرا"سوزِ دروں"(۲۰۰۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔اچند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جم گئے ہیں ہر طرف فرقہ پرستی کے قدم
سیکولر آئین کا لٹ کر رہا آخر بھرم

اقتداری بھوک اور موقع پرستی کے دھڑے
لوٹ کر ملکی معشیت اب اڑاتے ہیں مزے

جھوٹے وعدوں کا ملا ہے وو ٹروں کو یہ انعام
بڑھ کہ مہنگائی نے سبکا کر دیا جینا حرام

اقتداری بھوک کا چوبیس سمتی کارواں
کیا پتا لے جائے گا ملک و ملت کو کہاں

**اتُل اجنبی:**

ممتاز شاعر اتُل اجنبی کا تعلق گوالیر سے ہے۔ان کا شعری مجموعہ "بروقت"(۲۰۱۰ء) میں منظر عام پر آیا۔نمونہ کلام۔

پکا نہ پوری طرح اور دھان ٹوٹ گیا
سیاستوں سے ہوا کی کِسان ٹوٹ گیا

سب اپنے گھروں میں ہیں خوش بہت لیکن
بزرگوں والا خاندان ٹوٹ گیا

سفر ذرا سا تھا لیکن طویل ہوتا گیا
ہماری را ہ کا جب ایک نشان ٹوٹ گیا

وہ بند رکھتا ہے اس درجہ کھڑکیاں گھر کی
گھٹن ہواؤں کو محسوس ہونے لگتی ہے

امیر شہر سے قربت رکھو تو دھیان رہے
ندی چڑھی تو کنارے ڈبونے لگتی ہے

**شروتؔ زیدی بھوپالی:**

عہدِ حاضر کے نامور اردو غزل گو شعرا میں شروتؔ زیدی بھوپالی بے حد معروف و مقبول ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۵۴ء میں شہر بھوپال میں ہوئی۔ موصوف نے بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کی تعلیم حاصل کی اور ایڈوکیٹ کے پیشہ سے منسلک رہے۔ آپ اردو ادب کے ایک سچے خادم ہیں جو اردو ادب کی خدمت ہی نہیں اردو ادب سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آپ کے چار شعری مجموعے ''رہنمائی کے لئے''(۲۰۱۱ء)''بند گی کے بعد بھی''(۲۰۱۱)''منزلوں کے پار''(۲۰۱۶ء)اور ''کتابوں کا سفر''(۲۰۲۳ء) منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے عہدِ حاضر کے تمام مسائل کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے مسائل کو بھی بہت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر شخص کی آنکھوں میں ہے ایک کرب کا عالم
ہر شخص کے سینے میں کہیں آگ لگی ہے

چہرے پہ نمائش کت سوا کچھ بھی نہیں ہوتا
تم دل پہ رکھو ہاتھ یہیں آگ لگی ہ

یہ سیاسی دور بھی کیا خوب ہے اُلجھا ہوا
ہم سلجھتے جا رہے ہیں وقت کی تکرار سے

خاندانوں کو مٹا دے گی مقدمے بازیاں
گھر لپٹ کر رو دئے اپنے درو دیوار سے

بدگماں ہونے لگے مجھ سے میرے دوست بھی
کس سیاست سے مخالف آزماتے ہیں مجھے

مندر اور مسجد کے جھگڑے ختم کرو
اہل سیاست اشکوں میں گھر سب ڈوبے ہیں

شروتؔ شہرت طاقت پر نہ اِتراؤ
آج تلک فرعونی لشکر سب ڈوبے ہیں

لہروں میں ڈولتی ہیں مسافر کی منزلیں
ہیں دونوں سمت ناؤ کے مہمان گھاٹ پر

اپنی صدی کی کوئی کہانی لیے ہوئے
آئے ہیں بھانت بھانت کے انسان گھاٹ پر

بازار سے کیا کوئی شکایت کرے شروتؔ
گھر میں بھی تو اردو کے رسائل نہیں ہوتے

منہ تکا کرتے ہیں بازار میں بکنے کے لیے
زندگی اپنی ہے اردو کے رسالوں کی طرح

کس نے کہا کے لکھنا لکھانا محال ہے
ورثے کو اب سنبھال کے رکھنا محال ہے

ہر شخص کی آنکھوں میں ہے ایک کرب کا عالم
ہر شخص کے سینے میں کہیں آگ لگی ہے

چہرے پہ نمائش کت سوا کچھ بھی نہیں ہوتا
تم دل پہ رکھو ہاتھ یہیں آگ لگی ہ

یہ سیاسی دور بھی کیا خوب ہے اُلجھا ہوا
ہم سلجھتے جا رہے ہیں وقت کی تکرار سے

خاندانوں کو مٹا دے گی مقدمے بازیاں
گھر لپٹ کر رو دئے اپنے درو دیوار سے

بربادی کی لکیروں سے ہے تصویریں عیاں
آئینے پہچانتے ہیں آپ کو کردار سے

نئی صدی کا فسانہ ہے مختصر اتنا
پرانے دور میں دیکھا نہیں تھا سر اتنا

بدگماں ہونے لگے مجھ سے میرے دوست بھی
کس سیاست سے مخالف آزماتے ہیں مجھے

یہ بت حالات ہی انسان کو بے حس بناتے ہیں
وگرنہ پتھروں جیسا کسی کا دل نہیں ہوتا

**اشوک مزاجؔ بدر:**

اکیسویں صدی کے ممتاز غزل گو شاعر اشوک مزاجؔ بدر کا تعلق ساگر (مدھیہ پردیش) سے ہے۔ ان کی پیدائش ۲۳؍ جنوری ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ والد محترم کا نام گوپی ناتھ اور والدہ محترمہ کا نام سریو دیوی ہے۔ اشوک مزاجؔ بدر کو شاعری کا ذوق وشوق طالب علمی کے زمانے ہی سے رہا۔ معروف شاعر بشیرؔ بدر سے مشورہ سخن کیا۔ موصوف کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ سمندروں کا مزاج (۱۹۹۵ء)

۲۔ غزل نامہ (۲۰۰۱ء)

۳۔ میں اشوک ہوں، میں مزاج ہوں (۲۰۱۷ء)

نمونہ کلام

یہ ہے اکیسویں صدی کی غزل
تنگ کپڑا کھُلا کھُلا ہے مزاج
اب غزل کا بدل رہا ہے مراج
لہجہ لہجہ نیا نیا ہے مزاج

ایک جیسے تو ہو نہیں سکتے
سب کا اپن اپنا ہے مزاج

اپنا برتاؤ خوشنما رکھنا
شخصیت کا ہی آئینہ ہے مزاج

میرؔ و غالبؔ کی ساری غزلوں کا
پھول سا دل موم سا ہے مزاج

**ڈاکٹر پرمود لال یکتاؔ:**

اکیسویں صدی کے مشہور اردو غزل گو شاعر پرمود لال یکتاؔ کا تعلق شہر بھوپال سے ہے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں پی۔ ایچ۔ڈی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اردو زبان و ادب سے رشتہ استوار رکھا۔ معروف شاعر سبودھ لال ساقی اور اشوکؔ صاحب ان کے بھائی ہیں۔ ڈاکٹر پرمود لال یکتاؔ کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''یوں ہے'' (۲۰۱۶ء) میں شائع ہوا۔ نمونہ کلام

ہم پر بھی مشکلات کی چشم و کرم رہی
ہم نے بھی احترام کیا مشکلات کا

کفر و ایماں کے نگہباں نہیں جینے دیتے
آج کے انساں کو انساں نہیں جینے دیتے

زندگی ہے حسرتوں سے دل کو بہلانے کا نام
یعنی دانستہ فریبِ آرزو کھانے کا نام

ایسا کچھ ہو گیا ہے دنیائے ادب کا ماحول
ایک فنکار کو فنکار سے ڈر لگنے لگا

جدت بھی ضروری ہے سخن میں لیکن
احساس روایت فراموش نہ ہو

ان حسرتوں کی قبر میں سوئی ہوئی ہوں میں
جذبات کیسے نظم کروں اپنے شعر میں

کب سے اسی خیال میں ڈوبی ہوئی ہوں میں
دل تو آمادہ اظہار جنوں ہے یوں ہے

تنہائیوں کا کرب کبھی ہم سے پوچھئے
مدت سے ہم کلام ہیں،دیوار و در سے ہم

**ڈاکٹر نفیس تقیؔ:**

اصل نام محمد نفیس خاں اور تخلص تقیؔ ہے۔ تاریخ پیدائش ۱/مارچ ۱۹۵۰ء اور جائے پیدائش سرونج، مدھیہ پردیش ہے۔ آپ کا پہلا مجموعہ کلام ''خوشبو کے پر کھلے''(۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا۔ نمونہ کلام

کبھی آہوں کبھی اشکوں کی پذیرائی ہے
آپ کی بزم سے بہتر میری تنہائی ہے

چھین لی خوش فہمیوں نے ہم سے جب بینائی
بے حسی اس درجہ ہو تو آئینہ کیا دیکھنا

داغ دامن پہ نہیں نقش وفا رکھتے ہیں
ہم محبان وطن اجلی قبا رکھتے ہیں

ہمارے دور کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم اپنے کھول سے باہر نکل چلو تو چلو

**سبودھ لال ساقیؔ:**

عہدِ حاضر کے مشہور شاعر سبودھ لال ساقیؔ بھوپال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شاعرانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔۔ اکیسویں صدی کے دومایاناز شاعر ڈاکٹر پرمود لال یکیاؔ اور پروفیسر اشوکؔ لال آن کے سگے بھائی ہیں ،موصوف کا مجموعہ کلام ''نمک''(۲۰۱۶ء) میں شائع ہوا۔ نمونہ کلام

ہر عدالت میں تاریخ پڑتی رہتی ہے
عمر بھر مدعی ہی رہی زندگی

اپنی گمشدگی کی افواہیں میں پھیلاتا رہا
جو بھی خط آئے بنا کھولے میں لوٹاتا رہا

میرا چہرہ کھو گیا ہے چہروں کے اس بازار میں
جانے کیا کیا روپ میں دنیا کو دکھلاتا رہا

میں کرنے والا ہوں ہر خیر خواہ کو مایوس
ابھی میں جرم کا اقرار کرنے والا ہوں

کافر سکھا رہے ہیں عبادت کا سلسلہ
بھگوان کی یہ مورتی آئی ہے چین سے

جب بھی نشہ میرا ٹوٹ گیا
کوئی بت کوئی خدا ٹوٹ گیا

یہ بھی ہوا کہ فائلوں کے درمیاں ملیں
مجھ کو کہاں کہاں مری تنہائیاں ملیں

**بیدار بھوپالی:**

اصل نام اقبال علی فاروقی اور تخلص بیدار ہے۔ تاریخِ پیدائش ۱۹۳۴ء اور جائے پیدائش بدری محل ، چھاؤنی سیہور، بھوپال ہے موصوف کے تین شعری مجموعے ،پہلا ''گھروندے ریت کے''(۱۹۹۹ء) دوسرا ''آئینہ دل''(۲۰۱۰ء) اور تیسرا ''دھوپ اور سایہ''(۲۰۱۷ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ موصوف کو ان کی ادبی خدمات کے لئے کئی بڑے اداروں نے اعزازات سے بھی نوازا ہے جن میں 'کہکشاں ادب بھوپال''ادبی تنظیم ہم قلم' اور 'خوشبو ایجوکیشنل سوسائٹی ،بھوپال کا (آج کا شاعر) 'فکر و آگہی' (بدست گوپی چند نارنگ)'استقبال ایوان 'صدر جمہوریہ (دہلی) وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ نمونہ کلام

خوف،بے چینی ،کسک،ہر لمحہ بڑھتا انتشار
آج کا انسان جیسے عرصۂ محشر میں ہے

مر کر بھی نہ جلنا تھا جن کو وہ زندہ جلائے جاتے ہیں
انسانوں کی لاشوں پر ہر سو کیوں جشن منائے جاتے ہیں

اب جہیز کی لعنت راستے میں حائل ہے
ورنہ اس طرح بوڑھی بچیاں نہیں ہوتیں

منصف ہو تو انصاف دکھا کیوں نہیں دیتے
مجرم کو جرائم کی سزا کیوں نہیں دیتے

شانتی دوت بنے پھرتے ہیں جو دنیا میں
سچ تو یہ ہے کہ وہی باعث شر ہوتے ہیں

کیا پوچھتے ہو روداد ستم،ہر دل ہے حزیں ہر آنکھ نم
بچوں کے شگفتہ جسم یہاں،نیزوں پہ سجائے جاتے ہیں

املاک پر جو وقف کے مختار ہو گئے
بس یہ سمجھ لو صاحب زردار ہو گئے

حاکم کی جی حضوری میں رہتے ہیں رات دن
صد حیف وہ ہی قوم کے معمار ہو گئے

یہ فضائے قتل و غارت کہو تم کہاں نہیں ہے
یہاں غم زدہ سبھی ہیں کوئی شادماں نہیں ہے

**پروفیسر خالد محمود:**

ذی علم شخصیت کے مالک پروفیسر خالد محمود صاحب کا تعلق مردم خیز سرزمیں سروجن (مدھیہ پردیش) سے ہے۔ آپ ولادت ۱۵/جنوری ۱۹۴۸ء ہے۔ موصوف ایک صاحبِ طرز شاعر، پایہ کے ادیب اور محقق کی حیثیت سے بھی اردو ادب کی دنیا میں معروف و مقبول ہیں۔ آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ادبی خدمات کے لئے کئی بڑے اداروں نے آپ کو اعزازات سے بھی سُرخرو کیا ہے۔ پروفیسر خالد محمود صاحب ایک عہد ساز شخصیت ہیں۔ بلخصوص شاعری کے حوالے سے گفتگو کروں تو آپ کے دو شعری مجموعے ''سمندر آشنا''(۱۹۸۲ء)''چراغ حرا''(۲۰۰۱ء)شائع ہو چکے ہیں۔ نمونہ کلام۔

شاید کے مر گیا ہے میرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برا بر کا آدمی

سورج ستارے کوہ و سمندر فلک زمیں
سب ایک کر چکا ہے یہ گز بھر کا آدمی

تہذیبی اقدار سے مہکا بستہ پیچھے چھوٹ گیا
جانے کس وحشت میں گھر کا رشتہ پیچھے چھوٹ گیا

بچے میری انگلی تھامے دھیرے دھیرے چلتے تھے
پھر وہ آگے ڈور گئے میں تنہا پیچھے چھوٹ گیا

کتنی آسانیاں میسر ہیں
کتنا مشکل جہاں میں رہنا ہے

فکر ہر کس بقدر ہمت است
ہم کو ہندوستاں میں رہنا ہے

رخسار و چشم و لب گل و صبہا شفق حنا
دنیا ئے رنگ و بو میں تجارت لہو کی تھی

**وفاؔ صدیقی:**

وفاؔ صدیقی کا تعلق شہر بھوپال سے ہے۔ آپ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر بنیادی طور پر آپ غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کے چار شعری مجموعے جن میں ''تار پیرہن''(۱۹۶۲ء)''نقشِ وفا''(۱۹۹۴ء)''سارے جہاں سے اچھا''(۱۹۹۹ء)''نقش تابندہ''(۲۰۲۱ء)شائع ہو چکے ہیں۔ نمونہ کلام

لٹ رہی ہیں عظمتیں ہر شہر میں ہر گاؤں میں
اس زوال آبرو پر کوئی شرمندہ نہیں
جرس ہے نے صدائے ساربان ہے
یہ کیسے بے حسوں کا کارواں ہے

**منظرؔ بھوپالی:**

عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر منظرؔ بھوپالی کا نام کسی تعارف یہ تشریح کا محتاج نہیں۔ آج ہمارے ملک ہندوستان میں مستقل ہنگامہ آرائیوں، معاشرتی وسیاسی حالات میں تیز تر ہوتی تبدلیاں، معاشی فکر و تردّد تشد، نفرت

،پامال ہوتی اعلیٰ قدریں اور ، فرقہ واریت نے منظر بھوپالی کو بہت متاثر کیا ہے۔ان کی غزلوں کے متعدد اشعار اپنے عہد و معاشرے کے ترجمان قرار دیے جاسکتے ہیں۔ منظر بھوپالی صاحب کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ یہ صدی ہماری ہے (۱۹۹۱ء)

۲۔ لہو رنگ موسم (۱۹۹۴ء)

۳۔ منظر ایک بلندی پر

۴۔ اداس کیوں ہو

۵۔ زندگی

۶۔ لاوا (۲۰۰۱ء)

نمونہ کلام

ہمارے شہر میں انصاف ‘اندھا بھی ہے بہرہ بھی
کوئی سنتا نہیں جب سانحہَ آواز دیتا ہے

اُس کا لہجہ بول رہا ہے خون بہانا باقی ہے
اور ابھی تو شہروں شہروں آگ لگانا با قی ہے

ہے غضب صاحبِ کردار کہے جاتے ہیں
گھر جو توڑیں‘وہی معمار کہیں جاتے ہیں

کبھی وہ روزی کبھی آشیانہ چھین لیتا ہے
جہاں ملتا ہے موقع ‘آب و دانہ چھین لیتا ہے

نمائش کی بڑی عادت ہے اپنے رہنماؤں کو
مدد کرتے ہیں تھوڑی سی بہت احسان رکھتے ہیں

ہمارے شہر میں ہر روز ایک قیامت ہے
یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم

تن پر رہے لباس نہ روٹی ہو پیٹ میں
مہنگائی اِس طریقے سے کم کر رہے ہو تم

یہ اذیت بھی‘ذلت بھی ہے‘ہم پر یہ غم قیامت بھی ہے
جس زمیں کے لئے مر مٹے ‘اس زمیں پر مہاجر ہیں ہم

بھوک ‘مفلسی‘غربت‘خوف‘نفرتیں‘ دہشت
اپنے عہد کی روحیں دوزخوں میں رہی ہیں

لگتا ہے اب خبر نہیں ہے انسانوں کی
دھرم سیاست میں بازار بہت ہے اب کہ

نایاب ہو گئی یہاں پیار کی مٹھاس
ہر اک زبان زہر سے نفرت سے بھر گئی

آج کی دنیا ہے جیسے حشر کا منظر ہے
صرف افرا تفری ہے‘صرف بد حواسی ہے

ہو گیا ہے اپنے پڑوسی کا پڑوسی دشمن
آدمیت بھی یہاں نذر فسادات ہوئی

**ڈاکٹر کیلاس گروسوامیؔ:**

اردو اور ہندجگت کے مقبول و معروف شاعر ڈاکٹر کیلاس گروسوامیؔ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کا تعلق سیہور (بھوپال) کے ایک معزز برہمن گھرانے سے ہے۔ ڈاکٹر کیلاس گروسوامیؔ کو اردو زبان و ادب کی محبت اور شاعری کا فطری ذوق و شوق وراثت میں ملی تھی۔ خوش نصیبی سے معروف شاعر شمیمؔ جے پوری سے مشورہ سخن کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ کے دو شعری مجموعے شائع "تنہا سفر" (۱۹۹۴ء) "درد کی خوشبو" (۲۰۱۱ء) شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف نے اپنے احساسات و جذبات کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز کی کیفیتوں کی ترجمانی بڑے مفکرانہ انداز میں اپنی غزلوں میں کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی کہنے کو کتنی قیمتی ہے
آدمی لیکن بہت سستا لگے

جستجو وہ بھی زندگی کے لئے
زندگی تو محض کھلونا ہے

وقت کٹتا نہیں یوں کہنے کو
زندگی دو گھڑی کا میلا ہے

ظلمتوں کی ضد میں انساں سسکیاں لیتا رہا
ورنہ یوں تو نام ہی کی زندگی باقی رہی

زندگی تجھ سے سمٹنا مری مجبوری ہے
اسی اجل سے بھی لپٹنا میری مجبوری ہے

**واحدؔ انصاری برہانپوری:**

طنز و مزاح کی شاعری کا مقبول نام واحدؔ انصاری برہانپوری ۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''عکسِ غم''(۲۰۲۰ء) میں شائع ہوا۔ ''عکسِ غم'' کی غزلوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی غزلوں میں زندگی کے تجربات و مشاہدات اور عہدِ حاضر میں انسانیت کے زوال کی عکاسی بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

منافقت ہے دلوں میں زباں پر یاری ہے
ہر ایک شخص یہاں جھوٹ کا پجاری ہے

افسوس کر رہے ہیں جو انسانیت کا خون
چہرے پہ ان کی رنگِ ندامت نہیں ذرا

کون اچھا ہے برا کون ہے واعظ نہ بتا
لوگ تو ظرف سے پہچان لیے جاتے ہیں

اے زندگی بتا دے مجھے تونے کیا دیا
مٹی میں میرے خواب کو تونے ملا دیا

میں دور ہو گیا ہوں اپنوں سے اور بھی واحدؔ
دیئے وہ زخم یگانوں نے مجھ کو الفت میں

وقار انہی کی نگاہوں میں میرا کچھ بھی نہیں
لٹا میں جن کے لیے بارہا مروت میں

عہد حاضر میں سرزمین مدھیہ پردیش میں چند نامور شعراء جن میں راحتؔ اندوری صاحب، مظفر حنفی، ڈاکٹر بشیر بدرؔ ، ظفر نسیمی، مقصود نشتری، اخترؔ سعید خاں، پیر محمد فیض خیلیقیؔ، آدرش دوبے وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے مگر افسوس مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان کا جائزہ پیش نہیں کیا جاسکا۔

# کتابیات

**بنیادی ماخذ:**


**مصنف، نام کتاب، ناشر / بائع، سن اشاعت**

قمرؔ گوالیر، کشش، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال،، ۲۰۱۳ء

حبیب انجم دیتیاوی، سوزِ دروں، نبوی آفسیٹ پریس، اندور، ۲۰۰۷ء

وفا صدیقی، نقش تابندہ، عبیدہ پبلیکیشن، بھوپال، ۲۰۲۱ء

شروتؔ زیدی بھوپالی، کتابوں کا سفر، شائن پبلیشرز، بھوپال، ۲۰۲۳ء

بیدارؔ بھوپالی، آئینہ دل، بزم اقبال پبلیکیشنز، بھوپال، ۲۰۱۰ء

بیدارؔ بھوپالی، دھوپ اور سایہ، ائیر پرنٹرس، بھوپال، ۲۰۱۷ء

ڈاکٹر نفیس تقیؔ، خوشبو کے پر کھلے، فاس لیرز پرنٹنگ لیب، بھوپال، ۲۰۱۳ء

منظرؔ بھوپالی، لاوا، ۔۔۔۔، ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر کیلاش گرو سوامیؔ، درد کی خوشبو، اسکائی لارک ہاؤس آف پبلیکیشنز، لکھنؤ، ۲۰۱۴ء

اُتل اجنبیؔ، بروقت، ضیاء الدین پریس، یو، پی، ۲۰۱۰ء

پرمود لال یکتاؔ، یوں ہے، بھارت آفسیٹ، دہلی، ۲۰۱۶ء

اشوک مزاجؔ، غزل نامہ، مرکز ادب۔ بھوپال، ۲۰۰۱ء

اشوک مزاجؔ، میں اشوک ہوں میں مزاج ہوں، شعری اکاڈمی، بھوپال، ۲۰۱۷ء

سبودھ لال ساقیؔ، نمک، عرشیہ پبلیکیشنز دہلی، ۲۰۱۶ء

پروفیسر خالد محمود، شعر چراغ، ایچ۔ ایس۔ پرنٹنگ پریس، دہلی، ۲۰۰۱ء

واحدؔ انصاری برہانپوری، عکسِ غم، سویر پرنٹنگ پریس، برہانپور، ۲۰۲۰ء

# اردو غزل میں شاعر بطور ایک رومانی اجنبی

Dr. Mohamed Saleem Pulsarakath

Associate Professor, Department of Urdu
Farook College, Kozhikode Kerala

## ملخص

غزل میں انسانی احساسات ، جذبات، عشق، روحانیت اور داخلی کرب کو نہایت لطیف اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ غزل کو عام طور پر عشق و محبت کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل کا شاعر ایک گہرے وجودی تجربے سے گزرتا ہے، جہاں عشق صرف جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ جستجو اور روحانی اضطراب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس حالت میں شاعر بطور 'رومانی اجنبی' سامنے آتا ہے۔ ایک ایسا وجود جو دنیا سے محبت رکھتا ہے لیکن دنیا کے مادی، سماجی اور اخلاقی نظام سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔

**کلیدی الفاظ:**

غزل، رومانویت، اجنبیت، **رومانی اجنبی، لامعنویت**، وصلِ محبوب، وجودیت، کولن ولسن، البرٹ کامیو

یہ مقالہ اردو غزل میں رومانی اجنبیت کے تصور کا تخلیقی و تنقید مطالعہ پیش کرتا ہے۔ شاعر جب اپنے زمانے کے تضادات انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں اور اپنی ذات کے الجھنوں سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی تخلیق میں ایک ایسی رومانویت جنم لیتی ہے جو اسے عام انسانی تجربے سے بلند کر کے ایک ماورائی اور وجودی سطح پر لے جاتی ہے۔ میر، غالب ،فانی بدایونی، فیض، ن م راشد، فراز اور جون ایلیا جیسے شعرا کی شاعری میں یہی رومانوی اجنبیت مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ میر کے یہاں یہ اجنبیت عشق اور غم جاناں کے کرب میں ڈھلتی ہے، غالب کے ہاں یہ فکری اور فلسفیانہ تنہائی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ فانی کے ہاں یہ مایوسی اور خود تنقیدی کا استعارہ بن جاتی ہے، جبکہ جون ایلیا کے یہاں یہ وجودی اور لامعنوی تجربے کی شدت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مقالے میں مغربی رومانویت کے اثرات کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی مشرقی روایات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ رومانویت دراصل انسان کی اس داخلی کیفیت کا اظہار ہے جس میں وہ منطق اور اصول کے بجائے احساس، تخیل اور وجدانی تجربے کو ترجیح دیتا ہے۔ مغرب میں کولن ولسن کے پیش کردہ Romantic outsider اور البرٹ کامیو کے Absurdity کے تصورات کو بنیاد بنا کر اس مقالے میں اردو شاعری کی رومانی و فکری تنہائی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کامیو کے مطابق جب انسان اپنی زندگی کی بے معنویت کو دریافت کرتا ہے تو وہ دنیا کے رائج اقدار سے بغاوت کر کے اجنبی بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت اردو غزل کے شاعر کی ہے جو دنیا کے بے حسی بھرے ماحول میں خود کو ایک 'وجودی اجنبی' محسوس کرتا ہے۔

غزل اردو کی مقبول ترین صنفِ شاعری ہے۔ اس میں عموماً عشق کی مختلف کیفیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اردو غزل محض عشق و محبت کے جذبات کی نمائندہ صنفِ سخن نہیں ہے بلکہ یہ انسانی وجود کے گہرے احساسات، داخلی تنہائی اور سماجی کشمکش کی آئینہ دار بھی ہے۔ شاعر جب اپنے زمانے کے تضادات، انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں اور خود اپنی ذات کے بحران سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے تخلیقی شعور میں رومانویت ایک انوکھی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی رومانویت اسے معاشرتی سطح سے ہٹا کر ایک رومانی اور تخیلی سطح پر لے جاتی ہے جہاں وہ خود کو 'اجنبی' محسوس کرتا ہے ۔ایک ایسا فرد جو دنیا سے محبت بھی رکھتا ہے، مگر اس دنیا میں پوری طرح شامل نہیں ہو پاتا۔ اردو غزل کا شاعر، خاص طور پر میر، غالب، فانی، یگانہ اور جدید عہد کے شعرا جیسے فیض، راشد، فراز اور جون ایلیا، سبھی کسی نہ کسی سطح پر اس 'رومانی اجنبیت' کے مظہر ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ اردو غزل میں اسی 'شاعر بطورِ رومانی اجنبی' کے تصور کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کرتا ہے۔

اردو غزل کی ابتدا میں اس کا دائرہ کار بہت ہی محدود تھا۔ حسن و عشق، وصل و فراق، اور صوفیانہ واردات تک۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل نے انسانی تجربے کے تمام رنگوں کو اپنے اندر شامل کر دیا۔ غزل کا شاعر کبھی محبوب سے بات کرتا ہے، کبھی خدا سے، اور کبھی اپنی ذات کے گہرے اندرون سے۔ یہی کثرتِ معنی غزل کو آفاقی صنف بناتی ہے۔

جب ہم 'رومانویت' کا ذکر کرتے ہیں تو ذہن میں سب سے پہلے احساس، تخیل، انفرادیت، اور حُسنِ فطرت کے تصورات آتے ہیں۔ رومانویت دراصل ایک ایسی جمالیاتی تحریک ہے جو انسان کو منطق، اصول اور عقل کے بجائے دل، احساس اور وجدانی تجربے کی طرف لے جاتی ہے۔ مغرب میں اس کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہوا، جب انسان نے مادیت کے غلبے کے بجائے ایک باطنی اور جذباتی دنیا کی تلاش کرنا شروع کی۔ اردو ادب میں رومانویت کا یہ تصور

براہِ راست مغرب سے مستعار نہیں، بلکہ اس کے جڑیں مشرقی تصوف اور عشقِ حقیقی کے روایتی تصورات میں پیوست ہیں۔

اردو غزل کا شاعر ہمیشہ کسی نہ کسی سطح پر 'اجنبی' رہا ہے۔ رومانی شاعر تصور میں ایک عینی دنیا کی یعنی وصلِ محبوب کی یاد میں رہتا ہے۔ محبوب کی طرف جانے کی بے حد اور شدید خواہش بھی اسے تصادم میں پھنسا دیتا ہے۔ اسی لیے رومانی شاعر اس دنیا کو ایک بدیس قرار دیتا ہے۔ وہ اس زمین میں ایک دائمی تارکِ وطن ہے۔ اجنبیوں کے بیچ میں رہنا اس کی قسمت ہے۔ اس کا وطن اور گھر (وصلِ محبوب) دور دراز مقام میں ہے۔ وہ گھر کی تلاش اس یقینی کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ ناقابلِ حصول ہے۔ یہ حقیقت اسے تنہائی پسند، بے یار و مددگار اور غمگین بنا دیتی ہے۔ یہ غمگین شخص اپنے اطراف کے لوگوں سے جھگڑا کرتا ہے، منہ پھیرتا ہے۔ ایک سماجی اچھوت اور بے یار ہو کر اجنبی (outsider) بن کر خود زندگی اور شاعری میں سوالیہ علامت بن کر ابھرتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتا ہے مگر اس سے مطمئن نہیں۔ اس کی زبان نرم، لہجہ عاشقانہ مگر دل زخمی اور وجود بے چین۔ وہ سماج کے المیے کو ذاتی المیے کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت رومانوی اجنبیت کہلاتی ہے۔ میر کے یہاں یہ اجنبیت غمِ جاناں اور غمِ دنیا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، غالب کے ہاں یہ فکری اور فلسفیانہ تنہائی میں ڈھل جاتی ہے، اور جدید شعرا کے یہاں یہ سیاسی، وجودی اور نفسیاتی صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔

جذبہء عشق میر کے نزدیک انسان کی ایک ازلی و خلقی خواہش ہے جو انسان کو ناگزر ہلاکت کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ محبوب کی نزاکت، حسن اور کشش عاشق کے دل کو لبھاتی ہے۔ مگر وہ محبوب کی رسائی سے باہر ہے اور یہاں عاشق ایک المیہ کردار بن جاتا ہے اور وہ خود اذیت، وحشت، کرب اور انتشار کے مراحل سے گزرتا ہے۔ محبوب اس

کے یہاں زندگی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔اس کے یہاں ،راہِ عشق پر چلنے کا مطلب ہے ہر قدم پر فریادی ہونا، مصیبتیں جھیلتے رہنا اور ٹھوکریں کھانا۔

دوڑے بہت و لیکن مطلب کو کون پہنچا　　آئندہ تو بھی ہم سا ہو کر شکستہ پارہ

گزر سر سے تب عشق کی راہ چل　　ہر گام یاں ایک خطرہ گاہ ہے

تصور و تخیل فریب میں مبتلا کر دیتی ہے اور ہم کو ورغلا کر مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے ادراک ہوتے ہی شاعر دائمی و ابدی حسن کی پرستش میں سکونِ قلب ڈھونڈتا ہے۔اردو غزل گو شعرا میں اکثر عینی و خیالی محبوب کو اپنا مرکزِ خیال بنا کر ایک تصوری دنیا کی تخلیق کا خواب دیکھتے آرہے ہیں۔

'محبوب' ایک خاص نظام کی علامت ہے۔اسی لیے اکثر اوقات اس رومانی عشق کو شکست و بربادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ دراصل پیار ایک انقلابی تصور ہے۔جو شاعر رومانی اجنبی(romantic outsider)ہوتا ہے،وہ غالباً ایک باغی ہی نکلتا ہے۔مذکورہ بالا یہ نکتہ رومانی شاعری کی سیاسی قدروں میں شامل ہے۔ضروری نہیں ہے کہ شاعر سیاست میں اپنے اظہارِ خیال کرے۔ فیض احمد فیض کی غزلیں اس کے سب سے عمدہ مثال ہیں۔

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا　　رنگ لب و خار صنم خار صنم کرتے رہیں گے

فیض

ٹپکے گا لہو اور میرے دیدہء تر سے　　دھڑکے گا دل خانہ خراب اور زیادہ

مجاز

یہی صورت ہمیں الگ طریقے سے کلاسکی شاعری میں میر و غالب میں بھی نظر آتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

رومانویت ایک ایسی تحریک ہے جس نے فرد کو مرکزی حیثیت دی۔ عقل کے بجائے احساس، منطق کے بجائے وجدان، اور معاشرتی اصولوں کے بجائے انفرادی آزادی کو ترجیح دی گئی۔ اس کے نمایاں عناصر میں تنہائی، خواب، تخیل، فطرت سے قربت، ماضی سے محبت، اور داخلی اضطراب شامل ہیں۔

بقول محمد حسن:

'رومانویت میں ہمیں اقبال کی اصطلاح میں خودی کی یاد دلاتی ہے جو اطاعت نفس سے آشنا نہیں اور اسی لیے رومانویت کا جہاں فرد کا جہاں ہے جماعت کی حثیت یا تو ضمنی ہے یا سرے سے مفقود ہے۔'

(اردو ادب میں رومانوی تحریک، محمد حسن، ص ۱۶)

اردو غزل چونکہ بنیادی طور پر احساس اور وجدانی تجربے کی شاعری ہے، اس لیے رومانویت اس کی فطرت میں موجود ہے۔ شاعر جب عشق کے تجربے کو بیان کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے اندر کے خالی پن، اپنی ذات کے تضاد، اور دنیا سے اپنی بیگانگی کو لفظوں میں ڈھال رہا ہوتا ہے۔

غزل کے خلوت نشین اور افسردہ خاطر ہیرو موجودہ معاشرے کے باہر ہیں۔ وہ اخلاقیات اور تسلیم شدہ اقدار کا انکار کرتے ہوئے محبوب کے محل کے باہر گلی کوچوں میں بھٹکا پھرتا ہے اور ہر طرح کے سکون و آرام سے اپنے آپ کو محروم رکھتا ہے۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرامیدہ ہوں　　میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

غزل گو شاعر کبھی گلی کوچوں کا آوارہ شاعر ہے۔ وہ دربدر کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ گھومنے پھرنے والا ہے۔ ٹیگور نے ارشاد فرمایا ہے کہ 'میں دور دراز مقامات کا پیاسا ہوں'۔ اسی طرح یہ دائمی تشنہ ء آوارگی جو تمام رومانی شعرا کا مزاجی وصف ہے، وہ غزل گو شعرا کی بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔

خواب کی یہ تصوراتی دنیا اور اس سے متعلق محلات اور گلی کوچے، یہ سب غزل گو شاعر کے تخیل سے پرے واقع مقامات میں ہے۔ اسی لیے اس دنیا کی اصلیت سے انکار کر دیتا ہے اور دنیا اسے بھی۔ اس لیے غزل گو شعرا اجنبی (outsider) ہیں، دنیا کی نگاہ میں اور خود اپنی نگاہ میں بھی۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کے یہ خیال ابھرتا ہے کہ اپنا گمشدہ گھر اور گلی کوچے اور اپنے ہر دل عزیز اشیاء پا سکتا ہے۔ لیکن اس مہم میں وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس منزل مقصود تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ اس کے خیال میں پیار و عشق کا راستہ ہے۔ لیکن محبوب کے گھر کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے، محبوب کے ہاتھوں اسے ہمیشہ بے وفائی ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بے وفائی کی تاب نہ لا کر وہ ایک مجذوب کی طرح بڑبڑاتے ہوئے ویرانے میں پناہ لیتا ہے۔ بالآخر سکونِ قلب کی تلاش میں شاعری کے مے خانے کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔

آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں  جا گہ نہیں شہر میں تجھ کو مگر کہیں

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک  مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

رومانیت پسند کے معنی یاسیت زدہ اجنبی کے ہیں۔ مغربی رومانیت سے ایک حد تک اردو غزل کو گہرا تعلق ہے۔ رومان پسند شاعر زمان و مکان کے علاقے سے بالاتر ہے۔ کیونکہ رومانی تحریک ایک آفاقی تحریک ہے جس کے اطلاق مغرب و مشرق دونوں شعرا پر ہو سکتا ہے۔

یہ دعوی قابلِ اعتبار ہے کہ رومانیت کی جدید شکل جدیدیت (Modernism) ہے اور انگریزی میں جدیدیت کے دور میں outsider کا تصور بالفاظِ دیگر وجودیت ( existentialism) کی نسبت کے پیشِ نظر ادب کا مرکزی موضوع بن گیا تھا۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے Colin Wilson نے Romantic outsider کا ایک نیا تصور پیش کیا ہے۔ البرٹ کامیو (Albert Camus) کے پیش کردہ outsider سے متعلق کامیو کی یہ تعریف The Myth of Sisyphus میں مذکور ہے۔ اس میں کامیوں نے لا معنویت (absurdity) کا تصور پیش کیا ہے۔ جو شخص اپنی زندگی کی لا معنویت یا بے معنویت کا ادراک کرتا ہے، وہ اخلاقی اقدار کی تردید کرنے پر تل جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ اجنبی بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کامیوں نے لا معنویت کی تعریف اس طرح کی ہے کہ عموماً بے معنی زندگی کو با مقصد اور با معنی بنانے کی کوشش کے باوجود وہ ہار جاتا ہے۔ تو اس پر یہ حقیقت پوری شدت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی دراصل بے معنی ہے۔ اس کو با معنی بنانے کی کوشش بے کار ہے۔ مثال کے طور پر کامیو نے ایک کہانی سنائی ہے۔ 'ایک پاگل bath tub میں مچھلی پکڑ رہا تھا تو ایک آدمی نے جو سالم العقل تھا، مذاق سے اس سے پوچھا۔ کانٹے میں کوئی مچھلی اٹک گئی ہے کیا؟ تو پاگل نے جواب دیا۔ بے وقوف، یہ ایک bath tub ہے۔ اس میں مچھلی کہاں ہوتی ہے؟

(The myth of Sisyphus and other essays by Albert Camus PP 81-82)

بات ٹیب زندگی کی علامت ہے اور مچھلی سکھ کی۔ کامیو کے احساسِ لا معنویت Sense of Absurdity کا یہ مفہوم ہے۔ اس احساس سے لا معنویت نے ان کو زندگی کے حقائق سے گریز کرنے، آوارہ گردی یا عزلت نشینی اختیار کرنے والا، وجودیت کا شعور رکھنے والا اجنبی existential outsider میں تبدیل کر دیا ہے۔

فانی بدایونی کے یہاں 'رومانی اجنبیت' دراصل مایوسی اور خود تنقیدی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔وہ زندگی کے خواب میں الجھا ہوا ہے، مگر اس خواب سے نکل بھی نہیں سکتا۔وہ مایوسی میں ڈوبا ہے، مگر امید کی جھلک اسے مرنے نہیں دیتی۔وہ دنیا سے وابستہ بھی ہے، اور دنیا سے جدا بھی۔یہی وہ کشمکش ہے جو فانی کو اردو غزل کے دوسرے شعرا سے ممتاز بناتی ہے۔اس کی رومانویت کا حسن اسی اجنبیت میں پوشیدہ ہے۔ایک ایسی اجنبیت جو عشق اور وجود دونوں کے خلا میں سانس لیتی ہے۔مثال

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ایک اور شعر دیکھیے

ناامیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر　　آس کہتی ہے ٹھہر، خط کا جواب آنے کو ہے

یہ اشعار فانی کے تخیل میں زندگی، امید اور مایوسی کے باہمی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔یہاں شاعر کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ایک طرف ناامیدی ہے جو موت کو پکارتی ہے، اور دوسری طرف آس (امید) ہے جو زندگی کو تھامے رکھتی ہے۔یہ تضاد فانی کے اندرونی رومانی المیے کا جوہر ہے۔وہ جینا چاہتا ہے مگر جینے کی کوئی وجہ نہیں۔وہ مرنا چاہتا ہے مگر مرنے سے پہلے کسی خط، کسی پیغام یعنی کسی رشتے کے آنے کی امید باقی ہے۔یہاں 'خط' محض محبوب کا پیغام نہیں بلکہ زندگی کا استعارہ ہے۔فانی کے نزدیک اجنبیت اسی انتظار کا دوسرا نام ہے ۔ایک ایسا انتظار جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

جون ایلیا کے ہاں رومانویت اپنے شدید مرحلے میں نظر آتی ہے۔وہ مکمل طور پر وجودی (Existential) شاعر ہیں۔ان کے ہاں محبت، وقت، ذات، موت سب باہمی رشتوں کے باوجود بے معنی محسوس ہوتے ہیں۔یہی بے معنویت ان کی اجنبیت ہیں۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس　　خود کو تباہ کر لیا اور ملال کیا

یہ شعر محض افسوس نہیں بلکہ فلسفہ ہیں۔ جون ایلیا کے نزدیک تباہی بھی ایک طرح کا حسن ہے۔ وہ اپنی تنہائی سے انکار نہیں کرتا بلکہ اسے گلے لگاتا ہے۔

وصل سے انتظار اچھا تھا  جان لیوا تھیں خواہش ورنہ

یہاں 'انتظار' صرف محبوب کا نہیں بلکہ ایک روحانی اور وجودی کیفیت کا استعارہ ہے۔ شاعر 'وصال' سے گریز کرتا ہے۔ کیوں کہ تکمیل کا مطلب فنا ہے۔ شاعر کے خیال میں محبت کا حسن اس کی ناتمامی میں پوشیدہ ہے۔

الغرض اردو غزل میں شاعر بطور رومانی اجنبی ایک پائیدار اور ہمہ گیر تصور ہے۔ میر سے جون ایلیا تک کی شاعری کی داخلی تنہائی، عشق کی ناکامی اور وجودی سوالات نے اس تصور کو مختلف رنگ دیے۔ رومانویت نے شاعر کو احساس، درد اور تخیل کی گہرائی عطا کی، جبکہ سماجی پابندیوں سے آزاد کر کے ایک آفاقی انسان بنا دیا۔ یہی اجنبیت اردو غزل کو اس کی تہذیبی اور فکری وسعت عطا کرتی ہے۔

حوالہ جات:


۱۔ شعر شور انگیز، شمس الرحمن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۸

۲۔ اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۸

۳۔ جون ایلیا خوش گزراں گزر گئے، نسیم سید، اکادمی بازیافت، کراچی ۲۰۱۱

۴۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک، ڈاکٹر محمد حسن، شعبہء اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۵

5. The myth of Sisyphus and Other Essays by Alber Camus Translated from the French by Justin O Brien 1995

***




# مجموعہ فصیلیں از انیس ناگی: علامتی واستعاراتی مطالعہ

ڈاکٹر فضیلت بانو

پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلوشپ

پروفیسر ڈاکٹر حمیرا اشفاق
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

**Abstract:**
This study presents a symbolic and metaphorical analysis of Faseelein, a collection of novelettes by Anis Nagi, a prominent figure in modern Urdu fiction. The research explores how symbolism and metaphor function as central narrative strategies through which Anis Nagi articulates existential anxiety, psychological fragmentation, social alienation, and the crisis of modern human consciousness. The term Faseelein (Walls/Barriers) itself operates as a dominant metaphor, representing not only physical divisions but also ideological, emotional, and psychological boundaries that isolate individuals within modern society.
The study examines selected novelettes from the collection to highlight the multilayered symbolic structures embedded in characters, settings, and narrative techniques.
Anis Nagi employs abstract imagery, spatial metaphors, and fragmented narrative forms to reflect the inner turmoil of his characters and the broader socio-cultural disintegration of the contemporary world. The symbolic use of space, silence, confinement, and repetition
underscores themes of identity loss, existential solitude, and resistance against imposed social structures.
By applying interpretative and textual analysis methods, this research situates Faseelein within the broader framework of modernist and postmodernist Urdu fiction. The study argues that Anis Nagi's symbolic and metaphorical language not only deepens the aesthetic dimension of the text but also transforms the novelettes into a powerful critique of modern civilization. Ultimately, the research demonstrates that Faseelein represents a significant literary document that captures the complex psychological and symbolic realities of modern human experience.

**Key words:**
Anis Nagi, Faseelein, Urdu Novelette, Symbolism, Metaphor, Modern Urdu Fiction, Existentialism, Alienation, Psychological Conflict, Interpretative

Analysis.

اردو ادب میں انیس ناگی (۱۹۳۹ء۔ ۲۰۱۰ء) ایک معتبر اور منفرد شناخت کے حامل ادیب، نقاد، شاعر، مترجم، افسانہ نگار اور ناول نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کا اصل نام انیس احمد تھا مگر ادبی دنیا میں وہ انیس ناگی کے نام سے معروف ہوئے۔ انیس ناگی کا تعلق ایک علمی ادبی گھرانے سے تھا۔ وہ اردو ادب کی مختلف جہتوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انیس ناگی کا نام ایک منفرد، علامتی اور فکری ناول نگار کے طور پر لیا جاتا ہے وہ صرف ناول نگار ہی نہیں، بلکہ شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور متزجم بھی تھے۔ ان کا تعلق ملک کے ادبی حلقوں سے رہا اور انہیں جدیدیت کا اہم نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے فن میں علامت نگاری، استعاراتی، تجریدیت اور نفسیاتی گہرائی کے عناصر نمایاں ہیں۔

علامتی ادب کے حوالے سے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں: :

""تخلیقی عمل کے باعث اشیا اپنی واقعاتی سطح سے بلند ہو کر استعاراتی
اور علامتی سطح کی حامل ہو جاتی ہیں استعارے اور علامتیں بالاتر
صداقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں"۔[۱]

۔انیس ناگی نے ادب کی مختلف اصناف میں اظہار ذات کیا ہے۔ ان کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ وہ جدید انسان کی تنہائی، شکست خوردگی، داخلی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کو جس فنکاری سے بیان کرتے ہیں وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز مقام دیتا ہے۔ انیس ناگی کی ناول نگاری کو اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ جدید اردو ناول کے ان فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے فن کو فکر اور حقیقت کے ساتھ جوڑ کر نئی راہیں نکالیں۔ ان کی تخلیقات قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انیس ناگی کے ناول اردو افسانے کی روایت میں ایک مستقل حوالہ ثابت ہوں گے۔

انیس ناگی ترقی پسند تحریک کے بعد سامنے آنے والی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ناول کو محض بیانیہ یا رومانوی کیفیت کا اظہار نہیں بلکہ انسان اور سماج کی پیچیدہ، نفسیاتی، تہذیبی اور فکری جہتوں کو بیان کرنے کا وسیلہ بنایا۔ ان کے ہاں جدیدیت کی فضا بھی ہے اور حقیقت پسندی کا عکس بھی یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ناول کے جدید رجحانات کو آگے بڑھانے والے تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

انیس ناگی کے ناولوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک ملتی ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ مگر تہہ دار ہے۔ وہ عام انسان کی داخلی کشمکش اور خارجی مسائل کو ایک علامتی اور تجزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہین مفتی ڈاکٹر ضیاالحسن کے حوالے سے انیس ناگی کے ادبی تغیر کے بارے میں لکھتی ہیں::

""انیس ادب میں حرکت اور تغیر کے قائل ہیں۔ ان کا نقطہ نظر

یہ ہے کہ زندگی میں آنے والی تبدیلیاں ادب پر اثر انداز ہوتی
ہیں۔ جس کی وجہ سے ادب بھی موضوعاتی اور فنی دونوں پہلوں
سے تبدیل ہوتا ہے"۔۲؎

اردو ادب کا منظر نامہ مختلف ادبی تحریکات، رجحانات اور شخصیات کی موجودگی سے متحرک اور متنوع رہا ہے۔ بیسویں صدی کا نصف آخر اردو ناول نگاری کے میدان میں ایک ایسی تبدیلی کا دور ہے جس میں علامتی، وجودی اور تجریدی رجحانات نے واضح طور پر اپنی جگہ بنائی ہے۔ اس دور میں فرد کی داخلی کیفیت، ذہنی دباؤ، وجودی اضطراب اور تنہائی جیسے موضوعات ادبی تخلیقات کا محور بنے۔

انیس ناگی بھی اسی فکری تناظر کے اہم نمائندہ ہیں۔ ان کا علامتی اسلوب نہ صرف روایتی بیانیے سے مختلف ہے بلکہ اس میں فکر و فن کا ایک عمیق امتزاج بھی ملتا ہے۔ ان کے ہاں کہانی محض واقعہ نہیں بلکہ ایک تجربہ، ایک کیفیت اور ایک علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اردو ادب کی جدید تاریخ میں انیس ناگی ایک ایسے ادیب، شاعر، نقاد اور ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جنہوں نے ادب کو صرف اظہار ذات یا تفنن طبع تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے فکر و شعور کی بیداری کا ذریعہ بنایا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ادب کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے والے تخلیق کار ہیں۔ بقول ڈاکٹر سجاد باقر رضوی:

""ہر شاعر اور تخلیقی فن کار خواہ اس کا تعلق کسی عہد سے ہو، اپنے تخلیقی
عمل کی نوعیت اور تصورات کو استعاروں اور علامتوں میں ظاہر
کرتا ہے"۔۳؎

اردو ناول بیسویں صدی کی ایک اہم ادبی صنف ہے جو ابتدا میں سادہ بیانیے، سماجی اصلاح اور رومانویت پر مبنی تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں علامتی، تجریدی، نفسیاتی اور جدید اسلوب کا اضافہ ہوا۔ سعادت حسن منٹو، بیدی، کرشن چندر، عبداللہ حسین، انتظار حسین، اشفاق احمد اور احمد ندیم قاسمی جیسے نثر نگاروں نے افسانے، ناولٹ اور ناول کی شکل و صورت کو بدل دیا۔ انیس ناگی اسی جدید دور کے ناول نگار ہیں جنہوں نے "فصیلیں" جیسا ناولٹ کا مجموعہ لکھ کر اردو ناول نگاری میں علامتی اور نفسیاتی رنگ بھر دیے۔ ان کا جدید اسلوب قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اردو ادب میں ناول نگاری ایک طویل اور ارتقائی سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو ناول نگاری میں حقیقت نگاری کا رجحان غالب رہا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں علامتی اور تعبیری رجحانات نے جنم لیا۔ انیس ناگی کا شمار ان اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ناول کو علامتی جہت عطا کی۔ ان کے نثری اسلوب میں انسان کے باطنی کرب، ذہنی پیچیدگی اور داخلی تجر

بات کی عکاسی ملتی ہے۔ فصیلیں انیس ناگی کا ایک علامتی، تہہ دار اور نفسیاتی رنگ لئے ہوئے ناولٹ کا مجموعہ ہے۔ ان کے ناولٹ کے اس مجموعے میں ان کا فکر و فن، علامتیت، نفسیاتی جہات اور انسانی رویوں کی بڑی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

ادب انسانی احساسات، تجربات اور مشاہدات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ناول نثری اصناف ادب میں ایک اہم صنف ہے۔ ناول کی صنف اپنے محدود مگر گہرے اور پختہا سلوب کے ذریعے فکری اور جذباتی طور پر قاری کو جھنجھوڑنے اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی میں ناولٹ اور ناول کی صنف ارتقائی مراحل طے کرتی رہی اور ساتھ ساتھ ناول نگاری نے نفسیاتی، تجریدی اور علامتی جہتوں میں بھی نئی راہیں کھولیں۔ تجریدی اور علامتی رجحانات میں انیس ناگی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

## ''فصیلیں'' چار ناولٹس کا مجموعہ

انیس ناگی کے نثری مجموعوں میں ''فصیلیں'' خاص طور پر اہم ہے جس میں چار ناولٹ کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے انسانی رشتوں، سماجی تضادات اور نفسیاتی الجھنوں کو کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ فصیلیں انیس ناگی کا ناولٹ کا ایک اہم مجموعہ ہے جو ۱۹۷۰ء کے بعد کے اردو ادب میں جدید طرز احساس کا آئینہ دار ہے۔ اس مجموعے میں شامل ناولٹ ظاہری واقعات سے زیادہ داخلی کیفیات، ذہنی تناؤ، خوابوں کی تعبیر، خوف اور وجودی سوالات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس مجموعے کا نام عنوان ''فصیلیں'' بذات خود ایک علامت ہے۔ فصیلیں ایسی دیواریں جو انسان کو دوسروں سے جدا کرتی ہیں، جنہیں وہ سماجی، نفسیاتی یا روحانی سطح پر محسوس کرتا ہے۔ ان دیواروں کے پیچھے قید انسان خود اپنے آپ سے بھی ناآشنا ہو جاتا ہے ناگی ان دیواروں کو نہ صرف ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے چھپی انسانیت کی چیخ کو بھی زبان دیتے ہیں۔

انیس ناگی کا ناولٹ کا مجموعہ فصیلیں جدید اردو ناول نگاری میں ایک منفرد اور گہری فکری کاوش ہے جس میں فرد کی تنہائی، وجودی بحران، خواب اور اور حقیقت کی آمیزش اور علامتی اظہار کی بھرپور صورتیں ملتی ہیں۔ ان ناولٹس کا مطالعہ صرف ظاہری معنوں میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی تہہ در تہہ ساخت کو علامتی، استعاراتی، تعبیری اور تجزیاتی انداز میں بھی سمجھنا ناگزیر ہے۔

### ناولٹ ''قلعہ''

قلعہ انیس ناگی کا ایک گہرا علامتی ناولٹ ہے جس میں قلعہ محض ایک دفاعی عمارت نہیں بلکہ طاقت کے جبر، اقتدار کی نفسیات اور افراد کے اندر موجود خوف اور داخلی محاصرے کی ایک جامع علامت ہے۔ ناولٹ میں قلعہ ایک ایسی جگہ ہے جو بظاہر تحفظ فراہم کرتی ہے مگر درحقیقت قید خانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انیس ناگی ایک جگہ لکھتے ہیں::

"قلعے کی دیواریں اونچی تھیں، مگر ان کے سائے اس سے

بھی زیادہ بلند تھے۔ اس کے گنبد اور مینار جھکنے لگے ہیں
اس کی چھتوں میں نصب آئینے بے آب ہو چکے ہیں اس
کی دوسری منزل کو جاتی ہوئی دو سیڑھیاں آمد و رفت کی
کثرت سے بوڑھی ہڈیوں کی طرح نوکیلی ہو چکی ہیں۔۔ اس
کی چھت پر ہزاروں نفوس کے قدموں کا بوجھ ہے۔ اس کے
باوجود یہ عمارت منہدم نہیں ہوتی۔ لوگ اسے قلعہ کیوں کہتے
اس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں۔"[۴]

قلعے کے سائے دراصل طاقت کا وہ خوف ہیں جو انسان کے شعور پر حاوی ہو جاتا ہے۔ علامتی اور استعاراتی سطح پر قلعہ ریاستی جبر، آمرانہ نظام اور مقتدر اداروں کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ قلعے میں رہنے والے کردار باہر کی دنیا سے کٹے ہوئے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ طاقت خود کو عوام سے الگ کر لیتی ہے۔ یہ ناولٹ فوکو کے پاور سٹرکچر کے تصور سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے، جہاں طاقت حفاظت کے نام پر نگرانی اور قید پیدا کرتی ہے۔

## ناولٹ "چوہوں کی کہانی"

"چوہوں کی کہانی" ایک نہایت پیچیدہ اور چونکا دینے والا علامتی ناولٹ ہے۔ جہاں چوہے محض جانور نہیں بلکہ اخلاقی بحران، سماجی گندگی، زوال اور خوف کے پھلاؤ کی علامت ہے۔ انیس ناگی لکھتے ہیں:

"جب میں نے ان چوہوں کو دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے
کچھ کراہت بھی آئی، یہ چوہے مجھے چال ڈھال میں کچھ سست لگتے
تھے۔ ان چوہوں کو دیکھ کر ایک راہ گیر سے ان کی موجودگی کے بارے
پوچھا۔۔ چوہے نشانی ہیں کہ جہاں اناج کم نہیں ہو گا، یہ پرماتما نے
بھیجے ہیں۔"[۵]

اس ناولٹ کی علامتیت جدید سماج کی اس حالت سے جڑی ہوئی ہے جہاں خوف وبا کی طرح پھیلتا ہے، افواہیں حقیقت بن جاتی ہیں اور انسان اپنی ہی تخلیق کردہ دہشت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس ناولٹ میں چوہے لاشعوری خوف کی نمائندگی کرتے ہیں۔

## ناولٹ "کیمپ"::

کیمپ جدید دنیا کے بے گھر انسان کا استعارہ ہے، یہ کیمپ پناہ گاہ ہوتا ہے مگر گھر نہیں اس ناولٹ میں کیمپ عارضی ہے مگر مستقل ہو چکا ہے جو جدید مہاجر، پناہ گزین اور بے شناخت انسان کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں کیمپ کی علامت سیاسی جبر، ہجرت اور شناخت کے بحران سے جڑی ہوئی ہے۔ اس ناولٹ کو تقسیم ہند، فلسطین اور جدید جنگی حالات کے تناظر میں پڑھا جاسکتا ہے۔ انیس ناگی کے کسی بھی ناولٹ کو کسی ایک واقعے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں بھی کیمپ عارضی پن کی علامت ہے جو جدید انسان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے۔

""اس بے یقین صورت حال کے پیش نظر کیمپ کا بنیادی ڈھانچہ کس قدر
مضحکہ خیز تھا۔ میجر قربان کا اصل دفتر کیمپ کے اندر تھا جہاں کوئی ٹیلیفون
یا وائرلیس نہیں تھا۔۔ کیمپ سے چھ کلو میٹر دور دریا کے کنارے ریسٹ
ہاؤس میں ٹیلیفون لگا ہوا تھا وہ بھی اپنی مرضی سے چلتا تھا کیمپ انچارج
میجر قربان کو اپنی رہائش گاہ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس نے ریسٹ
ہاؤس میں اپنا کیمپ آفس بنایا ہوا تھا۔۔ اس کا اپنا کوئی گھر بار نہیں تھا
۔ اس نے ایک خانہ بدوش کی طرح زندگی بسر کرنا قبول کر لی تھی"۔[۶]

انیس ناگی کا ناولٹ کیمپ اردو اب میں علامتی ناول نگاری کی ایک قابل ذکر مثال ہے ان کے مجموعے فصیلیں میں شامل ناولٹ کیمپ نہ صرف فنی پختگی کا مظہر ہے بلکہ اس میں موضوعات کی گہرائی، ساخت کی پیچیدگی اور زبان و بیان کی جدت نمایاں ہے۔ یہ مجموعہ مختلف انسانی رویوں، داخلی تناؤ اور سماجی نفسیات کی علامتی عکاسی کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

""اصل بات یہ کہ آپ نے کیمپ میں اور اس سے باہر چوکیاں بٹھادی
ہیں، ہمارا سارا مال اسی راستے سے آتا ہے۔ مہاجر غریب لوگ ہیں
انہیں روٹی کپڑا چاہئے، ہمارے لیے تھوڑا بہت کام کرتا ہے آپ مہربانی
کریں۔[۷]

## ناولٹ "ایک گرم موسم کی کہانی"

یہ ناولٹ موسم کی علامت کے ذریعے انسانی نفسیات، گھٹن، خواہش اور داخلی تپش کو بیان کرتا ہے۔ گرم موسم جو ذہنی گھٹن، دبی ہوئی خواہشات اور داخلی اضطراب اور بے چینی کا استعارہ ہے۔ انسانی فطرت کی عمدہ عکاسی کی بدولت یہ ناولٹ علامت نگاری کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔

(۸) "گرمی صرف موسم میں نہیں تھی، ہمارے لہجوں میں بھی اتر آئی تھی"

اس ناولٹ میں جنسی و جذباتی جبر، سماجی منافقت اور داخلی انتشار نمایاں ہوتا ہے۔ گرمیہاں اس دباؤ کی علامت ہے جو انسان کو اندر ہی اندر جلا دیتا ہے مگر وہ چیخ نہیں سکتا، اپنی ذہنی کیفیت اور احساسات کو دبا کر گھٹن اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے یہ ناولٹ جدید شہری زندگی کا نہایت واضح علامتی بیان ہے جو اپنے اندر وسیع علامتیت کو سموئے ہوئے ہے۔

""گرمی اس قدر تھی کہ سانس لینا بھی بوجھ لگتا تھا، جیسے فضا نے ہمیں اپنے اندر قید کر لیا ہو"۔۹

ایک گرم موسم کی کہانی انیس ناگی کے علامتی فکشن میں تہذیبی اور نفسیاتی مطالعے کی ایک اہم مثال ہے۔ یہ ناولٹ غیر مرئی فصیلوں، گھٹن، جمود اور بے معنویت کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے اس ناولٹ کی فنی اور فکری کامیابی یہ ہے کہ یہ قاری کو اپنے عہد کی فکری اور روحانی کیفیت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

انیس ناگی کے چاروں ناولٹ مل کر ایک بڑی علامتی ساخت تشکیل دیتے ہیں۔ فصیلیں کا مجموعہ عصر حاضر کے انسان کی محصور زندگی کی مختلف صورتیں پیش کرتا ہے۔ انیس ناگی کے یہ چاروں ناولٹ علامتی سطح پر جدید اردو فکشن کا نہایت اہم سرمایہ ہیں۔ ہر ناولٹ ایک الگ علامتی جہان رکھتا ہے۔ مگر سب مل کر ایک ہی چیز واضح کرتے ہیں کہ کیا آج کا انسان واقعی آزاد ہے یا محض مختلف فصیلوں میں قید ہے

انیس ناگی کا ناولٹ کا مجموعہ "فصیلیں" ان کے فکری ارتقا اور فنی اظہار کا نچوڑ ہے۔ اس مجموعے میں پیش کیے گئے کردار، فضا، مکالمے اور اسلوب سب کچھ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مصنف قاری کو محض ظاہری سطح پر متاثر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسے ایک داخلی اور شعوری سفر پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔

ناولٹ کا مجموعہ "فصیلیں" انیس ناگی کے اس فکری سفر کی علامت ہے جو جدید انسان کی تنہائی، کرب، بے ہمتی اور نفسیاتی الجھنوں سے عبارت ہے۔ اس مجموعے میں شامل ناولٹ واقعات کی بجائے کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور قاری کو ایک اجنبی لیکن مانوس دنیا میں لے جاتے ہیں۔ افسانوں کے عنوانات، کرداروں کے نام، فضا کا ماحول اور علامتی زبان اس بات کی گواہ ہے کہ محض قصے نہیں بلکہ ایک ایسے تجربے کی تشکیل ہے جو انسانی شعور کی تہہ میں اتارتا ہے۔ "فصیلیں" دراصل ان دیواروں کا استعارہ ہے جو انسان نے خود اپنے ارد گرد کھڑی کر لی ہیں۔ خوف، ماضی، یادداشت، عدم تحفظ اور خاموشی کی فصیلیں۔

انیس ناگی کا اسلوب مجرد بیانیہ نہیں بلکہ بصری اور حسی اشارات سے مزین ہے جو قاری کے ذہن میں ایک تصویری تاثر پیدا کرتا ہے۔ یہ ناولٹ کہنے سے زیادہ محسوس کروائے گئے ہیں جو جدید ناول نگاری کی ایک خاص تکنیک بھی ہے ناول ایک ایسی صنف ہے جو

محض واقعات یا کرداروں کی کہانی نہیں بلکہ تہہ در تہہ معنویت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ ''فصیلیں'' کے ناولٹ تجزیہ اور تعبیر کے لیے دعوت فکر دیتے ہیں اور ہر ناولٹ اپنے اندر کئی سطحوں پر معنی رکھتا ہے۔ مثلاً اگر فصیل کو بطور استعارہ لیں تو یہ ناولٹ خارجی نہیں بلکہ داخلی قید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ دیوار ہے جو کرداروں نے اپنی نفسیاتی الجھنوں، تنہائیوں، خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے خود اپنے گرد کھینچ لی ہے۔ انیس ناگی کے ناولٹ کی ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ انیس ناگی کے کردار معاشرے سے منقطع ہو کر فرد کی سطح پر رہ جاتے ہیں جہاں وہ اپنی شناخت، وجود اور مقصد کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا تنہا سفر ایک فکری علامت ہے، وجودی بے یقینی کا سفر، فصیلیں کے ناولٹ کثیر الجہتی علامتی عناصر رکھتے ہیں جنہیں قاری اپنی فکری سطح اور سماجی پس منظر کے مطابق مختلف انداز میں سمجھ سکتا ہے۔ استعاراتی لحاظ سے ''فصیلیں'' کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انیس ناگی نے اپنے ان ناولٹس میں روایتی بیانئے سے ہٹ کر ایک نئے طرز اظہار کو اپنایا ہے ان کا اسلوب مجرد، علامتی اور کبھی تجریدی ہو جاتا ہے۔ انیس ناگی کے ناولٹ محض قصے نہیں بلکہ انسانی رویوں اور وقت کے تقاضوں کے عکاس ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو محض رومانوی خواب دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی خشک فلسفیانہ مباحث، بلکہ زندگی کی تلخ اور کڑوی حقیقت ان کے ناولٹ کا بنیادی موضوع ہے۔ وہ فرد کو معاشرے کے ساتھ ٹکرا کر دیکھتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناولوں کا اسلوب مختصر، جامع اور معنویت سے بھرپور ہے۔ وہ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہیں۔ اور کہانی کو اصل نکتے کے گرد گھماتے ہیں۔ ان کے ہاں منظر نگاری، علامت اور تمثیل کا استعمال قاری کو ایک وسیع تر فکری کینوس مہیا کرتا ہے۔ ان کے افسانے قاری کے ذہن میں دیر تک سوال چھوڑ جاتے ہیں۔

علامتیت ایک تنقیدی دبستان ہے جس میں کسی متن کے پس منظر میں چھپے ہوئے معنی، لاشعوری محرکات اور ثقافتی یا نفسیاتی حوالوں کو دریافت کیا جاتا ہے۔ اس دبستان کی بنیاد سگمنڈ فرائڈ اور کارل یونگ کی نفسیاتی تھوریز پر ہے فرائڈ کے مطابق انسان کا لاشعور اس کے تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے جب کہ یونگ نے اجتماعی لاشعور اور علامتوں کی اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اعلیٰ ادب بنیادی طور پر علامتی ہوتا ہے، وہ سامنے کے معنی کے علاوہ
معانی کے سلسلوں کو بھی جنبش میں لاتا ہے۔ اگر کسی تخلیق کا صرف ایک
معنی ہو یا محض ایک تناظر ہو تو وہ وقت کی دیوار پار نہیں کر پاتی اور بہت
جلد متحجر بن جاتی ہے، اسی لیے علامتی ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا"۔ [۱۰]

اردو تنقید میں علامتی انداز کم مگر نمایاں رہا ہے جس میں انتظار حسین، سلیم احمد اور معین نظامی جیسے نقادوں نے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ زندہ علامتیں زمانی اور مکانی تناظر میں بُعد کے باوجود اپنی حیثیت منوا لیتی ہیں اور توانا و تر و تازہ رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی

بازیافت کے لیے ان علامتوں کی تفہیم پر زور دیا جاتا ہے۔ انیس ناگی کے ہاں علامتی اسلوب کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کے ناولٹس کا مجموعہ "فصیلیں" علامت نگاری کی ایک روشن مثال ہے۔

فصیلیں چار ناولٹس پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں فصیل کی علامت فرد، سماج اور تہذیب کے باہمی تعلق کو نئے زاویے سے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ علامتی سطح پر یہ متن قاری کو معنی کی آزادی فراہم کرتا ہے۔' ہر ناولٹ اپنی علامتی ساخت، فکری جہت اور معنوی امکانات کے اعتبار سے ایک جداگانہ متن ہے تاہم مجموعی طور پر یہ ناولٹس ایک مشترکہ تصور، فصیل، کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس ناگی کا ناو

لٹ کا مجموعہ فصیلیں علامتی اعتبار سے اردو فکشن کا ایک اہم سنگ میل ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ سجاد باقر رضوی، وضاحتیں، لاہور، اظہار سنز، س۔ن، ص ۷۳

۲۔ شاہین مفتی، انیس ناگی فن اور شخصیت، پاکستانی ادب کے معمار، ۲۰۰۹ء ص ۱۶۵

۳۔ سجاد باقر رضوی، معروضات، لاہور، پولیمر پبلیکیشنز، س۔ن، ص ۵۰

۴۔ انیس ناگی، قلعہ، مشمولہ، فصیلیں، لاہور، عرفان افضل پرنٹرز، ۲۰۰۵ء، ص ۹

۵۔ انیس ناگی، چوہوں کی کہانی، مشمولہ، فصیلیں، لاہور، عرفان پرنٹرز، ص ۲۶۳

۶۔ انیس ناگی، کیمپ، مشمولہ، فصیلیں، لاہور، عرفان پرنٹرز، ص ۳۳۷

۷۔ ایضاً ص ۳۸۹

۸۔ انیس ناگی، گرم موسم کی کہانیاں، مشمولہ، فصیلیں، لاہور پرنٹرز، ص ۵۰۹

۹۔ ایضاً ص ۴۸۵

۱۰۔ وزیر آغا، معنی اور تناظر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۳۵

# From tradition to transformation: Deviations in Madhubani folk–art and craft in ancient temples of Mithila region of Bihar

Dr. Sajjad Ahmad

Assistant Professor, Department of Educational Studies, Jamia Millia Islamia, New Delhi- 110 025

Dr. Rahat Hayat

Assistant Professor, CTE, Nuh, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

**Abstract**

The present paper is based on the textual analysis of Madhubani folk culture through the lens of tradition, transformation and deviation from its original context and form. The commercialization and globalization have made significant impact upon the role of artists who did not remain untouched and resulted in deviation and transformations of Madhubani folk-art from its original form, values and purposes. The paper is one of the parts of the Indian Council of Social Science Research (ICSSR) funded minor project.

**Key words:** Madhubani folk-art, paintings, commercialization, globalization, socio-cultural perspectives, Mithila, Bihar

## Introduction

Madhubani folk-art stands one of the most iconic examples of folk art globally. It represents not only the aesthetic sensibilities, but also, the socio-cultural and religious ethos of the community- primarily of the Brahmins and the Kayasthas. Traditionally, Madhubani paintings adorned

the walls of homes, ritual spaces and temples. However, it, also often narrates mythological tales, cosmological symbolism, and moral values which had remained an integral part of the daily lives of the people in Mithila region. In this regard, Vatsyayan (1981) notes that *"Madhubani paintings were not mere decoration; they were cultural texts, deeply embedded in the rituals and life-cycle events of the community"* (p. 23). The murals and motifs in temple settings often were considered sacred and embodies the interplay between human devotion and divine presence. However, with the passage of time, Madhubani folk-art experienced significant deviations from its original context and form as a result of commercialization and globalization that made significant impact upon each and every sphere of life. Consequently, the role of artists also did not remain untouched and resulted in deviation and transformations of Madhubani folk-art from its original form, values and purposes. No doubt, it increased *'the visibility and accessibility, but, has altered the traditional meanings and ritualistic significance of Madhubani folk-art'* (Rekha, 2012).

This paper is a part of ongoing research funded by Indian Council of Social Science Research (ICSSR). It has tried to examined such deviations with a specific focus on the representation of Madhubani folk art and crafts in the ancient temples of Mithila. By analyzing the historical origins, socio-cultural dimensions, gendered roles, and contemporary transformations, this study situates Madhubani within a broader discourse of cultural preservation, artistic evolution, and socio-religious significance. The central premise of this paper is that while Madhubani folk-art has expanded into new spheres of artistic expression, it remains an essential lens to understand the cultural continuity and identity of Mithila, especially in temple spaces.

## Historical Context of Madhubani in Temples

There is no exact date of the origin of Madhubani folk-art. However, it can be traced back to centuries and has remained deeply intertwined with the socio-religious and cultural fabric of Mithila region. Yadav (1998) suggests that ancient temple architecture in the region utilized extensive use of decorative motifs. Such utilization reflects both local

cultural traditions as well as pan-Indian mythological narratives. Temples in Janakpur (Nepal), Simraon, and other Mithila region feature intricate wall paintings, depicting epics like the Ramayana and Mahabharata, local deities and nature-inspired motifs, such as, peacocks, lotus, and geometric patterns. Vatsyayan (1981) emphasizes that these murals served not only an aesthetic purpose, but also functioned as *"visual scriptures"* that communicated religious knowledge to a largely illiterate population (p. 45).

It is evident that women play a central role in the creation and perpetuation of temple-based Madhubani folk-art. Rekha, (2012) says that *"traditionally women remained confined to domestic spaces, but, female artisans gradually extended their practice to temple walls during religious festivals and ceremonial occasions"*. This is also because, the transmission of knowledge occurred usually orally through apprenticeship within familial and community networks. This shows socio-cultural norms, gendered symbolism, and ritualistic knowledge in each artwork. Sinha (2018) notes that *"the interaction between folk traditions and temple art demonstrates a dynamic process in which artistic practices were both preserved and adapted to meet ritualistic, aesthetic, and community needs"*.

The historical trajectory of Madhubani reflects external influences, including patronage systems, socio-political developments, and cross-cultural interactions. Faroqhi (2017) highlights that *"artisan communities across different regions negotiated their artistic agency within the parameters of political and religious authority evident in Mithila, where temple patrons influenced the content, scale, and motifs of Madhubani murals"*. Thus, secondary sources indicate a complex interplay of culture, ritual, gender, and socio-political factors in shaping the evolution of Madhubani folk-art in temples. Thus, the socio-cultural aspects of the folk-art and motifs in the temple clearly indicates its significance in everyday life of the people of the region. Even though many of the historical ancient period temples have been destroyed due to the region being flood prone and swampy area, but, some of the dilapidated remains of temples indicates beauty of the Madhubani- folk art carved on the walls

of temple. The same tradition is still visible on many of the temples in the region till date as a tradition and due to socio-cultural significance.

## Socio-Cultural Significance

Madhubani folk-art in temples carries profound socio-cultural significance. It also functions as a medium for moral education, religious devotion, and community identity of the region. Pandey, (2013) suggests that *"the motifs, ranging from depictions of deities like Krishna and Shiva to abstract geometric patterns, reflect cosmological principles and local myths"*. Similarly, Rani (2011) argues that *"every line, color, and shape of Madhubani folk-art remain laden with symbolic meaning, providing insight into the ethical, spiritual, and social codes of the community" (p. 78)*. In temple contexts, these artworks serve as conduits for collective memory, linking generations to a shared religious and cultural heritage. Further, gender dynamics also shape the socio-cultural implications of Madhubani folk-art. Women, as a primary custodian of Madhubani folk-art form, have *"historically exercised creative autonomy within patriarchal structures, embedding personal and communal narratives in the murals"* (Rekha, 2012). However, as a result of commercialization, formal art institutions mushroomed and expanded. Male participation in this art has also increased. As a result, traditional apprenticeship systems got altered and raises questions about the authenticity of the folk-art, its ritual significance, and gendered authorship. However, one aspect is quite clear that these developments illustrate the broader socio-cultural negotiation between preservation, innovation, and cultural transmission.

## Methodology

The larger part of the research upon which this paper is based adopted mixed-method approach to explore deviations in Madhubani art within temple contexts. Extensive literature review had helped to **s**ynthesize national and international research on folk art, temple aesthetics, and cultural continuity, with comparative insights from Southeast Asian and also Ottoman contexts. Further, archival records helped to analyze photographs, manuscripts, and prior scholarly work to establish baseline traditions and identify deviations. Henceforth, the

thematic analysis of qualitative data enabled in identification of recurring patterns, cultural shifts, and the socio-religious implications of deviations in Madhubani folk-art practice. Thus, the triangulated approach ensured the historical depth with contemporary relevance.

**Major findings:**

***Deviations from Traditional Practices***

Over the past few decades, Madhubani folk-art has undergone significant transformations. It has deviated from its original expression in Mithila temples in terms of form, function, and context. Vatsyayan, (1981) suggests that traditionally, the art was bound by ritualistic and community-oriented. Every motif used to carry symbolic significance often linked to religious narratives and cosmological beliefs. However, with the rise of commercialization several changes can be seen in the original form of the art such as modifications in style, scale, and medium. Artists started increasingly employing modern materials. Mathur, (2001) suggests that use of acrylic paints and canvas, led the art *"moving away from its traditional use of natural pigments and hand-prepared surfaces that were central to the authenticity of temple-based murals"*. These changes, on the one hand is expanding the reach of Madhubani folk-art, but on the other it also risks to dilute ritualistic essence that once historically defined its creation.

Thus, it reflects as an impact of commercialization, motifs have evolved to suit market preferences and contemporary aesthetics. Kumar, (2015) says that

> *"while classical temple art relied heavily on depictions of deities, epic narratives, and symbolic flora and fauna, modern interpretations often feature abstract designs, popular cultural icons, and innovations that appeal to urban and international audiences"*.

Similarly, Thakur (2007) observes that patronage dynamics have also shifted. He suggests that the temples that were once directly commissioning specific artworks, included ritual requirements. As an impact of commercialization and globalization, the contemporary artists

started catering to private collectors, galleries, and tourists. These transitions, hence, redefines the Madhubani folk-art and shows clear-cut deviation from sacred expression to commercial commodity. Thus, it has largely altered the meanings encoded in traditional motifs. Deviations also manifested in scale and placement. Temple murals started being integrated into architectural structures harmonizing with spatial rhythms and ritual spaces. On the other hand, the contemporary representations frequently detached itself from the architectural context and displayed on standalone canvases or in domestic and gallery settings. Such shift actually affects the way viewers perceive the Madhubani folk-art. The spiritual and communitarian resonance of the original temple murals were replaced with aesthetic appreciation devoid of the ritual context it originally depicted. Consequently, these deviations raise critical questions about authenticity, continuity, and the socio-cultural role of Madhubani folk-art.

***Socio-Cultural Implications of Deviations:***

The deviations in Madhubani folk-art are not merely aesthetic, rather, they also reflect deeper socio-cultural shifts in Mithila region. The adaptation of traditional art for commercial purposes has created both opportunities and tensions within local communities. Rekha, (2012) suggests that, these transformations *"provide economic avenues for artisans, particularly women, who have historically been marginalized in the labor market"*. Participation in national and international exhibitions, sales through cooperative societies, and through online platforms have enhanced the visibility of Madhubani folk-art. This has also fostered a sense of pride and cultural affirmation among the community inhabitants of Mithila region.

Further, on the other hand, commercialization has also led to erode the ritualistic knowledge and community engagement in the folk-art traditions. Sharma (2017) suggests that *"younger generations of artisans prioritize marketable skills over traditional apprenticeship"*. As a result, it seems to have resulted in the gradual loss of symbolic literacy that used to promote classical temple art. Apart from this, the shift from collective, community-based production to individualistic creation have also altered the social fabric of Mithila. Consequently, it has reduced opportunities for

intergenerational knowledge transfer. Thus, the socio-cultural consequences reflect duality. Firstly, in terms of the economic empowerment and global recognition, and secondly in terms of the potential fragmentation of traditional meanings and social cohesion.

Furthermore, deviations also influenced the gender dynamics in the region. Historically, women were central to the creation of temple-based Madhubani folk-art. They used to negotiate personal and communal expression within patriarchal structures (Rekha, 2012; Pandey, 2013). However, commercialization also introduced male artisans into previously female-dominated spaces. This led to shifts in the authorship, recognition, and income distribution. Such changes underscore the complex interplay between culture, economy, and gender in the contemporary trajectory of Madhubani folk-art.

***Gender, Agency, and Contemporary Roles:***

The gendered dimensions of Madhubani folk-art are critical in understanding its preservation as well as its deviations. In temple art contexts, women were not the only artists rather they were the custodians of cultural and ritual knowledge. Nath, (2009) suggests that they also used to encode the moral narratives, cosmological principles, and community histories in their work. Their labor reflected a nuanced negotiation of agency, as they navigated societal constraints while asserting creative and spiritual authority. In this regard, Anuradha Sinha (2018) shows that *"the female hand in Madhubani folk-art is simultaneously devotional and expressive, linking the domestic, the sacred, and the communal"* (p. 112).

However, modern transformations have shifted this balance. Male artists and commercial enterprises increasingly dominate the markets for Madhubani folk-art often affecting access, visibility, and economic benefit for women artisans. Yet, women continue to innovate and blend traditional techniques with contemporary demands, participating in workshops, cooperative societies, and online platforms. Such developments highlight the persistence of female agency. However, research gaps remain in understanding how these shifts affect ritual knowledge, community identity, and the intergenerational transmission of

skills, signaling the need for further ethnographic study (Thakur, 2007; Priyanka Mishra, 2019). Gendered analysis also extends to thematic deviations. Modern representations often emphasize decorative aesthetics over ritual narrative, potentially marginalizing the traditional female-centered modes of storytelling. Consequently, understanding the intersection of gender, art, and commercialization is pivotal for both academic scholarship and cultural preservation.

***Preservation Challenges and Strategies:***

Preserving Madhubani folk-art in temple contexts faces multifaceted challenges. It ranges from environmental degradation to socio-economic transformations. Kumar, (2020) suggests that *"traditional murals, created with natural pigments on mud and plaster surfaces, are highly susceptible to weathering, water damage, and neglect"*. Further, restoration efforts are often hampered by a lack of documentation, limited funding, and insufficient awareness of the cultural significance of these artworks.

Contemporary preservation strategies advocate a combination of technical, educational, and community-based interventions. Whereas, technical measures include pigment conservation, structural reinforcement of temple walls, and digital archiving to prevent loss of visual information (Pathak, 2005). Community-based strategies emphasize engaging local artisans and cultural custodians in preservation efforts, recognizing their expertise in traditional techniques and symbolic interpretations. Educational initiatives aim to integrate Madhubani folk-art heritage into local schools, festivals, and workshops, ensuring intergenerational knowledge transfer. Apart from these, global comparisons also offer insights. In Southeast Asia, Rawson (1990) observes that the integration of local artisans in temple restoration projects ensures continuity of craft traditions while maintaining ritual relevance. Similarly, Eliade's (1957) framework emphasizes the spiritual dimensions of art, advocating preservation strategies that respect the sacred context of folk artworks. In Mithila, aligning technical interventions with cultural and ritual imperatives is essential for holistic preservation of Madhubani folk-art in temple spaces.

## Conclusive remarks and Recommendations:

The trajectory of Madhubani folk-art in the temples of Mithila reflects a dynamic interplay of tradition, transformation, and cultural negotiation. Deviations from original practices, often driven by commercialization, globalization, and changing social dynamics, have altered the form, function, and meaning of these artworks. While such transformations also have expanded visibility and provide economic opportunities, but they also challenge the preservation of ritual knowledge, socio-cultural coherence, and gendered authorship. Its deviations are not merely losses but also transformations that reflect broader socio-cultural, economic, and gendered dynamics. By recognizing and addressing these changes, scholars, practitioners, and communities can ensure that Madhubani continues to flourish as both a sacred and socio-cultural heritage of Mithila. There is much need to further explore this area keeing in mind ethnographic documentation, gendered analysis, cultural preservation and comparative studies. In conclusion, Madhubani art exemplifies the resilience and adaptability of cultural traditions.

## References


- Eliade, M. (1957). *The sacred and the profane: The nature of religion*. Harcourt, Brace & World
- Faroqhi, S. (2017). *Crafting history: Essays on the Ottoman Empire*. Oxford University Press
- Kumar, A. (2020). Preserving the past: The challenges of Madhubani art in temple conservation. *Journal of Folk-Art Studies, 12*(3), 45–67
- Mathur, S. (2001). *Madhubani art: Myth and reality*. Delhi: National Folklore Institute
- Nath, R. (2009). *Madhubani and the divine connection: Folk art in Mithila temples*. Patna: Mithila Cultural Research Center.
- Pandey, S. (2013). Social dimensions of Madhubani paintings. *Art & Society Review, 5*(2), 78–102.
- Pathak, C. R. (2005). *Sacred art and folk expressions in Indian temples*. New Delhi: Heritage Publications.

- Priyanka Mishra. (2019). Madhubani art and its evolution through the lens of temple imagery. *Journal of Indian Folk Art, 11*(1), 12–36.
- Rawson, P. (1990). *The art of Southeast Asia: Temples and sculpture*. London: Thames & Hudson.
- Rekha, N. (2012). *Women artists of Mithila: The tradition of Madhubani art*. Patna: Mithila Studies Press.
- Sinha, A. (2018). Temple art and folk traditions in Mithila. *Indian Journal of Cultural Studies, 9*(4), 110–132.
- Thakur, A. (2007). Artisans and patrons in folk art of Mithila. *Journal of South Asian Folk Arts, 3*(2), 55–78.
- Vatsyayan, K. (1981). *Madhubani painting: A study in the regional folk art of Mithila*. New Delhi: National Museum Publications.
- Yadav, K. (1998). *The temple architecture of Mithila*. Patna: Mithila Heritage Press.


***

# Cultural Mosaic of Awadh and Ratan Nath Sarshar

Muqeem Ullah Khan
Delhi Govt. Officer Flats Shalimar Bagh, Delhi

**Abstract** : Awadh has been a vital centre of Hinduism since ancient times. After the arrival of Muslims in India, the Islamic Empire gradually expanded across the country and Awadh was deeply influenced by this political shift. In Awadh, while the majority of the population was Hindu and Muslim, there were also small communities of Jains, Sikhs, Buddhists, Parsis and Jews. The Culture of Awadh represented the pinnacle of Indian Civilization, characterized by artistry, sophistication, elegance and refined manners. In the era of Awadh the administration and social life of Awadh were defined by a deep sense of communal harmony and mutual respect. If the Awadh culture is the spirit of Awadh region, then the Ratan Nath Sarshar is its most vivid biographer and the observer of life and society, A Kashmiri Brahmin born in Lucknow, Sarshar was a master of Urdu language, his literary work is the ultimate literary record of the composite culture with his novel Fasana-e-Azad. Sarshar's novel Fasana-e-Azad is often cited as one of the first true Urdu novels, though it remains the episodic charm of traditional Dastans. Fasana-e-Azad is a masterpiece that serves as a mirror to the civilization, it reflects the lifestyle of both the common people and the elite of Lucknow.

**Keywords** : Awadh, Lucknow, Sarshar, Culture, Fasana-e-Azad, Civilization, Language and Literature.

In this era of globalization modern technology has become an integral and indispensable part of human life. Today, the world has become to small that it has given rise to the notion of a 'Global Village'. It has become almost impossible for men to be at the same platform on

the basis of religion, language, tradition, culture and education. Culture is the fountain head of life in absence of which existence of men and its civilization becomes meaningless. Culture is a the collection of those values and traditions which influence an individual as well as social life. It encompasses geographical limits, climate, society, history and belief, traditions, spiritual, educational and material trend, philosophy of life and purpose of life. Similarly literature is the best instrument of expression of man's feelings, thoughts, experiences. Since ancient times India has been the melting pot of various cultures. The conditions is prevalent today also. The Indian composite culture is also known as Ganga-Jamni Culture.

Awadh is best cultural showpiece of the points made above. After the invasion of Nadir Shah, a literary vacuum was created in Delhi. All the literacy figures were attracted towards Awadh because of its diversity. A result, Awadh became a centre of literature and after the decline of Delhi as a literacy capital.

Mr. S.N. Singh is giving detailed information on this, he writes,

"Urdu literary life in Awadh begins with the immigration of Urdu poets and scholars from Delhi, following attacks by the Iranians, Afghan, Maratha and Jat armies. The newly independent state of Awadh offered generous patronage of poets, writers and scholars of Urdu and Persian. It was almost a trend where we find several scholars visited the city. Ali Jawad Zaidi gives a list of sixty-five such immigrants poets, including, besides Mir and Sauda, such prominent names Soz, Fughan, Zahik, Jurat, Insha, Rangin and Mushafi. It may be useful to note here that poets who are closely identical with Delhi in literary chronicles were not necessarily originally from Delhi, many of them had come there from elsewhere to seek livelihood and left when that became extremely difficult. In those days poetry was a profession, and its practitioners went where their profession could obtain proper patronage."[xxiii]

The language Urdu in Awadh differs significantly from Urdu of Delhi. Awadhi Urdu is celebrated of its external beauty and linguistic perfection. The language in daily life is simple, polite and conversational

Urdu mixed with Awadhi words, reflecting local culture and social etiquette. In his book 'Incredible Lucknow' Saiyed Anwer Abbas describes the beauty of Lakhanavi language, he says,

"Observing the Lakhnavi's language and form one comes across certain characteristics. The words chosen are musical, soft and sweet. They are generally taken from Urdu, mostly derived from Persian. The lyrical Urdu style of combining two or more words in a phrased form is utilised to the maximum. For example Janaab-e-Aali and Huzoor-e-Waala are used though Janaab and Huzoor themselves would have sufficed. The use of hyperbole for enhancement of the degree of a term is supposed to be the main object of exclamation and the chief characteristic of the Lakhanavi style. But this artefact is only applied in the case of second or third person and the first person, the speaker himself, is presented in the most humble, downtrodden, earthly and inferior form. The person being addressed will be addressed with respectful words like Mohuturum and Muazziz meaning respected and exalted and exclaimed with Janaab, Sarkar, Huzoor, Hazrat and may even be called Qibla. The effect of salutation is further enhanced with additional words as Janaab-e-Waala, Sarkaar-e-Mohaturum, Qibla-e-aala."[xxiii]

The culture of Awadh presents the best forms of genres and style which are different from those found in Delhi, Hyderabad and Azeemabad. It has various means of creative expressions through Imambadas, Majalis, Music, Dance, Folk Songs and theatre. The literary figures of Awadh presented it in a new form. In short, it can be said that these people successfully presented life and society in a new form which has proved to be a milestone for the Hindu Muslim unity which can be interpreted as a cultural mosaic of the Awadh. In this period a number of novels were published which discussed different aspects of social and cultural issues of the society.

The pioneer of Urdu novel Deputy Nazeer Ahmed wrote on social reforms. Through his novels he tried to convey a message to society. After Nazeer Ahmed, Ratan Nath Sarshar has greatly contributed to Urdu through his fiction writings which could be defined as mirror of the then

culture. His greatest achievement is the realistic portrayal of the culture of Awadh. He is the first novelist of Urdu who has seen life from a secular point of view and presented it realistically. In his novel 'Fasana-e-Azad', Sarshar has portrayed the culture of contemporary society. He has brought to life the festivals, fairs, theaters, dances and culture and traditions of Awadh. He has pointed a vivid portrait of decaying contemporary society in such a vibrant colours that through this, one can observe all aspects of human life.

The Ganga-Jamni culture was not just about the religions but a deep fusion that influenced language, literature, cuisine, traditions, dances, Majalis and Holi. The Nawabs of Awadh were the patrons of this culture. Ratan Nath Sarshar's novel 'Fasana-e-Azad' is known as 'encyclopedia of Awadhi Culture, this novel provides a vivid and satirical portrait of society and descriptions of then culture, most popular Indian festivals and traditions. For example the Basant festival is described with sensory richness with mentions of marigolds, roses, saffron – tinted sweets like barfi and the kesari-dyed clothing of the residents of Awadh. Sarshar describes the mourning rituals and processions with accuracy. He notes how the 'black' attire wear all the men and women in these mourning days.

The popular entertainment of that time, such as cock-fights, kite-flying, Kabutar-baazi and traditional poetry sessions. It shows the cultural lifestyle of Awadh that loved fairs, market places and social gathering. After all, Sarshar highlights the 'Ganga-Jamni' culture of the city where religious events were shared experiences and social harmony was a core value. He depicts a culture where different communities lived and created together, as seen in the communal participation in festivals and the shared appreciation of Urdu literature.

Pandit Ratan Nath Sarshar was a pioneer figure of North India. His works remains an unparalleled picture of Awadh through the immortal characters of Azad and Khoji, he provided a mirror for his society to see its own foibles and potential for reform. Sarshar's legacy is not just literary but cultural and he showed that Urdu was a product of India's

Ganga-Jamni culture, a language that belonged to anyone who loved its idiomatic beauty. His ability to weave together humor, social critique and a deep love for his society. The adventure of his famous character Azad and the antics Khoji continue to remind us of a glorious, decadent era when manners, music and Tehzib were the defining features of life in Awadh.

It is essential to look at the literary atmosphere in which Sarshar opened his eyes. At that time, Rajab Ali Beg Suroor was shining on the horizon of Urdu literature. His imaginative storytelling, colourful use of words and rhythmic style ruled over the language. During Ratan Nath Sarshar's time, literary giants like Deputy Nazir Ahmad, Abdul Halim Sharar, Munshi Sajjad Husain were also present. But Sarshar was a confluence of both modern and ancient civilization. Besides Fasana-e-Azad, Sarshar wrote other novels including Sair-e-Kohsar, Jam-e-Sarshar and Kamini, which became very famous. These novels were initially published as serials in newspapers like Oudh Akhbar and were later edited and published as books. These stories are well-connected and show his strong grip on storytelling.

Sarshar's greatest quality is that he presented a unique example through his style of narration. In his writing, characters are not just toys, they are living, breathing people who run, play and laugh. He taught Urdu literature how to properly use the dialects of different sections of Indian society. His novels feature characters like washermen, potters, gamblers, Nawabs and Sahukars who truly represent their social classes. While describing scenes, he uses eloquent language, witty phrases and poetic Persian and Urdu expressions to make his narrative beautiful. The result is that the entire scene revolves before the reader's eyes, feeling like a movie or a play. This proves his observation was extra ordinary and his most important quality is his unparalleled ability to describes scenes.

**********

## Bibliography

1. Composite Culture of India and National Integration – Rasheeduddin Khan – 1987, Asaf Ali Road, Delhi.

2. India – Culture and Society – Sir John Woodroff 1978, Light and Life Publishers, Paharganj, Delhi.

3. Lucknow – Memories of a City – Violette Graff – 1977, Oxford Press, Delhi.

4. Fasana-e-Azad – Ratan Nath Sarshar – 2002, NCPUL, Delhi.

5. Incredible Lucknow – Saiyed Anwer Abbas – 2001, Gomti Nagar, Lucknow.

6. The Kingdom of Awadh – S.N. Singh – 1998, Mittal Publication, New Delhi.

7. Lucknow Aur Sarshar Ki Duniya (Urdu) – Feroz Mukeji, City Press Book Shop, Karachi-2000.

8. Guzishta Lucknow (Urdu) – Abdul Haleem Sharar, Maktaba Jamia, Aligarh, 1971.

9. Ratan Nath Sarshar – Prem Pal Ashq, NCPUL-Delhi, 2002.

***

# Fostering Values and Inner Peace in Prospective Teachers through Nature Drawing

Professor Susmita Lakhyani

Department of Education, University of Delhi, Delhi, India

**Abstract**

The National Education Policy 2020 lays a lot of emphasis on the inclusion of art and its integration in the school curriculum. While art is considered a 'not so important subject' in the schools. Either there are no art teachers or there are very few. Most of the faculty and the administrators do not have much art experience, which gives rise to misconceptions and undermines the true significance of art. It is important to bring about a change in the teachers' attitude towards it as part of their training in the teacher preparation programme. To achieve this, I designed and conducted a nature drawing workshop, a creative pedagogy for non-art-specialised prospective teachers to develop an understanding of the true purpose of art and the significance of nature appreciation. For this, 35 non-art-specialised prospective teachers were drawn from a teacher training institute as participants, where most of them had limited art experience in schools till 8$^{th}$ grade. The workshop consisted of four phases: developing understanding of art, demonstration of window frame technique, exploring and drawing the selected location, and concluding with reflection and experiential writing based on their experience they went through during and after the nature drawing process. The written experiences, or the reflections, were collected as data and thematically analysed. Nature drawings were also collected and analysed as part of the data. Analysis revealed development of appreciation of nature and art; and feelings towards art elements like line, form, colour, texture and tones. The participants' written responses and drawings also

reflected originality, freedom of expression and joy; reflective thinking and introspection; and mindfulness and a calming experience. The drawings reflected keen observation of the details in nature; hard work, patience and perseverance; and originality in shading, selection of location, and creation of symbolic forms. It was also found that participants were able to draw unhesitatingly and fearlessly and made independent decisions regarding all aspects of drawing, driven by their own feelings and breaking the conventions. They were also able to sense the feeling of going beyond themselves and identifying with nature. It can be concluded that the creative pedagogy in the workshop helped in fostering human values, peace and the development of feelings and relation with nature, thereby fulfilling the sustainable developmental goals.

**Keywords:** Human values, art appreciation, observation, identification with nature, reflection and introspection, creative pedagogy.

**Fostering Values and Inner Peace in Prospective Teachers through Nature Drawing**

Why are art and nature important? Borah, N. (2020, p. 23), citing Rabindranath Tagore, states that art and nature are true teachers. He further adds that nature provides a better environment to earn knowledge and makes moral and spiritual development possible. In the context of contributions of nature Kellgren et al. (2013)

in his review study suggests that there are a lot of studies which highlight the benefits of nature engagement. Benefits such as psychological, cognitive and physiological are more studied than the social, spiritual and tangible benefits which need to be researched more. Pretty (2004) also emphasized that different kind of engagements with nature including virtual involvement benefits mental and physical health. Art helps with personality development (Meena & Monika 2023, p.14), and engagement with nature and artistic expression have shown benefits for stress reduction (Schenck & Stuckey, 2018, p.9). Art-based learning experiences are essential components of the overall development of students, allowing them to express imagination, emotional involvement, and aesthetic awareness through personal and professional settings. Arts should be at the roots of education (Prasad,1998) but sadly taken as a fringe subject in the school curriculum, and it is limited to impressing the administrators during the school inspection (National Curriculum Framework, 2005). Most teachers in schools are non-artists, often harboring numerous misconceptions and viewing art as a peripheral subject. Similarly, administrators majorly belong to core subjects' specialization, especially in Indian context. Their sensitivity towards art and art education remains often underdeveloped. This could potentially hinder teachers' ability to integrate art into the teaching of their respective subjects, thereby limiting the creative aspect of the teaching-learning experience.

However, creative pedagogy as an approach can integrate skills with a focus on rationality, context, and an ethic of care (Rutten, 2024, p.4). Creative pedagogical practices have potential in exploring ideas, emphasizing autonomy and agency, joyfulness (Cremin & Chappell, 2019), collaboration and creativity (Halverson & Sawyer, 2022, p.2). Hence, Creative pedagogy can be beneficial for non-art-specialized student teachers (Harris, 1960) as they will be in various positions—such as teachers, administrators, and policy makers, that will allow them to leverage opportunities where arts can be integrated into the education. Still, there is a limited body of literature on non-art-specialized student teachers' experiences participating in art-based workshops, primarily those emphasizing nature-inspired art. This study fills that gap in part by evaluating the influences of a five-day art workshop on prospective teachers, recognizing the critical need for creative pedagogy that encourages an appreciation for art and nature through workshops' art sessions. This would facilitate their growth while also cultivating an environment in their future schools that values both art and nature. Towards this, consequently, I developed a workshop focused on 'nature drawing'.

## Objectives

To design a workshop to develop an understanding of 'significance and appreciation of art and nature' in non-art-specialized prospective teachers. It also presents an analysis of their experiences and nature drawings.

## Method

The study is purely qualitative in nature and adopts case study as a method. For the study, a workshop on nature drawing was designed for non-art-specialized prospective teachers belonging to teacher education (2-year bachelor's in education) programme in a central university of India. Research suggests that nature drawing can improve observation skills and connection to nature (Kim & Lee, 2018). Additionally, it can reduce stress and improve mood in college students (Sullivan & Larson, 2020). The workshop was open for all, where 35 non-art-specialized prospective teachers with art experience only until 8th grade or less had joined the session. The workshop took place (in-person) in the campus of the Department of Education which has ample open green space adorned with trees, shrubs, bushes and lawns. It continued for 5 weeks, with each week having one session lasting two hours. The study included four phases. In the beginning, it was observed that participants exhibited reluctance to attend the workshop because of their fear of art. To alleviate the participants' apprehension and insecurity around sketching, and also to make them focus on the process rather than the product, it was shared in the beginning that anonymity would be maintained throughout both tasks (in phases 3 and 4) of the study. This made them comfortable and motivated. Participants were instructed to make their submission anonymous (regarding their written experiences about the workshop, or their nature drawings) to remove any apprehension of judgment or participants's performance anxiety and encourage free expression. The participants' nature drawings were photographed and were collected (without their names on them) with their consent for use in this research as data for analysis. Data was collected then common themes and patterns were identified. Thematic Qualitative Analysis was employed.

**Phases of the Workshop:** The workshop consists of four phases, figure 1 describes all the phases with specific focus on each stage.

| Phase | Focus area |
|---|---|
| 1. Understanding Art | The first phase focuses on understanding art through discussions and slide shows, emphasizing originality and fearless expression. |
| 2. Demonstrating Window Frame Technique | The second phase introduces the window frame technique, allowing participants to draw a 4"x3" rectangle and use it to select a location on campus. |
| 3. Exploring and Drawing the Selected Location | The third phase involves exploring the campus area, selecting an inspired spot, and using the window frame. |
| 4. Reflection and experiential Writing | The fourth phase encourages participants to write about their experiences, promoting honesty and maintaining anonymity to alleviate fear of judgment. |

*Fig. 1- Phases and focus areas in the workshop*

Further figure 2 describes each phase with the given instructions of each objective.

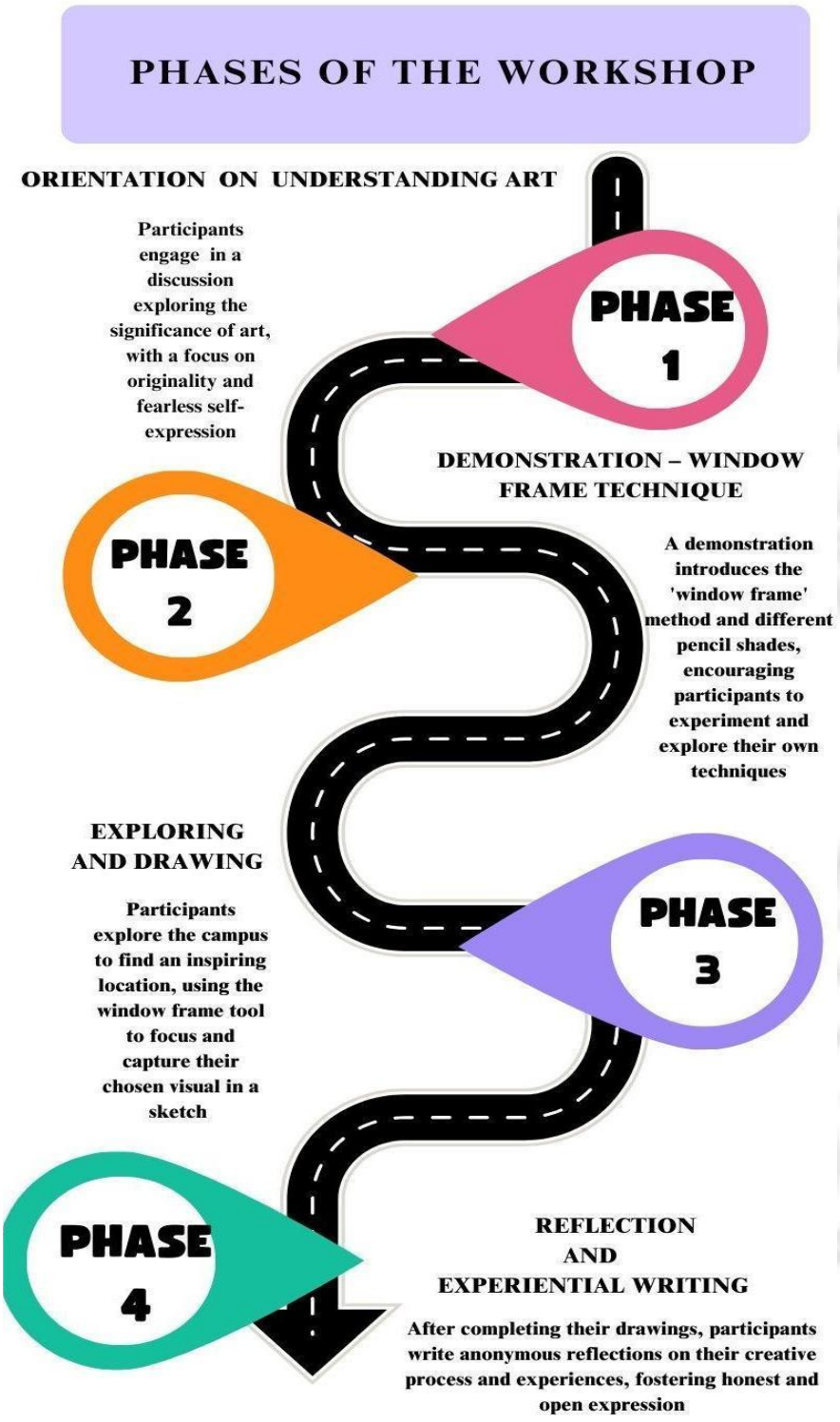



*Fig 2. Phases of the workshop*

## Analysis and Discussion

In this section participants' artwork and their experiences are analyzed and discussed. It is done in two sections:

**Part 1: Results, Analysis, and Discussion of Participants' Experiences.**

**Part 2: Results, Analysis, And Discussion of Participants' Drawings.**

## PART-1

This section of the paper presents major findings and analysis of participants' experiences. Themes emerged from the responses are further discussed below.

### *1.1 Appreciation of Nature and Sensitivity Towards Art Elements*

Nature and art are great teachers. Participants appreciated the process and nature's details, and art elements such as contrast, line, form, colour and texture. The process also made them feel the principals of art such as movement, rhythm, symmetry and so on. They also explored pencil renderings. Participants got the opportunity to delve into the process and freely discover, observe and enjoy the details in nature which never caught their attention, as stated by participant 1 (P1 in fig. 3). He added that he never noticed the tree trunk, especially its rough layer; it had always been invisible to him. He also observed the contrast in bushes and shrubs' unpredictable flexibility and man-made buildings' rigidity. The participants were also able to go beyond the observation of trees and foliage sharing observation of different small lives in the form of ants having their own world in the soil and around the plants. The whole process made them develop an appreciation for artists and the art process, as reflected by participant 2 (P2 in fig. 3). The findings support Bensussen (2020) citing Brew, Fava, and Kantrowitz (2012) that drawing promotes concentration, and curiosity, thereby helping to see more clearly, and minutely, collecting nuances that might otherwise go overlooked.

***Participant's responses related to Appreciation of Nature and Sensitivity Towards Art Elements***

P1: I spent time observing variations in similar looking leaves, the flow and the movement, the symmetry and the beauty, holes in tree leaves and sun rays coming out of them—how beautiful! These are generally overlooked .I never noticed the tree trunk, especially its rough layer; it had always been invisible to me. I also observed the contrast in bushes' and shrubs' unpredictable flexibility and man-made buildings' rigidity.

P2.: While I was drawing, I realized how much effort artists put into creating a masterpiece, especially in terms of ideation. I have developed respect and appreciation for the artists' work.

*Fig. 3 - Participant's responses related to Appreciation of Nature and Sensitivity Towards Art Elements*

### *1.2 Originality, Freedom of Expression and Joy*

The participants felt the session was unique as it was their first experience to do live direct nature drawing, unlike copying nature' and with no pressure of product, says P3 (P3,11 and 23 in fig. 4). The process also made the participants freely create their own symbols for the forms of nature mentioned by P11. The creation of symbols to express oneself reflects that the individual has delved within and communed with self, thought independently, and brought out the subjective experience in the form of the symbol. The participants also developed self-confidence, courage and a stand-alone spirit, and appreciated their own work for the value of originality and hard work. Their responses reveal that they felt a sense of satisfaction, realized their potential, and valued their honest effort, as also indicated in the response of P23.

Paintner (2007) emphasizes, "The focus in the expressive arts is on the process of artmaking rather than the art product itself. In this way, artmaking becomes accessible to anyone, because the creative process is central to the journey of discovery, rather than what the final product will look like".

***Participant's responses related to Originality, Freedom of Expression and Joy***

P3: Freedom from copying pictures and outlining, (which I previously did) instead drawing from live observation of nature was overwhelming. I followed my own instincts and desires, it was a life-long experience.

P11: I found it easier to sketch shrubs by scribbling the alphabet V, W, M shapes for the leaves. If I looked closer, I could see these as scribbles, but as I walked away, they became leaves and the drawing improved, which I enjoyed'.

P23:I had put in all my efforts, although it may not be so beautiful from others' perspective, but I liked my work because this was my first drawing which I made myself without copying.

Fig. 4- Participant's responses related to Originality, Freedom of Expression and Joy

### 1.3 Pro*moting Reflective Thinking and Introspection*

The process of drawing nature promoted reflective thinking as evident in the excerpts of P14 (P14,18, and 20 in fig.5). The creative process gave a platform to develop perseverance; this is observable in the excerpt by P18, where one continued drawing, keeping hope even though it didn't seem that work would turn out well. It also shows that the participant kept hope and persevered even when during the process one felt it was not coming out well. The participants while writing about their experiences went into introspection of the process, found evident by P18 and P20. It is analyzed that the process involved 'reflection and introspection', 'seeing through', examining it in the social context; and the importance of looking without preconceptions. Bajaj (2015) reviewing Edward Brantmeier's (2011) writes peace education includes envisioning nonviolent solutions, encouraging reflection and fostering transformative actions. Further, Graham, M. A. (2007) believes that observational drawing can go beyond self-expression and foster thoughtful thinking about society, fostering transformative learning. The above research correlate with the findings extracted from participants' reflections.

***Participant's responses related to Promoting Reflective Thinking and Introspection***

P14: My initial confidence was low, hastily started and I realized the tree didn't fit, so started a new. I doubted its completion, but I calmed down and sped up. I am glad that I didn't lose hope and maintained confidence. I continued and on completion I liked my work.

P18: During the process I naturally got into talking about life while drawing, and listening to music with my friend, it was great. We were sometimes quiet and absorbed. Later, we shared with each other our observations of beautiful details.

P20: In daily life, many things go unnoticed, like a tree trunk's rough texture was always invisible to me. Our eyes deceive us. I realized there is a need to look at the truth keenly, at times our senses are blurred by societal conventions to see the truth. We even segregate colours by faith. Religious conflict forbids colour use.

Fig. 5 - Participant's responses related to Promoting Reflective Thinking and Introspection

### *1.4 Mindfulness and Calming Experience*

It is analyzed that participants also realized a solution to their stress in being one with nature through art as expressed in excerpts P31 and P38. It is important to note that the participants' experience of being one with nature extends beyond 'self' or 'I', allowing them to identify with something external, such as nature, even if it's only for a short period. The practice of constant identification can help promote a sense of empathy (Keiler, 1961, p. 24). This may further extend to developing empathy in an individual towards their surroundings, encompassing both living and non-living entities. Participants said it was a unique experience, and they were lost during the creation as reflected in the excerpt of P17 and P22. It also shows that they sensed transcendence as they experienced the joy of going beyond the limits of the self (even though for the short while). Participants' experiences included calmness, contentment, joy, liberation, oneness with the environment, and forgetfulness supporting the idea of Williams & Harvey (2001) on art as liberation.

Nature has inherent principles of art including rhythm and harmony which makes us feel calm within. It is analyzed that the participants were feeling the same as expressed in the excerpt of P 22 (P31,17, and 22 in fig.6). Bohra (2020) citing Tagore says that nature impacts the human soul by bringing its inherent vastness seen outside in the vastness of the soul within. The experiences reflect that initially the participants felt confused and fearful, but gradually, in the process, they started feeling the outer nature's impact within. They were able to enjoy the chirping of

birds, jumping squirrels, the aroma of nature, and the feel of a vast sky. Nature benefits not only our eyes but also our senses of smell, touch, air, and taste (Franco, Shanahan, & Fuller, 2017). It was a holistic experience involving all the senses that transformed fear into joy for participants (though one cannot claim the complete transformation). Paintner (2007) states that the arts celebrate mystery and meaning making as spiritual disciplines. Self-awareness and spiritual growth can result from watching the art-making process, reveal inner emotions like resistance, insight, joy, and despair.

***Participant's responses related to Mindfulness and Calming Experience***

P31: Art can calm us when we're upset.

P38: My problems seemed to be trivial during the drawing process, felt importance of cherishing our existence.

P17: Rarely did I think of the past or future while drawing. I didn't realize I was singing tree songs and later I was quite. Sitting in silence, and drawing made me forget my friend sitting beside. My senses were relaxed, no stress of assignments was there, felt extreme calmness and sitting in silence and absorbing the aura was therapeutic.

P22: I felt the rhythm in my body, felt like writing a poem and humming a song.

Fig. 6 - Participant's responses related to Mindfulness and Calming Experience

**PART-2**

Few of the samples of participants' drawings:

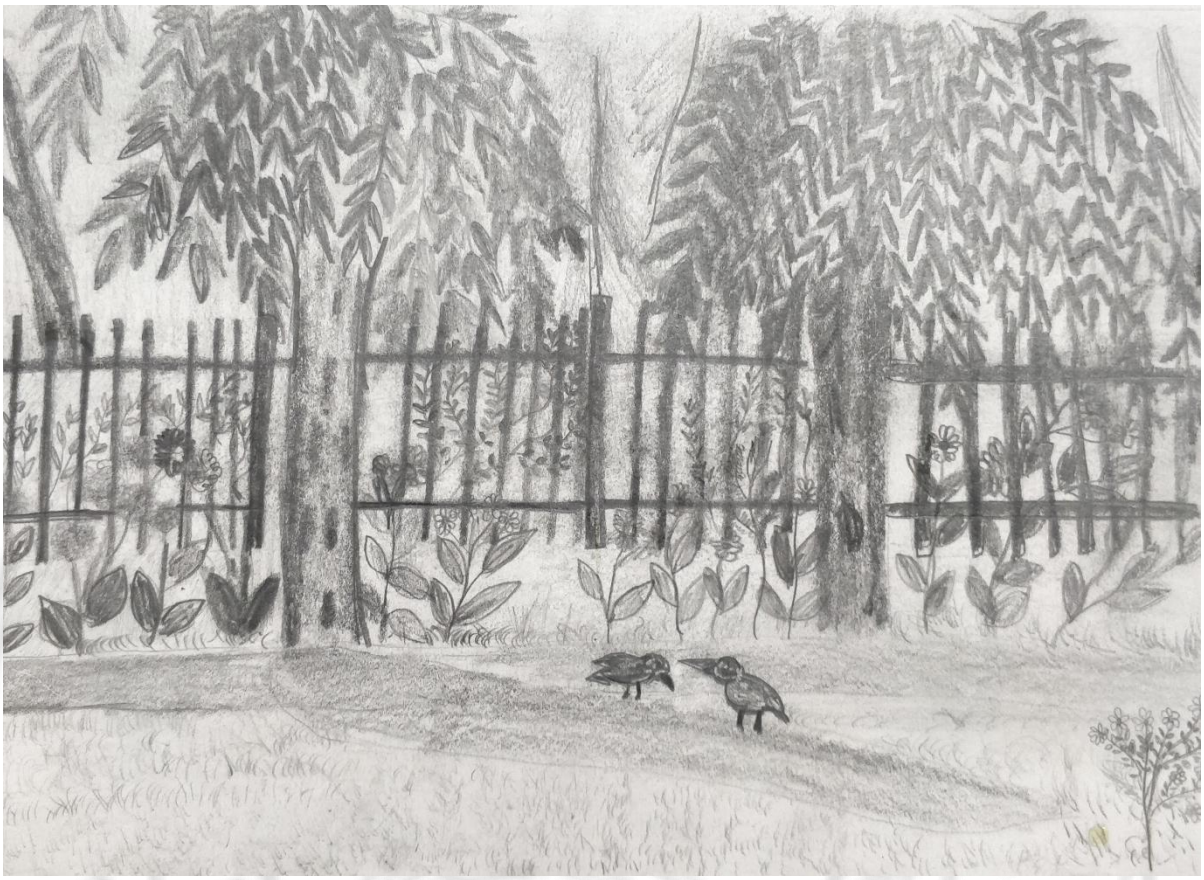


Figure A - Dialogue

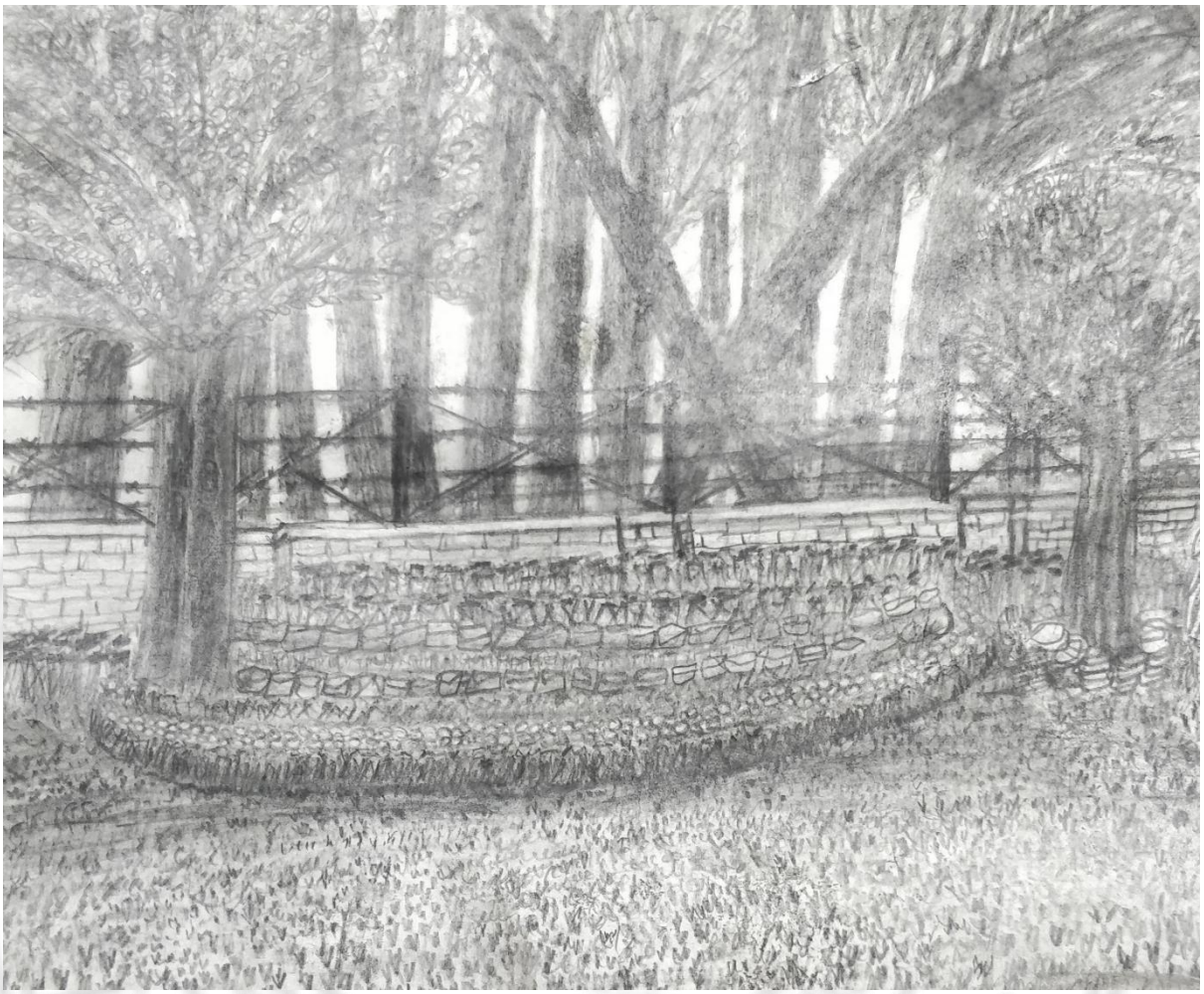


Figure B - Nature's Voice

All the figures reflect keen observation, patience in bringing out the details on paper, hard work and perseverance. It reflects sensitivity towards size, shape, form, tones and pattern reflecting harmony and rhythm. Originality in composition, and style of shading is also observed. Titles also reflect calmness and nature connectedness. It is observed that the analysis of the experiences and the drawings converge.

## Conclusion

Using creative pedagogy in the art workshop, participants developed an appreciation for art and nature. The process of capturing nature through direct observation, developed feelings, sensitivity and awareness towards art elements and principles. It encouraged subjective feeling-based experiences, fostering reflective thoughts and introspections. This led me to create an all-senses methodology transforming fear of creating artwork to joy to an extent. Participants' artwork reflected deep

observation, originality, courage to create, independent decision-making based on feelings, and self-created symbols. The process fostered self-realization, i.e., knowing about the inner self, the desires, feelings, and potentials within; patience to observe; and empathy through sensitively identifying with the outside nature. It gave them the opportunity to connect with the inner core, transcend the self, feel the stillness of mind and oneness of self and nature, and further experience the inner joy and calmness. I stress that it is for this reason, art and nature augment value towards education for life. However, I believe that this workshop is not solely sufficient to promote such values in a limited period. Lasting transformation requires ongoing engagement and practice and allowing participants to continue exploring by providing unique platforms such as this workshop. In this case, I find that the workshop fostered human values, inner peace and appreciation of art and nature in non-art-specialized prospective teachers' there by contributing to quality education and peace, the sustainable developmental goals. I further conclude that art and nature are the true teachers and have the potential to humanise education.

**Implications**

As non-art-specialized teachers make up most of the teaching staff, so their experience with art is significant. We can incorporate this workshop into the curriculum of teacher education programs, especially for non-art-specialized prospective teachers (and for in-service teachers), to remove misconceptions and fear of art. This can further help self-development, contribute to art-integrated teaching thereby enriching teaching learning experience, and create an art-appreciative environment in their respective schools after their training.

## References


Bajaj, M. (2015). Pedagogies of resistance and critical peace education praxis. *Journal of Peace Education*, *12*(2), 154–166. https://doi.org/10.1080/17400201.2014.991914

Bensusen, S. J. (2020). The power of observation: Practical art-based exercises to improve how we learn science. *Science and Children*, *57*(5), 60–65. https://www.jstor.org/stable/27045206

Borah, N. (2020). Humanistic philosophy of Rabindranath Tagore. *Palarch's Journal of Archaeology of Egypt/Egyptology*, *17*(6), 3995–3999.

Brantmeier, E. J. (2011). Peace education and the role of transformative action in an era of violence and injustice. *Peace and Conflict Studies, 18*(1), 1-21.

Cremin, T., & Chappell, K. (2019). Creative pedagogies: a systematic review. *Research Papers in Education*, *36*(3), 299–331. https://doi.org/10.1080/02671522.2019.1677757

Franco, L. S., Shanahan, D. F., & Fuller, R. A. (2017). A review of the benefits of nature experiences: More than meets the eye. *International Journal of Environmental Research and Public Health*, *14*(8). https://doi.org/10.3390/ijerph14080864

Graham, M. A. (2007). Art, ecology and art education: Locating art education in a critical place-based pedagogy. *Studies in Art Education*, *48*(4), 375–391. http://www.jstor.org/stable/25475843

Halverson, E., & Sawyer, K. (2022). Learning in and through the arts. *Journal of the Learning Sciences*, *31*(1), 1–13. https://doi.org/10.1080/10508406.2022.2029127

Harris, W. H. (1960). Art Teaching for Creative Thinking. *Art Journal*, *20*(2), 92–95. https://doi.org/10.1080/00043249.1961.10793987

Keiler. (1961). *The art of teaching art*. University of Nebraska Press, Lincoln.

Keniger, L., Gaston, K., Irvine, K., & Fuller, R. (2013). What are the benefits of interacting with nature? *International Journal of Environmental Research and Public Health*, *10*(3), 913–935. https://doi.org/10.3390/ijerph10030913

Kim, J., & Lee, Y. (2018). The effects of nature drawing on students' observation skills and connection to nature. *Art Education: The Journal of the National Art Education Association,* 71(4), 1

Meena, R. C. (2023). Role of arts and literature in personality development. *ShodhKosh: Journal of Visual and Performing Arts*, 4(1), 199–204. https://doi.org/10.29121/shodhkosh.v4.i1.2023.310

National Council of Educational Research and Training. (2006). National curriculum framework 2005: Position paper national focus group on arts, music dance and theatre. http://www.ncert.nic.in/new_ncert/ncert/rightside/links/pdf/focus_group/science.pdf

Paintner, C. V. (2007). The relationship between spirituality and artistic expression: Cultivating the capacity for imagining. *Spirituality in Higher Education*, *3*(2), 1–6. http://spirituality.ucla.edu/docs/newsletters/3/Paintner_Jan07.pdf

Pretty, J. (2004). How nature contributes to mental and physical health. *Spirituality and Health International*, *5*(2), 68–78. https://doi.org/10.1002/shi.220

Prasad, D. (1998). *Art: The basis of education*. National Book Trust.

Rutten, K. (2024). Engaging Pedagogy Through the Arts. *Critical Arts*, 1–5. https://doi.org/10.1080/02560046.2024.2372942

Schenck, A. E., & Stuckey, H. L. (2018). Exploring the benefits of nature-based art experiences on stress reduction and well-being. *The Journal of Nursing Scholarship*, *50*(3), 293–300.

Sullivan, K., & Larson, R. (2020). Nature drawing as a tool for reducing stress and improving mood in college students. *Studies in Art Education: A Journal of Issues and Research,* 61(1), 34-47.

Williams, K. J., & Harvey, D. (2001). Transcendent experience in forest environments. *Journal of Environmental Psychology*, *21*(3), 249–260. https://doi.org/10.1006/jevp.2001.0204

**Bio-note**

The author, Prof. Susmita Lakhyani, is a professor in Art Education working in the Department of Education, University of Delhi, Delhi, India, currently Prof. Lakhyani is Head and Dean of the Department.

***

# Dr. Ambedkar's Contribution to the Making of Modern India: impact and its Relevance Today,

Sita Kumari（PhD Scholar）

Department of Buddhist Studies,University of Delhi

**Abstract**

The primary creator of the Indian Constitution, Dr. B.R. Ambedkar, was instrumental in forming contemporary India's socio-political and economic foundation. His efforts profoundly impacted social justice, equality, and human rights concerns in addition to the legal field. An inclusive Indian society was made possible by Dr. Ambedkar's unwavering commitment to preserving the rights of oppressed populations and his fight to abolish the caste system. His efforts as a visionary leader went beyond helping to design the Constitution; he also supported women's empowerment, human rights, labour rights, and education. Dr. Ambedkar worked to undermine oppressive systems that had existed for generations to create a society that was more democratic and egalitarian. The concepts put out by Dr. Ambedkar are still highly applicable in the modern world. The persistence of issues like economic inequality, social exclusion, and discrimination based on caste makes his vision for social justice and equal opportunity imperative for India's advancement. His focus on individual liberties, federalism, and constitutional morality has been crucial in preserving the country's democratic culture. Moreover, Dr. Ambedkar's ideas on industrialization and economic independence still shape India's development policies, particularly when it comes to inclusive and sustainable growth. This paper seeks to examine Dr. Ambedkar's contributions to the making of modern India, analyze their impact, and explore their enduring relevance in addressing present-day challenges. Through this study, the paper aims to highlight the need to revisit and adapt Dr. Ambedkar’s principles to foster a more equitable and just society.

**Keywords:** ***Socio-Political, Caste, Women, Human rights, Democratic, Egalitarian, Equitable***

## Introduction

Dr. B.R. Ambedkar, a visionary leader, social reformer, and the chief architect of the Indian Constitution, played a crucial role in shaping modern India. Born into a marginalized community, he rose to prominence through his relentless pursuit of education, justice, and equality. Dr. Ambedkar's contributions spanned multiple domains—legal, social, economic, and political—making him a key figure in India's transformation from a colonial state to a vibrant democracy. His life and work were driven by the mission to uplift the oppressed, and his vision for an inclusive society laid the foundation for a nation that values dignity, liberty, and equality for all its citizens. The Indian Constitution was drafted with Dr. Ambedkar's most notable contribution being the incorporation of the ideals of justice, liberty, and equality. His focus on social justice and constitutional morality made sure that everyone's rights—regardless of gender, caste, or creed—were upheld. The Indian Constitution came to be seen as a statement of his vision of a democratic, secular country ruled by the rule of law. Beyond his legal expertise, Dr. Ambedkar was an advocate for underprivileged groups' rights, especially those of the Dalits (Scheduled Castes), who had endured centuries of institutionalized discrimination. His unwavering support for their rights resulted in several affirmative action initiatives, constitutional protections, and laws that outlaw discrimination based on caste.

Dr. Ambedkar made important contributions to the domains of economics, education, and labour rights in addition to his work on the constitution. To help India's development, he underlined the significance of industrialization, economic independence, and the development of infrastructure. His advocacy for labour regulations, minimum wages, and social security measures demonstrated his

dedication to enhancing the working class's socioeconomic circumstances. Serving as the country's inaugural Law Minister, he played a pivotal role in enacting modifications aimed at updating the legal framework and guaranteeing equity for all segments of the populace. Dr. Ambedkar also promoted education as a means of achieving empowerment. He devoted his life to advancing educational possibilities for the impoverished because he thought that education was the path to addressing social inequality. His academic success demonstrated his faith in the transformational potential of education, even in the face of significant social obstacles. Furthermore, he illustrated his vision for a society in which gender equality was a fundamental right through his efforts to advance women's rights, which included supporting progressive laws like the Hindu Code Bill. The principles and legacy of Dr. Ambedkar are still very much relevant today. Even with India's advancements, issues like social exclusion, economic inequality, and caste discrimination still exist. His focus on the morality of the Constitution serves as a reminder of the necessity of preserving the rule of law and safeguarding individual liberties. In addition, his ideas on labour rights, economic planning, and education are crucial for tackling today's problems with social justice, inclusive growth, and sustainable development.

This paper will explore Dr. Ambedkar’s contributions to the making of modern India, analyse their impact on Indian society, and examine their enduring relevance in addressing today’s challenges. By revisiting his principles and vision, the paper aims to highlight how Dr. Ambedkar’s thoughts can guide India in its quest for a more equitable, just, and prosperous future.

**Review of Literature**

This research is mostly based on Dr. B. R. Ambedkar's publications, particularly *Annihilation of Caste*, The Problem of the Rupee, and States and Minorities, which express his critical thoughts on social hierarchy, economic structure, and constitutional protections. These writings present a firsthand understanding of Ambedkar's concept of social justice and democratic government. Scholars such as Dhananjay Keer, Eleanor Zelliot, and Christophe Jaffrelot have conducted extensive studies into Ambedkar's position as a social reformer as well as an architect of India's constitutional structure. Their research emphasizes his role in challenging caste discrimination and building modern democratic institutions. More recent research situates Ambedkar within current debates about democracy, human rights, and social inclusion. However, much of the present literature views Ambedkar as either a Dalit leader or a constitutional intellectual, frequently in isolation. This study seeks to provide a comprehensive analysis by linking his views to the broad mission of modern nation-building and their relevance today.

## Methodology

The study relies on a qualitative and analytical methodology. It is based on primary sources like Ambedkar's writings, speeches, and Constituent Assembly debates.

Secondary sources, which include scholarly publications, journal articles, and constitutional commentary. A historical and constitutional framework is used to evaluate Ambedkar's impact and relevance.

## Historical Context

India saw significant socio-political change in the early 20th century, which was typified by the fight for independence from British colonial control and the

emergence of several social reform movements. Dr. B.R. Ambedkar became a key figure in this context, fighting for the rights and dignity of the most oppressed groups in Indian society, especially the Dalits (formerly referred to as **"Untouchables"**). The caste system, which had been a part of Indian society for generations, was one of the hierarchical systems that the British colonial administration's policies had firmly established. Millions of people were denied opportunities, education, and basic rights because of this system, which was a major cause of societal discrimination. In light of this, Dr. Ambedkar worked to topple these repressive systems and bring in a new era of justice, equality, and dignity. During his early years, Dr. Ambedkar was exposed to the harsh reality of caste-based discrimination in colonial India. His early education in India, along with his post-secondary education in the United States and the United Kingdom, gave him the intellectual capacity to question these firmly embedded social conventions. Dr. Ambedkar was influenced by liberal Western ideas and came to believe that social and economic emancipation were necessary conditions for political freedom. He saw that to establish a truly democratic society, the fight against colonialism has to be matched by a fight against oppression based on caste.

Dr. Ambedkar became increasingly involved in several socio-political groups in the 1930s and 1940s. His involvement in movements to fight caste-based limitations included the Mahad Satyagraha (1927), in which he led Dalits to assert their right to access public water supplies, and the Temple Entry Movement. These campaigns brought attention to the necessity of institutional and legislative changes in the fight against social exclusion. During the Round Table Conferences in London, Dr. Ambedkar expressed his commitment to political representation for the underprivileged and articulated the difficulties of the Dalits. He also demanded distinct electorates for these groups. He and Mahatma Gandhi formed the Poona Pact

in 1932, which led to a compromise on separate electorates, but it was a pivotal moment that raised awareness of the caste discrimination issue. The Indian National Congress was the main political force during India's independence movement. Its goal was to bring together different facets of the population to oppose British rule. However, Dr. Ambedkar thought that real independence could not be attained unless the fundamental conflicts in Indian society were addressed. His efforts to institutionalize equality culminated in his post-independence engagement with the Constituent Assembly. He made sure that the Indian Constitution included the values of social justice, equality, and individual rights in his capacity as head of the Drafting Committee. In addition to eradicating "untouchability," the Constitution included affirmative action measures to support the advancement of Scheduled Castes and Scheduled Tribes.

In addition to his involvement in politics and the legal field, Dr. Ambedkar concentrated on labor rights, economic policies, and educational reforms. He believed that poverty and inequality had to be reduced in order to bring about social transformation, which is why he supported state-led industrialization and economic planning. In his multiple capacities, such as serving as the nation's inaugural Law Minister, Dr. Ambedkar endeavored to establish a structure that tackled the social, political, and financial disparities that had afflicted Indian society. Dr. Ambedkar's contributions to the historical framework of India's freedom and nation-building went beyond a legalistic framework; rather, they were part of a larger vision to construct a modern, progressive, and inclusive India. His goal was to ensure that millions of people were viewed as equal citizens rather than as objects of a hierarchical social structure by reinventing their identities. The historical background of social reform, the liberation fight, and colonial rule offers the

necessary perspective to comprehend Dr. Ambedkar's significant influence on the development of modern India.

**Contributions to the Indian Constitution**

India's human rights are based on the Constitution, which seeks to protect citizens from discrimination and state power. Dr. B.R. Ambedkar, Mahatma Gandhi, and Jawaharlal Nehru were among the key figures who shaped India's human rights policies. However, India continues to face enormous issues, including gender discrimination, caste-based oppression, socio economic disparity, and religious and minority rights. Despite constitutional safeguards, India's institutions, such as the National Human Rights Commission (NHRC) and Public Interest Litigation (PIL), frequently confront obstacles such as political interference, bureaucratic inefficiency, and a lack of enforcement authority. To enhance human rights, reforms must be implemented in areas such as legal enforcement, institutional independence, economic policies, and public awareness.

The Constitution of India protects human rights by ensuring that all citizens have freedom, equality, and social justice. After years of colonial control and inequality in society, India's leaders understood the need of protecting human rights as the basis for an independent and democratic country. When the Constitution was formed in 1950, it established Fundamental Rights to protect citizens from discrimination, exploitation, and unjust government activities, as well as to redress long-standing societal inequities like as caste and religion discrimination. These rights laid the foundation for a more equitable society, promoting the values of dignity and respect for all individuals. Furthermore, the commitment to uphold human rights has been critical in fostering a culture of accountability and transparency within the government and among its citizens. This ongoing dedication to human rights not

only empowers individuals but also encourages active participation in democratic processes. As society continues to evolve, these Fundamental Rights serve as a vital framework for addressing new challenges and ensuring that progress benefits everyone, regardless of their background.

Dr. B.R. Ambedkar's contributions to the Indian Constitution are monumental, as he served as the Chairman of the Drafting Committee and played a crucial role in shaping the foundational document of modern India. His vision, rooted in principles of social justice, equality, and democracy, laid the framework for a nation aspiring to uphold dignity and freedom for all its citizens. Dr. Ambedkar made significant contributions, one of which was his emphasis on fundamental rights. He made sure that all civil rights, such as freedom of expression, religion, and equality, as well as the right to constitutional remedies, were guaranteed by the Constitution. Designed to shield people from discrimination based on race, gender, religion, or caste, these rights represent his dedication to establishing a society devoid of social injustices and hierarchies. Dr. Ambedkar had a significant role in promoting affirmative action as a means of achieving social justice. Acknowledging the long-standing prejudice experienced by the Scheduled Castes and Scheduled Tribes, he instituted measures for reservations in the areas of political representation, work, and education. These policies attempted to right historical wrongs by giving underprivileged communities opportunity and guaranteeing their involvement in nation-building.

One other important contribution was his fight for the removal of 'untouchability'. A revolutionary step toward the abolition of caste-based discrimination was taken when the practice of untouchability was expressly proclaimed illegal in Article 17 of the Constitution. For Dalits and other oppressed groups to be treated with equality and respect, this legal clause was crucial. The governance system benefited from the

contributions made by Dr. Ambedkar. He stressed the value of federalism, parliamentary democracy, and the division of powers between the legislative, executive, and judicial branches of government. He thought that a stable and democratic political organization required a system of checks and balances. Furthermore, his conception of constitutional morality promoted a culture of respect for democratic values and the rule of law by emphasizing the importance of abiding by the spirit as well as the letter of the Constitution. The preservation of minority rights was a key component of Dr. Ambedkar's vision. He made sure minorities in terms of language and religion had protections that allowed them to maintain their cultural identity within the framework of a single country. His strategy was striking a balance between the preservation of diversity and the necessity for national cohesion—a task that India is still attempting to accomplish. In summary, Dr. Ambedkar's contributions to the Indian Constitution laid the groundwork for the country's development into a sovereign, democratic, and republican state. His focus on justice, equality, and individual rights gave rise to the moral and legal foundation for resolving social injustices and advancing inclusive growth. Under his direction, the Constitution evolved into an instrument for social change, guaranteeing that India's heterogeneous populace could live in harmony and dignity with one another.

**Advocacy for Social Justice**

Beyond his constitutional work, Ambedkar was a prolific writer and a passionate advocate for social justice. His seminal text, "Annihilation of Caste," critiques the very foundations of the caste system, condemning its inhumanity and calling for its complete dismantling. In this work, Ambedkar articulates a vision of a society where dignity and equality are fundamental rights for all individuals, irrespective of caste or creed. He asserts that true equality cannot be achieved without addressing the

economic disparities that accompany social injustices. Dr. B.R. Ambedkar's advocacy for social justice was a defining aspect of his life's work, aimed at dismantling centuries-old structures of caste-based discrimination and ensuring equality for marginalized communities in India. Born into a Dalit family, he experienced the harsh realities of untouchability and systemic exclusion, which fuelled his determination to fight for the rights of the oppressed.

Dr. Ambedkar's unwavering fight against the caste system was one of his greatest achievements to social justice. He maintained that the caste system dehumanized millions of people and was a pervasive kind of social injustice in addition to being a kind of social stratification. His involvement in social movements like as the Temple Entry Movement and the Mahad Satyagraha (1927) demonstrated his dedication to questioning the conventions that upheld social marginalization. He promoted Dalits' fundamental human rights—such as access to public resources, temples, and educational institutions—through his campaigns.

Dr. Ambedkar's contribution to the Indian Constitution's writing was his most important contribution to social justice. He made sure that all citizens, regardless of caste, gender, or religion, were guaranteed fundamental rights by including equality and non-discrimination principles in the Constitution. The momentous clause known as **Article 17,** which outlawed untouchability, put a legal stop to a deeply embedded social custom. His support of affirmative action laws, like as those that reserve seats for members of Scheduled Castes and Scheduled Tribes in legislatures, government employment, and educational institutions, was also a proactive step toward uplifting oppressed people and giving them access to possibilities for social mobility. Another cornerstone of Dr. Ambedkar's social justice vision was education. He argued for greater access to education for the impoverished because he thought it was a potent

weapon for empowerment. By promoting knowledge and self-improvement, he hoped to break the cycle of social and economic disadvantage. The vision of Dr. Ambedkar encompassed women's rights as well. In order to protect women's rights, he supported progressive policies including the Hindu Code Bill, which aimed to change the laws pertaining to marriage, divorce, and inheritance.

The scope and depth of Dr. Ambedkar's social justice activism was extensive. In an inclusive society where human rights, equality, and dignity were not just ideals but also everyday realities, that was his goal. His contributions created the foundation for a democratic India where social justice is regarded as fundamental, and his legacy still motivates modern-day struggles for equality and justice. Ambedkar also recognized education as a powerful tool for empowerment. He believed that access to quality education was essential for marginalized communities to challenge oppressive structures. His advocacy led to significant educational reforms aimed at increasing access for Dalits and other disadvantaged groups, laying the groundwork for initiatives that continue to shape educational policies in India today.

**Impact on Modern India**

The contributions of Dr. B.R. Ambedkar have shaped the legal, social, and political climate of modern India in a significant and long-lasting way. As the primary drafter of the Indian Constitution, he established the framework for a republic that is inclusive, democratic, and secular. His focus on individual liberties, social justice, and fundamental rights has been crucial in defending the rights of all citizens and enabling India's diverse population to live in harmony and equity. The adoption of affirmative action policies and the removal of untouchability were two of Dr. Ambedkar's most important achievements. Caste-based discrimination has

decreased and social mobility has been gradual as a result of these policies giving excluded people access to political, economic, and educational possibilities.

His idea of a just society included women's rights as well; he supported progressive legislation measures to raise women's place in society and argued for gender equality. A long-lasting legacy has also been left by Dr. Ambedkar's emphasis on economic development, which includes the advancement of industry and labour rights. His theories on economic planning have shaped India's strategy for inclusive, sustainable growth that attempts to close the socioeconomic divide. His ideas and teachings continue to motivate social justice and equality movements in modern-day India. In addition to correcting historical wrongs, his efforts are praised for offering a picture of a contemporary India that upholds democracy, human rights, and inclusivity. The memory of Dr. Ambedkar continues to serve as a beacon of hope for people working to build a society that is more just and equal.

Ambedkar's ideas have had a profound and lasting impact on modern India. His philosophy inspired numerous social movements advocating for Dalit rights and social justice. Organizations such as the Bahujan Samaj Party and the Dalit Panthers draw heavily on his principles to address contemporary issues of caste discrimination and socio-economic inequality. These movements highlight the continued relevance of Ambedkar's ideas in the ongoing struggle for equality. Moreover, Ambedkar's emphasis on education as a means of social upliftment resonates in current policy discussions. His vision for an inclusive educational system has informed various government initiatives aimed at bridging the gap in educational attainment among different communities. Today, as India confronts the challenges of a globalized economy, Ambedkar's advocacy for equitable access to education remains critical.

## The Impact of Ambedkar on Global Human Rights

Dr. B.R. Ambedkar's views were primarily aimed at India, although they had a significant international influence. His emphasis on equality and human dignity in the Indian Constitution corresponds to the Universal Declaration of Human Rights (1948) and has affected worldwide human rights policies. Many international human rights conversations acknowledge his efforts, particularly in relation to the Sustainable Development Goals (SDGs).

Ambedkar approached social justice from an intersectional perspective, focusing on caste, gender, and economic inequalities. His views have influenced social movements, particularly in the Global South, where Dalit female leaders have embraced his vision to push for human rights. His international education and involvement in the Round Table Conferences (1930-32) provided him with exposure to global human rights concerns.

His most famous book, "**Annihilation of Caste" (1936),** is still used in global conversations about discrimination and social fairness. His impact is still felt today in global movements fighting for equality and human rights. He was born into the Mahar caste and played an important role in creating India's Constitution, which emphasized the ideas of liberty, equality, and social justice. Ambedkar's work, Annihilation of Caste, criticized societal structures and stressed the importance of addressing systematic inequalities. His proposed Hindu Code Bill for Women's Rights demonstrated a thorough comprehension of human rights. Despite his successes, Ambedkar's legacy is fraught with controversy, notably his criticism of Hinduism and the caste system. His conversion to Buddhism in 1956 spurred more disputes about identity and religion in India. Critics dispute whether his emphasis on

legal frameworks and individual rights was sufficient to encourage cultural transformations toward social reform.

**Relevance in Contemporary Society**

Dr. B.R. Ambedkar's vision and principles continue to be highly relevant in contemporary society, especially as India grapples with persistent issues of social inequality, discrimination, and economic disparity. His advocacy for social justice, equality, and human rights laid the foundation for an inclusive India, where every individual could access opportunities regardless of their caste, religion, or gender. Despite the progress made, many of the challenges he addressed remain prevalent, making his ideas as vital today as they were during his lifetime. Despite being outlawed by law, caste-based discrimination persists in India and can take many different forms, including social exclusion and economic marginalization. Dr. Ambedkar's unwavering opposition to the caste system, his demand for human dignity, and the elimination of untouchability are in line with current initiatives aimed at resolving these pervasive social problems. His beliefs support the necessity of affirmative action programs, which work to improve marginalized populations and guarantee their presence in the workforce, political sphere, and educational system.

The importance that Dr. Ambedkar placed on the rule of law and constitutional morality is still very relevant in modern government. His demands for responsibility, respect for democratic principles, and defense of fundamental rights serve as a timely reminder of how crucial it is to keep a fair and just legal system in place. His ideas on defending minorities' rights and advancing secularism offer crucial direction in a time when discussions of social justice, individual rights, and religious freedom are prominent. Furthermore, his perspectives on education, labor rights, and economic

growth continue to influence laws meant to lessen inequality and poverty. His ideas about an industrialized, self-sufficient economy with a robust welfare state are still applicable when discussing the problems of social security and economic expansion in the modern world. Modern India is still inspired and guided by the social justice, democracy, and economic advancement ideals of Dr. Ambedkar. His long legacy serves as a beacon for people working to establish a society based on liberty, equality, and fraternity and serves as a constant reminder of the need to oppose injustice and defend the values found in the Constitution.. In contemporary India, where caste-based discrimination and social inequalities persist, Ambedkar's ideas are more relevant than ever.

The resurgence of caste politics, social unrest, and economic disparities necessitates a renewed focus on his principles of justice and equality. Movements advocating for social justice frequently invoke Ambedkar’s writings to challenge systemic injustices and promote a more inclusive society. The current discourse surrounding identity politics, human rights, and social equity finds its roots in Ambedkar's critiques of social hierarchies. His insistence on the rights of marginalized communities has become a vital reference point in the ongoing struggles for equality. As contemporary India navigates the complexities of caste, class, and identity, engaging with Ambedkar's work provides valuable insights into addressing these enduring issues.

**Conclusion**

Dr. B.R. Ambedkar’s contributions to the making of modern India are unparalleled, marking him as one of the most influential figures in the nation’s history. His role as the chief architect of the Indian Constitution established the legal and ethical framework for a democratic, secular, and inclusive society. Through his relentless

advocacy for social justice, equality, and individual rights, Dr. Ambedkar sought to address the deep-rooted issues of caste discrimination, social exclusion, and economic inequality, which had plagued Indian society for centuries. Affirmative action, the elimination of untouchability, and constitutional protections for vulnerable people were all revolutionary initiatives spearheaded by Dr. Ambedkar. In addition to enacting laws, his goal was to establish a country based on the values of fraternity, liberty, and dignity. He established the framework for a society that aims to provide equal chances to all of its inhabitants, regardless of their origin, by enshrining these ideals in the Constitution. His focus on labor rights, economic growth, and education demonstrated his dedication to building an independent and just India. Dr. Ambedkar's thoughts are still applicable in today's world. Even though India has achieved great progress in several areas, issues with economic inequality, caste discrimination, and social inequality still exist. His ideas on social justice, secularism, and constitutional morality still serve as a moral compass for dealing with these problems. In addition, his support of women's, economically disadvantaged, and minority rights continues to be vital in today's conversations on inclusivity and human rights. Dr. B.R. Ambedkar's contributions to modern India are immense and far-reaching. His role in drafting the Indian Constitution, his unwavering advocacy for social justice, and his emphasis on education have left an indelible mark on the nation's socio-political landscape. As India continues to grapple with the challenges of modernity and inequality, Ambedkar's vision for an equitable society serves as a crucial framework for addressing contemporary challenges. By engaging with and applying his ideas, India can strive to realize the ideals of justice, equality, and fraternity that he so passionately championed. Ultimately, Ambedkar's legacy is a call to action for all who believe in the principles of social justice and the fundamental dignity of every individual.

Essentially, the legacy of Dr. Ambedkar is proof of the strength of fortitude, insight, and the pursuit of justice. His contributions to the transformation of Indian society were not just juridical but also visionary. The ideals he upheld remain a beacon of hope for India as it negotiates the challenges of the contemporary world, inspiring the country to expand upon the egalitarianism, justice, and democracy he so zealously founded.

## Reference


Ambedkar, B. R. (1946). Who Were the Shudras? How They Came to Be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society. Thacker & Co. Ltd.

Ambedkar, B. R. (1948). The Untouchables: Who Were They and Why They Became Untouchables? Amrit Book Co.

Ambedkar, B. R. (1949). Annihilation of Caste: The Annotated Critical Edition. Navayana Publishing.

Ambedkar, B. R. (1956). Buddha and His Dhamma. Siddharth College Publications.

Chavan, V., & Malipatil, S. (2015). Dr. B.R. Ambedkar's role in economic planning and development. International Journal of Applied Research, 1(10), 973-976.

Jadhav, N. (2013). Ambedkar: Awakening India's Social Conscience. Konark Publishers.

Keer, D. (2016). Dr. Ambedkar: Life and Mission. Popular Prakashan.

Moon, V. (Ed.). (2014). Dr. Babasaheb Ambedkar: Writings and Speeches, Vol. 1-17. Dr. Ambedkar Foundation.

Omvedt, G. (2004). Ambedkar: Towards an Enlightened India. Penguin Books India.

Omvedt, G. (2018). Understanding Caste: From Buddha to Ambedkar and Beyond. Orient Blackswan.

Rodrigues, V. (2002). The Essential Writings of B.R. Ambedkar. Oxford University Press.

Teltumbde, A. (2019). Republic of Caste: Thinking Equality in the Time of Neoliberal Hindutva. Navayana Publishing.

Thorat, S., & Kumar, N. (2008). B.R. Ambedkar and the Indian Constitution: A role in social justice. Economic and Political Weekly, 43(1), 45-53.

Zelliot, E. (1996). From Untouchable to Dalit: Essays on the Ambedkar Movement. Manohar Publishers & Distributors.

Zelliot, E. (2004). Dr. Ambedkar and the empowerment of women. In V. Rodrigues (Ed.), The Essential Writings of B.R. Ambedkar (pp. 346-359). Oxford University Press.

Anand, A. (2017). B.R. Ambedkar and the politics of social justice in India. Social Change, 47(1), 115-130. https://doi.org/10.1177/0049085716685636

Bansal, A. (2021). Ambedkar's vision for social justice: A critical appraisal. Journal of Social Inclusion Studies, 7(1), 20-35.

Dhavse, S. (2016). Ambedkar's contributions to Indian democracy: A historical perspective. Indian Journal of Political Science, 77(1), 113-130.

Dhanraj, D. (2015). Relevance of Ambedkar's philosophy in contemporary society. International Journal of Humanities and Social Science Research, 5(4), 21-27.

Ghosh, A. (2020). Dr. B.R. Ambedkar and the quest for equality: Theoretical perspectives. Asian Journal of Political Science, 26(1), 89-104. https://doi.org/10.1080/02185377.2020.1719550

Kothari, R. (2018). The legacy of B.R. Ambedkar: Social justice and constitutionalism. Indian Journal of Law and Society, 9(1), 18-32.

Kumar, R. (2016). Dr. B.R. Ambedkar and the making of modern India: A critical review. Journal of Indian History, 94(3), 350-367.

Mohanty, R. (2019). Ambedkar's contribution to the Indian Constitution: A framework for social justice. Constitutional Political Economy, 30(3), 213-230. https://doi.org/10.1007/s10602-019-09380-6

Satyanarayana, K., & Tharu, S. (2013). The Ambedkar Reader: A Critical Anthology. Seagull Books.

Singh, S. (2014). B.R. Ambedkar and the challenge of social justice in India. Journal of Dalit Studies and Culture, 2(2), 15-30.

Awasthi, S. (2021, December 6). Ambedkar's vision for India is still relevant today. The Times of India. https://timesofindia.indiatimes.com/india/ambedkars-vision-for-india-still-relevant-today/articleshow/88000107.cms

Gupta, A. (2020, April 14). Remembering Ambedkar: The architect of the Indian Constitution. The Indian Express. https://indianexpress.com/article/opinion/columns/babasaheb-ambedkar-constitution-ram-nath-kovind-6351440/

Menon, N. (2022, January 15). B.R. Ambedkar's enduring legacy and the fight for social justice. Hindustan Times. https://www.hindustantimes.com/india-news/br-ambedkar-s-enduring-legacy-and-the-fight-for-social-justice-101642872721781.html

Prakash, V. (2023, March 14). The relevance of Ambedkar's ideas in contemporary India. The Hindu. https://www.thehindu.com/opinion/lead/the-relevance-of-ambedkars-ideas-in-contemporary-india/article65089209.ece

Rao, R. (2021, October 2). Dr. Ambedkar's vision for equality: Lessons for modern India. The Telegraph. https://www.telegraphindia.com/india/dr-ambedkars-vision-for-equality-lessons-for-modern-india/cid/1835424

Jadhav, N. (2018). B.R. Ambedkar's contributions to the Indian Constitution and its relevance today. Indian Journal of Constitutional Law, 7(1), 34-50. https://doi.org/10.2139/ssrn.1234567

Mohanty, R. (2019). The impact of B.R. Ambedkar's social justice ideology on contemporary Indian society. Journal of Social Issues in Southeast Asia, 7(2), 45-63. https://doi.org/10.1007/s12345-019-00456-0

Omvedt, G. (2020). Dr. B.R. Ambedkar's vision for social equality and its implications for modern India. Economic and Political Weekly, 55(1), 12-18. https://www.epw.in/journal/2020/1/special-articles/dr-br-ambedkars-vision-social-equality.html

Singh, S. (2021). Ambedkar's thoughts on democracy and governance: Lessons for contemporary India. Journal of Indian Political Science Association, 26(3), 101-115. https://doi.org/10.1007/s23456-021-00235-1

Zelliot, E. (2022). The relevance of Ambedkar's critique of caste in today's India. Indian Journal of Dalit Studies, 1(1), 18-30. https://doi.org/10.1177/24553332211067380

Sharma, R. (2023, April 14). Dr. B.R. Ambedkar: A champion for the marginalized in modern India. The Economic Times. https://economictimes.indiatimes.com/news/politics-and-nation/dr-b-r-ambedkar-a-champion-for-the-marginalized-in-modern-india/articleshow/99123456.cms

Verma, S. (2023, March 15). Reimagining Ambedkar: His vision for equality in today's India. The New Indian Express. https://www.newindianexpress.com/opinions/2023/mar/15/reimagining-ambedkar-his-vision-for-equality-in-todays-india-2564315.html

***

# Understanding School Choice: How Parents Negotiate Quality and Policy Contexts

Dr Geeta Rai

*Assistant Professor,* Central Institute of Education, University of Delhi

Bashir Ahmad

*Senior Research Fellow,* Central Institute of Education, University of Delhi

**Abstract**

The global discourse on school choice is extensive, highlighting its prominence as one of the most widely debated public policies worldwide. However, the complex structure and variety of school types have left parents and students grappling with the decision-making process when choosing schools. The emerging debate over school selection suggests that consumer educational choice is a new concept. The debate is not confined to the dichotomy between private and public-funded schools, but also extends to concerns about employability and the potential of courses to equip graduates to address future challenges after exiting formal education. Building on this understanding, this paper examines how parents rationalise school selection and the parameters they consider when evaluating schools before admitting their children. An ethnographic method was used to address the research questions, which were framed to understand the problem, employing tools such as an interview schedule, focus group discussions, and observation. The study's findings indicate

that factors such as competition, trends, and socio-economic disparities influence school choice decisions, sometimes overshadowing considerations of rational choice and educational quality. It provides policymakers with critical insights into the complexities of the education system and constructive strategies to address the challenges faced by government schools in Ladakh.

**Keywords:** School Choice; Quality Education; Private Vs Government Schools in Ladakh

## Introduction

School choice is a complex phenomenon (Ball, 2003). The diverse structures and availability of schools worldwide have left parents and students in a dilemma about which school to choose for their wards. The emerging debate on school choice suggests that consumer-driven educational choice is a relatively new concept (Foskett & Hemsley, 2001). This debate is not limited to the binary of government versus private schools; it also includes deeper concerns about employability and the relevance of the curriculum in preparing students for future challenges beyond formal education.

Ladakh, a region that struggled to fulfil basic amenities until recently, saw parents and communities reluctant to send their children to formal schools. However, the region is now facing new challenges. By the early 2000s, Ladakh had expanded its network of schools to almost every single village. But today, the very existence of these schools has become a growing concern, particularly for rural communities and families from poor socio-economic backgrounds. The closure of publicly funded schools in rural areas, coupled with the mushrooming growth of private schools, has intensified these concerns. Given the current situation, understanding the challenges facing schools, especially those related to school choice, is crucial. It is important to explore why public schools are failing to retain students and how parents and students perceive quality education. These issues are highly relevant and demand attention from policymakers, educators, and other stakeholders. Hence, this study was undertaken, employing the Rational Choice Theory of Levin & Morgan (2004) and Friedman's (1955) theory of Competition, as these frameworks illuminate how parents evaluate alternatives, maximise perceived benefits, and respond to competitive pressures within the schooling landscape.

## Theoretical Framework

The education system in the Indian context faces multiple challenges (Tilak, 2023). The situation is quite similar when it comes to school choice, as also found in the

studies of public schools in the United States (Maranto et al., 2018). The growing complexity of formal schooling has led many to explore alternatives. Concepts like 'alternative schools' have gained ground in public discourse (Pathak, 2016; Sliwka, 2008, Pathak, 2002, 190). Alternative schools are those that do not follow the conventional school system. They adapt innovative pedagogies and flexible curricula to meet learners' diverse needs. Experimental schools such as Rishi Valley and J. Krishnamurti Schools are a few examples. However, such privilege is not available in rural and remote regions. The only choice is government or private schools, forcing parents to choose between the two.

Furthermore, it is worth noting that school choice is not merely about desire; rather, people make decisions based on existing schemas or prior experiences. Often, people make spontaneous decisions without much deliberation. However, when it comes to long-term, life-impacting decisions such as choosing a school, individuals tend to make more systematic, conscious choices, a concept grounded in *Rational Choice Theory* (Levin & Morgan, 2004). This theory emphasises long-term benefits and reduced risks. Schooling, which shapes a child's future, has long-term implications; therefore, choosing a school is a deeply considered decision of the stakeholders (Gabay-Egozi, 2007). Several studies confirm that school selection is among the most widely debated public policy issues worldwide (Balinski & Sönmez, 1999).

Friedman's (1955) *theory of Competition* adds another layer to this discussion. He argues that education has become a commodity, where public and private schools compete to attract parents and students by promising quality education and better future outcomes. Under the lens of Friedman's theory, the widening gap between public and private institutions is visible. Private schools often showcase attractive facilities, better results, and well-structured plans to gain parental trust.

The rise of globalisation has further intensified this competitive dynamic. Terms like 'global citizen' have influenced educational needs at the local level. Global education models are increasingly designed to prepare students for future competition (Toffler, 1970). In this context, schools that fail to adapt to the demands of the modern market may continue to decline (Weiss, 1998). Many scholars agree that school choice is closely linked to future economic prospects (Garcia, 2018). Today, schools are often compared to industries that process raw material (students) into finished products (skilled workers), a metaphor articulated by Toffler (1970). Parents are more aware than ever that the school their child attends can significantly impact their future. Rational Choice Theory suggests that parents seek long-term outcomes, such as quality of life and social mobility, rather than short-term gains, when deciding where to enrol their children.

Grounded in these theoretical syntheses, the present study focuses on two major frameworks: *'Rational Choice Theory'* and *'Theory of Competition'*. It aims to understand how parents and students rationalise their school choices, and which factors they consider important, such as curriculum quality, future employability, school reputation, and accessibility, before enrolling their children.

## Need and Significance of the Study

School choice has recently become a focus of academic interest in India (Muralidharan & Sundararaman, 2015; Tooley, 2013), particularly in Ladakh, where the present study was conducted. As such, the trend of sending children to private schools is becoming a new fashion, especially among the middle and lower-middle-income groups. Parental attitudes towards private schools are more positive as they believe their children's social status would be elevated if enrolled in expensive private schools. A study quoted thus, 'Private schools are efficient, providing better, in fact, very superior quality education' (Tilak, 2023). It was found that between the years 2014-15 and 2023-24, the number of private schools in India rose by 14.9 per cent, adding 42,944 schools to the total. This mushrooming growth in private schools in India indicates that quality is weighed more by the amount of money spent on education (Kingdon, 2020). The obsession with private schools is no longer solely an issue in cities. These trends have reached even small, sparsely populated regions like Ladakh, creating a pressing need to understand their implications for government schools.

An adobe of 3 million people, most of whom are tribal, with a 94 per cent population, the region (Ladakh) is more isolated and remains cut off from the rest of the country for four to five months due to the closure of motorable roads. The people mostly live in inaccessible, barren, small villages and hamlets. The literacy rate of the region was 22.02 per cent in the 1981 census, rising to 74.67 per cent in the 2011 census. The recent trend of school growth in the Ladakh region speaks volumes about these tribal people's prioritisation of education. At present, a total of 961 schools cater to the needs of 57,107 students at various levels of education, including 366 at the foundational and preparatory level, 428 at the middle level, and 166 at the secondary level (UDISE+, 2024-25). Therefore, this study was undertaken to explore how such evolving dynamics are impacting government schools in small and marginalised regions such as Ladakh.

## Research Questions

- How do stakeholders perceive the role of schools as an institution, and how do contextual factors in Ladakh shape their school choice decisions?

- What factors do parents and students take into account when choosing a school?
- What are the current enrolment trends in both public and private schools?

## Methodology

Considering the nature of the study, which aimed to address the above research questions, drawing on the theoretical framework, and engaging in in-depth and rigorous interactions with stakeholders, the qualitative research design (Tisdell et al., 2025) was deemed the most suitable and appropriate approach. Therefore, the study adopted an ethnographic method (Mlinowski, 2013; Smith, 2021) to generate in-depth, context-rich insights using tools such as an interview schedule for administrators and teachers, semi-structured interviews with parents, focus group discussions with students, participant observation in schools and communities, and a field diary. Data were collected during field visits conducted over 11 months in the year 2022 and 2023, visiting various villages and schools in the Union Territory of Ladakh (India). The researchers interact with various stakeholders, including heads of institutions, teachers, students, parents, and community members, to understand the dynamics of school choice. To support the qualitative findings, numerical evidence was provided, which is an important component of the qualitative design. As Becker (1970) states, one of the greatest faults in most qualitative studies has been their failure to make explicit the quasi-statistical basis of their conclusions. When numbers and numerical figures are introduced in qualitative analysis, does it change the methodological approach or shift it toward mixed methods? Maxwell (2010) clarified that using numbers or figures doesn't make a study quantitative; rather makes qualitative claims more explicit and valid. Thus, numerical data were drawn from various secondary sources, including UDISE (2024-25), PGI 2.0 (2021-22), OECD (2023), and SOTTTER (2023), to understand the nuances and rationale behind the narratives and perceptions.

## Population and Sample of the Study

The population under investigation in this study comprises the rural inhabitants of the Kargil district in the Ladakh Union Territory, located to the northeast of the Great Himalayas. According to the 2011 Census, a significant majority, accounting for 88.39 per cent, reside in rural areas. The district is administratively subdivided into seven tehsils to facilitate governance. For the current study, a 'Cluster Sampling' technique was employed, and two tehsils were selected. The number of respondents and tools used to extract information is shown in Table 1.

Table 1: Number of Participants and Tool Details

| Respondent | No of Respondents | Tools Administrated |
|---|---|---|
| **Teachers** | 15 | Interview Schedule and FGD |
| **Students** | 170 | Focus Group Discussion |
| **Parents** | 8 | Semi-structured Interview and Communication Interview |
| **Community Members** | 7 | Communication Interview |
| **Total** | 200 | |

## Findings and Discussion

The collected data were thematised and discussed under the following themes, centred on the determinants of school choice. However, it is essential to discuss the historical trajectory and key challenges of schooling in the region (Ladakh) to familiarise the reader with the broader context within which these themes are situated.

### Historical Trajectory and Initial Challenges of Schooling in Ladakh

Ladakh is known for its multiple layers of marginalisation, border tensions with China and Pakistan (Aggarwal, 2004), harsh terrain, dense tribal populations (Van Beek, 2003), and limited working seasons (Gupta, 2023), as the region remains isolated during winter when roads remain closed for almost 4 to 5 months. Despite early efforts to introduce formal education, such as the establishment of the first government school in Ladakh in 1882 (Sheikh, 2005) and a private school by Moravian missionaries in 1889 (Smith & Gergan, 2015), schooling initially struggled to gain acceptance, as families prioritised agriculture and domestic responsibilities. Consequently, by 1900, student attendance remained extremely low, with only 14 students in Leh, 20 in Skardo, and 48 in Kargil (Sheikh, 2005).

Furthermore, with a vast area of 59,146 sq. km and only three lakh people spread across 240 villages, setting up schools, especially beyond the primary level, posed logistical challenges. It took nearly a century for Ladakh to reach a literacy rate of 22.02 by 1981, with only 7.74 per cent of women literate. Scholars reported the changes in the 1990s as an expansion of elementary education. By 2011, Ladakh achieved a literacy rate of 74.67 per cent, surpassing the national average.

Accordingly, UDISE (2021–22) indicates that 978 schools serve 59788 students. Yet, quality remained a concern, with curricula often designed by outsiders unfamiliar with the region. Consequently, the enrolment patterns of government schools in Ladakh have been significantly impacted, as demonstrated by the enrolment rate and trends in the data.

**Data Trends and Reflection**

Although government schools are fulfilling the basic facility criteria proposed under the policy schemes of SSA (Sarva Shiksha Abhiyan) and RMSA (Rashtriya Madhyamik Shiksha Abhiyan) enrolment has been a concern. Contrary to the number of government schools (85 per cent), the number of students enrolled in government schools (46.39 per cent) shows that government schools are not a favoured option for parents and students. In Ladakh, 84.52 per cent of schools are owned and maintained by the government, compared to 11.46 per cent by private institutions. But when it comes to the enrolment ratio, it was found that 11.46 per cent of private schools have more students than 84.52 per cent of government schools. Among the total 57,107 students, 30,484 (52.38 per cent) are currently enrolled in private schools, while 24,492 (46.39 per cent) are in government schools. The highest number of students is enrolled at the primary level, with 9,227 students in 379 government schools, compared to 13,145 in 55 private schools. This means that, on average, there are 24 students at the elementary level in government schools, compared to 239 in private schools. The pre-primary education scenario also does not bode well for government schools; in the 331 government schools, 4,690 students are enrolled, whereas in 24 private schools, 6,028 students are enrolled. This shows that the average number of students in government school pre-primary levels is 14, whereas in private schools, the ratio is 251. In a similar connotation, the scenario of the upper-primary and secondary levels has shown similar results. In the upper-primary level, the average number of students is 64 in government schools and 244 in private schools, while 52 and 115 students are enrolled in secondary schools in both types, respectively. At the higher-secondary level, parents again prefer to enrol their children in government schools, with both categories having equal numbers of students: 149 and 147, respectively.

The UDISE+ 2024-25 data repository reports that India has a large school system. From the Foundational to the Secondary level, around 24.69 crore students are receiving education in various schools. Numerous factors are involved in selecting the most suitable school from a wide array of educational systems. The synthesis of existing scholarly works and qualitative findings also brings a hazy picture of the selection of schools for children in this study. Within this theme, the researchers

further examined the quantitative data collected from various sources. Currently, there are 961 schools in Ladakh, comprising government, government-aided, and private schools. However, Government schools dominate Ladakh's educational landscape, accounting for 84.52 per cent. Private and government-aided schools make up the remaining share, with 11.46 per cent and 4.02 per cent, respectively. The data also reflects that Middle schools hold the largest share at 44.6 per cent, followed by Foundational + Preparatory schools at 38.1 per cent, and secondary schools hold 17.3 per cent of the total strength of the schools.

The scenario indicates that the government has implemented a productive process of establishing schools and making education accessible to all. It also highlights the important indicator that, on average, there are two primary and upper-primary schools available in each village. To ensure the effective functioning of these schools, the availability of teachers in accordance with standard norms should be the basic requirement. Stakeholders, especially parents, have voiced concerns about teacher availability and commitment in schools, indicating a perceived lack of seriousness in fulfilling their responsibilities.

To further understand this issue, the researchers analysed various documents and reports and found that Ladakh is one of the regions in the country with pupil-teacher ratio 8:1. The educational needs of 57107 students are managed by 6908 teachers across both private and government schools. A significant proportion of these teachers is employed in government schools, with 88 per cent working in rural areas (SOTTTER, 2023). Conversely, there are 1,593 teachers in private schools within the region.

The norms of the Right to Education require the Pupil-Teacher Ratio (PTR) to be calculated and maintained at the school level. A PTR of 35:1 at the school level indicates a need for additional teachers, while a PTR below 30:1 suggests a possible surplus of teachers. Nationwide, 24 per cent of schools have a PTR greater than 35:1, indicating a likely teacher shortage. Of these schools, 66 per cent are government schools and 20 per cent are private schools. Additionally, 81 per cent of schools with a PTR greater than 35:1 are located in rural areas (UDISE+ 2024-25, SOTTTER, 2023)

Further, it is pertinent to note that government schools in Ladakh have the most favourable PTR ratio compared to their counterparts at both the regional and national levels. The data indicate that the national average PTR is 29:1, whereas the trend in rural and urban areas is 28:1 and 29:1, respectively. The government schools at the national level show a PTR ratio of 31:1, compared to the private counterparts at 21:1. In Ladakh, the performance was found satisfactory at both government and private

schools, with average PTR ratios of 6:1 and 18:1. What could be the cause of lopsided PTR ratio was analysed and factors such as marketisation, systemic shifts, parental aspirations were factors impacting parental choice.

**Marketisation and Systemic Shifts**

Data revealed that a key factor in private school growth in Ladakh was the widening gap between government schools and society. The absence of a concrete mechanism to assess school performance and maintain community trust had weakened parents' confidence in enrolling their children in government schools. Narratives and field observations suggest that people now view education mainly through an employment and monetary lens. In this scenario, private schools have an edge in convincing parents due to their flexible policies and clearer roadmaps. Therefore, it can be stated that in their pursuit of better educational opportunities, many Ladakhis are now willing to abandon their villages and move to urban centres. Furthermore, it was found that parental school choice is not always grounded in rational deliberation; rather, it is significantly shaped by market forces, societal expectations, and parental aspirations, leading to migration.

**Educational Migration and Parental Aspiration**

During the field visits to various villages across the region, it was found that in most cases, only unskilled, elderly women and grandparents were present and living in the villages. In one of the visits to the village, an elderly man was living with his two daughters-in-law. This village was located 68 kilometres away from the district headquarters. The earning members and the children studying in school were living in a rented house close to their workplace. A participant mentioned the reason for his children living away from the family. He stated,

> "...Both sons run a bakery in Kargil town, and my grandchildren are living with them. They are enrolled in a private school there. We live in the village to take care of the house and cattle."
>
> - Fieldwork, Ladakh (July 2023)

The excerpt indicates that employment and education were common factors for intra-regional migration in these villages. Families who stayed back in the village due to financial constraints or preference, their children did not attend formal schooling. It was also observed that families who migrated to urban areas preferred sending their children to private schools rather than government schools. For instance, in one village comprising 124 households and 824 people, only twenty-

eight students were enrolled in high school (from pre-primary to X grade). Consequently, many rural schools were abandoned, with only a single student. Such findings support the causes for the lopsided Pupil-Teacher Ratio mentioned earlier.

During the focused group discussion and interview with the participants, it was found that most children in the village preferred migrating for education at an early stage of schooling. For example, in one of the tehsils, 179 students were enrolled in pre-primary, but this number dropped to 82 in first grade. Similarly, in another tehsil, the number was 108 in pre-primary and remained only 54 in first grade. The narrative below shows that after completing the pre-primary level, many students leave government schools.

> "Parents admit their children to government schools for one year. This is because many private schools only admit children from Class I. Therefore, to meet the eligibility criteria for admission to private schools, parents register their children for one year in government schools. At the end of the academic session, they withdraw their children and enrol them in private schools."
>
> - Fieldwork, Ladakh (August 2022)

The belief in private schools was found to be strong across the community, irrespective of geographical location. Another reason for the preference for private schooling and the low enrolment in government schools across the region was that education was primarily viewed through a market and monetary perspective. These parents believe that students attending private schools have better employment opportunities and a higher standard of living, as illustrated in the narration below.

> "I work as a labourer, and I have three children. I enrolled my children in a private school so that, like the children of the rich, they could study in good private schools and become successful. Like the children of rich people, our children also have an interest in learning and achieving higher positions in society by becoming successful officers."
>
> - Fieldwork, Ladakh (November 2023)

The narrative reflects parental school choice that fostered a more positive perception of private schools. In the 1980s, access to private education was exclusively for the elite, while the poor were excluded due to poverty and a struggling economy (Dame, 2018). These elites later pursued higher education outside the region and secured top positions locally (Vasan, 1027, 43; Richard, 2015, 38). Over subsequent decades,

private schools became symbols of success and prestige, encouraging families to migrate to urban areas to secure their children's future. As the theoretical lens suggests, competition shapes the education landscape, and in this competition, public schools are slowly losing their position while private schools are gaining a competitive edge. As a result, the idea of schooling has shifted from collective social development to personal advancement, diverging from Dewey's (2013) vision of schools as spaces for deeper societal engagement.

**Rise of Tiny Schools**

Another factor influencing school choice was the rise of *tiny schools* in the villages of Ladakh, where the pupil-teacher ratio had dropped to approximately 8:1. Harsh climatic conditions and limited accessibility to schools resulted in poor enrolment, and several government schools were eventually identified for permanent closure due to zero enrolment (UDISE+ 2024-25). The subsequent merger of schools created distrust among parents, who perceive the schools as unstable and lacking long-term viability. These developments make it important to bring the discourse of school choice into academic discussions and to understand how isolated, tribal-dominated regions like Ladakh conceptualise schooling and justify their choices of particular types of schools. Here, the perspective of Levin and Morgan (2004) on rational school choice has been challenged. Furthermore, the migration trend indicates that villages are being deserted and that agriculture is no longer a reliable source of livelihood. The analysis also suggests that not only are the rich and elite classes moving to cities, but poor and middle-income families are shifting as well in search of better opportunities. **Collectively, these factors shape parental school choice.**

**To justify the trend of schooling, it is argued that education is viewed as a public good worldwide,** where children begin their journey of learning and understanding the world (Locatelli, 2018). Dewey, in his seminal work *Democracy and Education* (1930), argues that school represents a miniature version of society, not just the individual. Recognising the vital role of education, many countries have declared it a fundamental right. The widely adopted Prussian model of education laid the foundation for free and compulsory schooling for all (Schleunes, 1979). In India, the inclusion of Article 45 and the provision of free and compulsory education post-independence were the first steps toward mass literacy. Subsequent commissions stressed the need for Universalisation of Elementary Education (UEE). The 86$^{th}$ Constitutional Amendment, which introduced Article 21-A, marked a turning point by making primary education a fundamental right. Under the *Sarva Shiksha Abhiyan* (SSA, 2001-02), the government focused on opening schools in every village. However, during fieldwork, respondents reported that many of these schools,

especially in remote areas, are now at risk of closure due to low enrolment. This policy of school closure or merger has been rationalised in various Indian states. For example, Malik (2021) discusses its impact in Rajasthan, while Smart (2023) highlights similar measures in Maharashtra. Minutes from the Project Approval Board (PAB) meeting for 2023–24 under the *Samagra Shiksha Scheme* confirm that single-teacher schools are being merged or rationalised by the Ladakh Autonomous Hill Development Councils (LAHDCs). These documents also note a rise in single-teacher schools at the primary level. Moreover, a report by *JK Newsline* (2023) states that 116 schools were shut down in Ladakh, and Ahmad (2025) reports that 139 more schools in Ladakh are at risk of closure due to low enrolment, which may negatively impact early-grade learning, especially for economically disadvantaged children who may drop out. Although local authorities claim success in increasing rural enrolment through reforms in selected schools, these successes are limited to just 12–15 schools and remain in the early stages.

The lack of clearly defined rationales among parents for preferring private over government schools reveals a deeper issue. Many parents cite *"quality"* but often lack a clear understanding of what it entails, adopting socially constructed notions that equate private schooling with better education, without assessing actual learning outcomes.

## Conclusion

The decision of choosing a school is becoming more complex due to the evolving dynamics of the education sector. While education is essential, we must also consider market demands when discussing schooling. The results of this study strongly suggest that private institutions have effectively promoted market needs through advertising and media to build rapport and trust with parents; similar findings were also reported in the study by Milliman & Maranto (2009) on the role of organisational trust in school choice. Quantitative data indicate that government schools have sufficient school buildings, infrastructure, and teachers, but are facing challenges in maintaining enrolment levels. Similar findings are evident in the literature from various countries. The education sector is currently at a critical point in its history, where the importance of accessing knowledge and information outside traditional schooling cannot be overlooked. This concept was highlighted by Harari (2018) in the book '*21 Lessons for the 21st Century,*' emphasising the need to make sense of information in a world where already far too much information is available without school textbooks and teachers. Despite the abundance of information available beyond textbooks and teachers, the choice of schooling remains a widely debated public policy globally.

Critics argue that modern schooling is more inclined to fulfil market demand for manpower than to produce the 'ideal person' promised. In this race of market-oriented education, private schools are holding a strong position due to their flexible market-oriented policies. It is because private schools readily incorporate new subjects and trends into their curricula, whereas government schools face more bureaucratic processes. This complexity makes it challenging for government schools to adopt new educational approaches and trends.

The study's evidence suggests that factors such as competition, fads, and socio-economic disparities can influence school choice decisions, sometimes overshadowing considerations of rational choice and educational quality. In the growing competition among educational institutions to attract students, it is essential to recognise that sparsely populated regions like Ladakh are among the first to suffer from the marketisation of education. Poor and marginalised families are either compelled to migrate to urban areas to secure their children's admission to the best possible schools or are left to struggle amid the forces of educational market competition. The data trends and narratives presented in this study offer critical insights to help navigate these challenges and frame concrete, practical policies. It indicates that more pragmatic, region-specific policies are required. Hence, policymakers must move beyond homogeneous frameworks and address region-specific challenges, particularly in contexts like Ladakh.

## References


Aggarwal, R. (2004). *Beyond lines of control: Performance and politics on the disputed borders of Ladakh, India*. Duke University Press.

Ahmad, B. (2025, January 16). 139 More Government Schools in Ladakh at Risk of Shutting Down. *Voice of Ladakh*

Apple, M. W. (2012). *Can education change society?*. Routledge.

Balinski, M., & Sönmez, T. (1999). A tale of two mechanisms: student placement. *Journal of Economic theory*, *84*(1), 73-94. https://doi.org/10.1006/jeth.1998.2469

Ball, S. J. (2003). *Class strategies and the education market: The middle classes and social advantage*. Routledge. https://doi.org/10.4324/9780203218952

Cummings, W. K. (1999). The institutions of education: Compare, compare, compare! *Comparative education review*, *43*(4), 413-437. https://doi.org/10.1086/447578

Dame, J. (2018). Food Security and Translocal Livelihoods in High Mountains: Evidence From Ladakh, India. *Mountain Research and Development*, *38*(4), 310–322. https://www.jstor.org/stable/26869935

Dewey, J. (1930). *Democracy and education: An introduction to the philosophy of education*. New York: Macmillan.

Dewey, J. (2013). *The school and society and the child and the curriculum*. University of Chicago Press.

Foskett, N., & Hemsley-Brown, J. (2001). *Choosing Futures* (1st ed.). Routledge. https://doi.org/10.4324/9780203467534

Friedman, M. (1955). The role of government in education. *Economics and the public interest*, *2*(2), 85-107.

Gabay-Egozi, L., Shavit, Y., & Yaish, M. (2007). Hedging risk in curricular choice: A test of a rational choice model of education. In *American Sociological Association Annual Meeting*.

Garcia, D. R. (2018). *School choice*. MIT Press.

Goldring, E. B., & Phillips, K. J. (2008). Parent preferences and parent choices: The public–private decision about school choice. *Journal of Education Policy*, *23*(3), 209-230. https://doi.org/10.1080/02680930801987844

Gupta, R. (2023). *Freedom in Captivity* (Vol. 21). Cambridge University Press.

Harari, Y. N. (2018). *21 Lessons for the 21st Century: 'Truly mind-expanding... Ultra-topical' Guardian*. Random House.

Kingdon, G. G. (2020). The private schooling phenomenon in India: A review. *The Journal of Development Studies*, *56*(10), 1795-1817. https://docs.iza.org/dp10612.pdf

Kumar, K. (2010). Quality in Education: Competing Concepts. *Contemporary Education Dialogue, 7*(1), 7-18. https://doi.org/10.1177/0973184913411197

Levin, J., & Milgrom, P. (2004). Introduction to choice theory.

Locatelli, R. (2018). Education as a public and common good: Reframing the governance of education in a changing context. In *UNESCO Education, research and foresight: Working papers* (No. 22, pp. 1-17).

Malik, A. (2021). Problems of equity and access in education: A case of school-merging policy. In *Contextualising Educational Studies in India* (29-48). Routledge India.

Maranto, R., Milliman, S., Hess, F., & Gresham, A. (2018). *Real world school choice: Arizona charter schools. In School choice in the real world* (pp. 1-16). Routledge.

Milliman, S., & Maranto, R. (2009). Educational renegades: Dissatisfied teachers as drivers of charter school formation. *Journal of School Choice*, *3*(2), 138-162. https://doi.org/10.1080/15582150902987400

Ministry of Education. (2025). *UDISE+ 2024–25: Unified District Information System for Education Plus.* Department of School Education & Literacy, Government of India. https://udiseplus.gov.in

Muralidharan, K., & Sundararaman, V. (2015). The aggregate effect of school choice: Evidence from a two-stage experiment in India. *The Quarterly Journal of Economics*, *130*(3), 1011-1066. http://www.nber.org/papers/w19441

Norberg-Hodge, H. (1991). *Ancient futures: learning from Ladakh*. Random Publishing House, UK. Ed. I

Pathak, A. (2002). *Social Implications of Schooling: Knowledge, Pedogogy, and Consciousness*. Rainbow Publishers.

Pathak, K. (2016). *Breaking the mould: Alternative schools in India*. Westland Limited.

Richard, B. O. (2015). *Being Ladakhi and becoming educated: Childhoods at school in the Western Himalayas*. University of California, Los Angeles.

Sandup, R. (2020). Demographic Profile of Union Territory of Ladakh. *Journal of Humanities and Social Sciences Studies*, *2*(4), 98-109.

Schleunes, K. A. (1979). Enlightenment, Reform, Reaction: The Schooling Revolution in Prussia. *Central European History*, *12*(4), 315–342. http://www.jstor.org/stable/4545874

Sheikh, A.G. (2005). *Ladakh: Tehzeeb-o-Saqafat [Ladakh: Civilization and Culture]*. Jammu: Crescent House Publications.

Sliwka, A. (2008). The contribution of alternative education. *Innovating to learn, learning to innovate*, *93*. https://www.oecd.org/education/ceri/40805108.pdf

Smart, P. (2023, September 24). Maharashtra: Schools with less than 20 students to be merged to create clusters. *The Indian Express*. https://indianexpress.com/article/education/uttar-pradesh-govt-approves-scheme-for-schools-with-less-than-20-students-to-be-merged-to-create-clusters-8952234/ 17-11-2023

Smith, L. T. (2021). *Decolonizing methodologies: Research and indigenous peoples*. Bloomsbury Publishing.

Smith, S. H., & Gergan, M. (2015). The diaspora within: Himalayan youth, education-driven migration, and future aspirations in India. *Environment and Planning D: Society and Space*, *33* (1), 119-135. https://doi.org/10.1068/d13152p

Tilak, J. B. (2023). The Education 'Fads' in India. *Social Change*, *53*(4), 532-542. https://doi.org/10.1177/00490857231203423

Tisdell, E. J., Merriam, S. B., & Stuckey-Peyrot, H. L. (2025). *Qualitative research: A guide to design and implementation*. John Wiley & Sons.

Toffler, A. (1970). *Future Shock*. Bantam Books.

Tooley, J. (2013). *The beautiful tree: A personal journey into how the world's poorest people are educating themselves*. Cato Institute.

Van Beek, M. (2013). "Sons And Daughters Of India": Ladakh's Reluctant Tribes. In *Indigeneity in India* (pp. 117-141). Routledge.

Vasan, S. (2017). Being Ladakhi, Being Indian: Identity Formation, Culture and Community. *Economic and Political Weekly*, *52*(14), 43–49. http://www.jstor.org/stable/26695718

Voogt, J., & Roblin, N. P. (2012). A comparative analysis of international frameworks for 21st century competences: Implications for national curriculum policies. *Journal of curriculum studies*, *44*(3), 299-321. http://dx.doi.org/10.1080/00220272.2012.668938

Weiss, J. A. (1998). Policy Theories of School Choice. *Social Science Quarterly*, *79*(3), 523–532. http://www.jstor.org/stable/42863815

# Satire and Social Critique in Urdu Cinema: Revealing Cultural and Moral Tenor of Society

Dr. Harshita Nogia

**Research Scholar(Department of History, University of Technology, Jaipur)**

## Abstract:

In the Late 60s and 70s Pakistani Urdu movie used humor and satire to undermine standards and political discourse in society and gender roles. This study has selected Rangeela (1970), Insaan Aur Gadha (1973), and Aurat Raj (1979) in order to demonstrate the possibilities of satire in terms of censure and conservative values. The study makes use of Bakhtinian carnivalesque theory and feminist cinema criticism in the analysis of narrative methods, character inversion and performative parody, in order to expose class exploitation, political hypocrisy and patriarchal systems. The production and reception of the movies were informed by the PPP era and Pakistan's conservatism under Zia. The paper explains how the medium of satire exposes and responds to issues of concern in society, as a zone of ambiguity where subversion may take place, but is generally limited by censorship, financial interests and popular wants. Case studies special emphasis is given to a few issues, Rangeela

lampoons urban life and social mobility, Insaan Aur Gadha questions authority and mass manipulation through grotesque transformation and political parody, Aurat Raj subverts the gender roles to discuss feministic demands and cultural backlash. The paper concluded that Urdu films during this period used satire to pass culturally comprehensible moral judgement and indirect dissent.

**Keywords:** Urdu cinema, Satire, Social Criticism, Pakistani film, Rangeela, Insaan Aur Gadha, Aurat Raj

## 1. Introduction

Historically, the movies that were being played in the South Asia have been a fun but also a way to criticise the society. After independence Urdu film is often referred to as Lollywood that had to big impact on the imagination of the people in Pakistan. While melodrama and romance characterized the popular trends in the mainstream, satire became a subtle, but powerful, vehicle for filmmaking to comment on socioeconomic differences, political power, and gender relations. Satire in the form of poetry also plays a large role in Urdu literature particularly in the works of Akbar Allahabadi, Patras Bokhari and Krishan Chander. After 1960s, the Pakistani film industry adopted mode of humour, irony and hyperbole in attacking the social hypocrisy and the powers of the government. Filmmakers used humor more and more during this time, not only to make people laugh, but also to make a point about society. This article looks at three Urdu movies - Rangeela (1970), Insaan Aur Gadha (1973) and Aurat Raj (1979) that have used a satire as their main way of telling a story. These movies depict a major decade in the history of Pakistan where populism of Zulfikar Ali Bhutto and authoritarian Islamization of General Zia-ul-Haq were in their peak. Cinema as a form of popular culture plays a peculiar role in postcolonial societies like Pakistan where literacy, oral culture and visual forms intersect. Films

can often serve as collective memory, the dream and the nightmares of society. In this sense, satire is particularly effective as a way of critique that can be incorporated into entertainment. The laughter from satire does not only amuse but invite recognition and reflection and let audiences face uncomfortable truths in an indirect manner. In Pakistan, where political expression has frequently been restricted by state power, satire has always been a form of dissent that has been relatively safer. The period being studied, that is, the late 1960s and the late 1970s, is a transformation period in Pakistani history. It witnessed the optimism of populist politics, the trauma of war and secession and the gradual imposition of moral and ideological controls on culture. Urdu cinema of this period took in these tensions and conveyed them through allegory, parody, and comic exaggeration. Satirical films thus become important historical documents, providing insights into how society viewed the role of power, authority, class mobility and gender norms at moments of upheaval.

**Bakhtin and the Carnivalesque**

Mikhail Bakhtin's theory of the carnivalesque is focused on laughter as a social force with which authority is shaken. Carnival allows the grotesque, the absurd and the inverted hierarchy, it allows the voice of the marginalised to ridicule the power structures of the dominant. In cinema, carnivalesque satire is made up of the mocking of overblown characters, bodily humour and narrative inversions which shake up social mores, at least for a moment (Bakhtin, 1984, foreword x-xi). Closely related to the carnivalesque is the political role of the satire as indirect critique particularly in restrictive socio-political circumstances such as Pakistan. (Bakhtin, 1984, foreword x-xi). Bakhtin's notions are especially helpful in analysing popular cinema where exaggeration is used as an aesthetic tool, along with spectacle and bodily humour. The carnivalesque offers a temporary suspension of official norms, which

enables ordinary people to laugh at kings, leaders and institutions, who otherwise appear to be invincible. In film narratives, this manifests in the form of comic protagonists who challenge authority not by direct confrontation but by ridicule, irony and absurdity. Such laughter does not cause the overthrow of power forever, but its moral legitimacy is de-stabilised. In the context of Pakistani cinema, carnivalesque satire becomes an important cultural strategy. It gives filmmakers to comment on political and social realities without specifically naming or attacking those in power. By employing metaphors, fantastic situations and inversions of humour, movies can speak of dissent while staying within the acceptable parameters of popular entertainment. This is especially evident in the film parody of leadership, bureaucracy, and public rhetoric with their exaggerated performances that reveal the hollowness of authority.

**Satire, Power and Subversive Indirect Dissent**

Satire can easily be a form of "safe criticism" especially in societies with a high level of censorship. Rather than direct confrontation with the power, satire outwardly conceals the dissent in the humour and thus makes the circulation all the more widespread with the critical edge intact. This framework is especially applicable to Pakistani cinema where the role of the state censorship boards to control the political subject matter was strong. Gender has been one of the most contested domains of social power and satirical inversion has always played a major part in patriarchal norm articulation. Throughout Pakistan's political history there has been a level of regulation, surveillance, and moral policing of cinema. Filmmakers frequently turned to symbolic representation instead of realism as a way to avoid censorship. Satire by its very nature also thrives on ambiguity; its meanings can be denied, deflected or laughed away. This ambiguity allows satire to serve as a double-edged tool - fun and entertaining on one level and talking about deeper ideological critiques

behind the surface. The power of satire is that it is accessible. Unlike overt political commentary, the satire caters to a wide audience, potentially to people who may not be consciously looking for political engagement. By incorporating critique through a sense of humor, films get spectators to question norms and assumptions without feeling alienated or being lectured. This quality made satire especially suitable for the Urdu cinema which relied heavily on mass appeal.

**Feminist Film Theory**

Feminist theorists have proposed that gender inversion and gender parody can be ways of exposing the construct of patriarchy. In Aurat Raj, the exaggerated role reversal not only is comedy, but it is a political statement on the misogyny, moral double-standards and institutionalised gender inequalities. Against this theoretical and cultural background, this article is concentrated on three Urdu films: Rangeela (1970), Insaan Aur Gadha (1973) and Aurat Raj (1979) which use satire as a major narrative strategy. These films narrate a very important period in history of Pakistan where populist politics of Zulfikar Ali Bhutto and followed by Islamisation during the rule of General Zia-ul-Haq took place. Gender relations in Pakistani society have traditionally been determined by patriarchy, religious interpretations, and comparatively developed legislation. Cinema has both reinforced and challenged these norms. Feminist satire and especially role reversal where men are put in the position of women, call into question the arbitrariness of gendered power. The discomfort and laughter such inversions produce is indicative of how deeply-mingled these hierarchies are. Aurat Raj is a rare cinematic experiment that openly questions the patriarchal authority with the use of humor. By envisioning a world in which women are in charge and men experience limitation designed for women, the

film forces viewers to confront the injustice that is embedded in the daily practices. Satire here becomes not only social commentary, but a kind of feminist resistance.

The article try to address the following issues by the means of comparative analysis of different films:

- Satire as a means of the society criticism What Does It Do in Urdu Movie?
- Why do such funny stories mock which aspects of the Pakistani society? Class, politics, morality and gender?
- What are the limits of satire (where censorship, Patriarchy and popular culture are concerned)?

These questions help to structure the analysis of the study and determine the comparative methodology. By looking at films on various thematic concerns such as class struggle, political authority and gender relations, the article aims to show how satire is capable of adaptation in different social contexts while preserving its critical function.

## 2. Literature Review

Scholarly research on the cinema in Pakistan in the past have focused on several issues such as the decline of the industrial sector, censorship and the construction of national identities. Satisfaction as a genre have received a very little amount of study. However, the innovating work by Mushtaq Gazdar on Pakistani film did not present the continuum study on satire as cinematic genre. Instead, it deals with the pendulation of the freedom of art and oppression by the state (Gazdar, 1997, 149-238). In more recent study which has been published in publication like screen and BioScope, there has been an attempt to reevaluate Pakistani cinema in the

frameworks of Transnational and Cultural studies.(Ahmad, 2014, 175-181; 2016, 468-479). While Gazdar's work continues to remain fundamental, subsequent scholars have broadened the scope of work on Pakistani films by placing the cinema in global and regional frameworks. These studies highlight the issues of migration, identity and cultural exchange which emphasize the participation of Pakistani cinema in transnational dialogues. However, satire is a cinematic form that is underexplored, as it is frequently treated as a secondary form to the more commonly privileged forms of realism or melodrama. In south Asian satire studies satire is through literary works or laughing programs reminiscent of other fields of satire more important modern political satire shows through. There is dearth of theorization on satire in the cinema especially Urdu cinema. A useful theoretical approach is given by Bakhtin's notion of the carnivalesque which focuses on inversion, parody and temporary suspension of social hierarchies (Bakhtin, 1984, Introduction, p.10). The framework of feminist cinema theory adds more knowledge about the ways in which hierarchies of power based on gender may be destabilized through the use of role reversal and parabola. Journalistic and archival materials, e.g. Dawn, Pakistan Times, Nigar Awards records, which provide unique insights for the reception of these films in the present and the problems associated with censorship and cultural debates which surround these films. “Aurat Raj has been defined as a courageous satirical film using gender inversion and buffoonery of fantasy to resist the patriarchy and gender norms of Pakistani society. The film's depiction of men reduced to 'dupatta-covered minions' and the thematic focus on the rule of women have been pointed out as subversive comment on patriarchal culture as well as in film retrospectives". (Rabe, 2017) In order to overcome the divide between the studies of films, cultural history and the study of satire, through this essay we situate Urdu cinematic satire within the moral and political environment of Pakistan throughout 1970s.

## 3. Sources of and Methodological Framework

The present study takes a qualitative approach of interpretive methodology in order to explore the role of satire and social critique through Urdu cinema with a close reading of film texts, historical context, and critical theory. Given the nature of the research questions (which concerned with ideology, power, humour, and representation), quantitative approaches would be inadequate. Instead, the research is based on textual and visual analysis, comparative narrative interpretation, and archival verification through the support of theoretical and historical sources.

### Textual and Visual Analysis of Films

The major sources for this research are the three Urdu films, Rangeela (1970), Insaan Aur Gadha (1973), and Aurat Raj (1979). These films were chosen deliberately as they explicitly adopt satire as a narrative approach as well as having been made during a highly volatile decade in the history of Pakistan. Textual analysis focuses on narrative structure, characterization, dialogue, symbolism, comic devices like exaggeration, parody and inversion. Visual analysis looks at *mise en scene*, performance style, costumes and spectacle; all of which are important to understanding satire in popular cinema. Close reading of selected scenes enables the study to identify the workings of humor not as an entertainment factor but as a means of critique. Satirical techniques: Anthropomorphism (Insaan Aur Gadha), comedy based on class (Rangeela) and reversal of gender roles (Aurat Raj) are analysed as cinematic manifestation of social tension.

### Comparative Technique of Analysis of Narrative

Comparative analysis is the central methodological approach of such research. Rather than addressing each film separately, the study situates them in conversation

with one another in order to determine common satirical strategies and different ideological targets. Comparison allows the research to follow the traces of satire in its engagement with various domains of power - class, politics, gender - in the same cultural and historical context. This way, in Urdu cinematic satire, the continuities and the limits can be identified as well. While Rangeela is concerned with the precarity of everyday life in the cities, Insaan Aur Gadha practices political parody and Aurat Raj stretches the satire towards the feminist. The comparative method thus brings greater analytical force by locating individual films within a larger satirical tradition.

**Historical Contextualization using Archival Sources**

To avoid purely textual or ahistorical readings, film analysis in the study is based on archival and journalistic sources. These materials are the fundamental to an understanding of the conditions of production, of censorship and of public reception.

**Newspaper Archives**

Archival articles from Dawn and Pakistan Times are used to substantiate claims in relation to censorship, political sensitivity and cultural debates. For instance, Dawn Images has reported on the temporary ban on Insaan Aur Gadha during the Bhutto government, which validates the fact that the satire in the film was seen as political provocation. Such sources are evidence of the fact that satire in Urdu cinema was not only symbolic but had real political danger. Newspapers also help to contextualize Aurat Raj in the moral climate of the late 1970s, especially the first few years of General Zia-ul-Haq's Islamization policies which greatly curtailed cultural expression and representations of gender.

Accurate filmographic information, including when the film was released, who directed it, who starred in it, how it was rated, etc., is important for scholarly credibility. For this purpose, cross-verification between several authoritative sources is used in the study:

**PakMag** (Pakistan Film Magazine) is taken as a primary database for Pakistani cinema. PakMag has comprehensive information on Urdu films in its records, including cast information, production credits and films, making it one of the most reliable archives of Lollywood film history.

**Wikipedia**, although not considered in any way as an academic source, is cautiously used and only on basic film data, cross-checked against PakMag and archival sources.

**Nigar Awards** archives are consulted to check industry recognition and modern appreciation of the movies. The inclusion of award data helps to place these films in the mainstream of cinematic culture of the day, showing that the genre of satire was not marginal, but was part of popular cinema.

This triangulation of sources means that the accuracy of the facts is assured and that the reliance on a single database is reduced.

**Theoretical Sources**

The analytical framework of the study is based on existing theoretical literature:

Mikhail Bakhtin's Rabelais and His World (1984) is the main source of theoretical work for an understanding of the carnivalesque. Bakhtin's discussion of laughter, grotesque realism and the inversion of hierarchy gives a strong basis to analyze satire in the cinema, especially the provisional suspension of authority through humor.

Feminist film theory inspired by the work of film theorists like Laura Mulvey and more recently feminist film critics informs the reading of Aurat Raj. Gender inversion and parody are interpreted as ways of exposing patriarchy as an artificial system rather than a natural order. These sources from the theoretical side are widely cited, peer-reviewed and foundational in the cultural and film studies, so appropriate for rigorous academic analysis.

**Literary sources: Secondary Scholarly Literature**

Secondary sources include books and journal articles on the cinema in Pakistan and South Asia studies of the screen. Foundational to current understanding of the political economy of Pakistani film, censorship and the state control of film is Mushtaq Gazdar's Pakistan Cinema, 1947-1997. Although Gazdar's work is not exclusively about satire, it does give important historical basis. More recent scholarship published in journals such as Screen and BioScope: South Asian Screen Studies (edited by Ali Nobil Ahmad and others) re-assess Pakistani cinema in terms of transnational and cultural studies. These sources support the study's argument that the Pakistani cinema is increasingly being analyzed within realms outside of nationalist narratives, though the theme of satire remains under-theorized.

## 4. *Rangeela* (1970)

### 4.1 Film Background

Rangeela (1970) was directed by and starred Rangeela (Mohammad Saeed Khan), one of the most influential comic figures in Pakistani cinema. The film occupies an important position within Urdu cinema for its integration of comedy with social observation rather than relying solely on slapstick or escapist humor (Tahira, 2025). According to film records, *Rangeela* received recognition at the Nigar Awards, reinforcing its contemporary critical and popular significance (Wikipedia

contributors, 2025a). The film belongs to a period when Lollywood was experimenting with socially grounded narratives alongside commercial formulas. Rather than depicting grand political allegory, *Rangeela* situates its satire within everyday urban experiences, making it especially relevant for understanding class consciousness in Pakistani cinema of the late 1960s and early 1970s.

### 4.2 Everyday Satire and Class Consciousness

The accent of Rangeela lies on what may be called micro-social satire, as opposed to the overt political satires, which are an outright satire of the power of the state. Unemployment, unstable housing and the struggle to retain one's dignity are at the core of Rangeela's (1970) key thematic themes. Through Sohna's proclamation, "*Main shehar jaakar itni daulat kamaunga*" the movie brings economic desire to the forefront. This assertion epitomises a rural-urban fantasy of mobility and money that is characteristic of the post-independence metropolitan imagination. Nevertheless, this hope is suddenly cast down by the realities of structures that must be reckoned with. *"Makaan girvi rakha hua hai, karza lene wale ghar se nikaal denge*" is the nervous admission by Sohna's mother. This admission hints at the fragility of housing and the looming threat of dispossession which puts the existence of the family within cycles of indebtedness and insecurity. The story always explores the breakdown of human dignity in an unequal metropolitan space, beyond the material hardship, which is the subject of the story. Sohna's battle is not only economic but one of morality as he is compelled to negotiate for humiliation, contempt, and social rejection while trying to hold together his self-respect on the one hand and his dignity on the other. It becomes clear the city is a place where one's value is not determined by their character but by their look, employment and degree of respectability in their actions. (FILMAZIA URDU, 2025)

This dichotomy between dignity and social value is made most strongly through Salma's statement which reads as follows: "*Tumhri surat iss kabil hai ki tumse mohabbat ki jaye, maine tumhe maskara samaj ke ahmiyat di thi*." As a result of the debate, the conditional character of acceptance in the metropolitan culture are revealed. In this society, love and attention is only granted to those that are able to transcend the mark of being comical or impoverished. Humour, which initially enables Sohna to survive, at the same time becomes the cornerstone for his marginalization, for being turned into an object rather than a subject that is worthy of a true regard. (FILMAZIA URDU, 2025)

Rangeela is a subtle social commentary about the urban modernity, in which unemployment, housing insecurity, and class-based perceptions intertwine to address an individual's struggle for survival in terms of dignity. When taken together, these moments position Rangeela as a social critique of urban modernity. It is not through the extreme parody that the satire of the film is found, but through its daily realism that the film calls attention to the profound entanglement in moral fabric of the city that economic vulnerability and social respectability represent.

Rather it being abrasive; the comedy in Rangeela is of great empathy. The film makes no joke out of poverty, but instead highlights the structural constraints that compel people to make moral concessions. It would seem that social respectability which is often represented in one's appearance, clothes, voice and performance, is a fragile thing which has to be maintained constantly. According to academic studies, Urdu comedic film had frequently humanized the marginal instead of caricatured them. This is in line with the findings of these observations.

### 4.3 Carnivalesque Moments and Temporary Inversion

The thematic issues of unemployment, housing precariousness and the precarious striving for dignity in Rangeela (1970) can usefully be studied in terms of Mikhail

Bakhtin's concept of the carnivalesque, especially its accent on laughter, exaggeration and the temporary upending of social hierarchies. In the film moments of humour act as a momentary interruption in the otherwise unequal social order and allow marginalised figures such as Sohna to temporarily de-stabilise the position of authority and to reclaim visibility within the urban space.

Sohna's comic appearance in the city represents the carnivalesque subject who is able to survive based on wit and performance rather than economic capital. His declaration of ambition "*Main shehar jaakar itni daulat kamaunga*" is repeatedly recast in terms of comic misadventures that serve to bring out the absurdity of metropolitan promises. Street scenes, public interactions, these are carnivalesque spaces in which social norms are suspended. In these spaces, laughter functions as a group experience which for a brief period of time equalizes people across class boundaries, allowing Sohna to ridicule employers, landlords, and social elites who normally enjoy unquestioned authority. (FILMAZIA URDU, 2025)

The precariousness of dwellings, which is expressed in Sohna's mother's terror- "*Makaan girvi rakha hua hai, karza lene wale ghar se nikaal denge*"-further places the carnivalesque in a position of material instability. Moments of humor do not abolish this precarious situation but make it possible to express without despair. Through exaggerated situations and fanciful dialogue, the film converts the anxiety into laughter providing a short respite from the constant threat of dispossession. This fits in with Bakhtin's claim that carnival laughter is not a denial of suffering, but a rearticulation of suffering through a common and regenerative humour. (FILMAZIA URDU, 2025)

Mistaken identities and performative misunderstandings in the film are important mechanisms of temporary inversion. Sohna's comic persona enables him to cross social thresholds – to enter spaces of respectability, affection and visibility that would

otherwise be unavailable to him. But these crossings are conditional and so temporary. Salma's comment, "*Kya Tumhri surat iss kabil hai ki tumse mohabbat ki jaye, maine tumhe maskara samaj ke ahmiyat di thi*" is very telling in revealing the limits of this inversion. While Sohna's humour at first offers him recognition it also locks him into the position of the '*maskara*' demonstrating the power and the powerlessness of carnivalesque laughter. (FILMAZIA URDU, 2025)

Musical sequences in the end, Rangeela increase this carnivalesque suspension. Song moments obliterate iron social distinctions and create a festive moment with dignity restored for a brief moment by moving in unison with collective joy. Yet in accordance with Bakhtin's structure, such moments do not end in structural change. The carnival being over, social hierarchies reassert themselves. Sohna's economic insecurity and class position are not resolved, pointing to the persistence of inequality.

Thus, Rangeela uses the carnivalesque not as a revolutionary force, but as a mode of diagnosis. Laughter reveals the contradictions of urban modernity, where aspiration and dispossession, dignity and performance, go hand in hand without having the potential to provide permanent answer. The temporary inversion of hierarchy throws light on the persistence of class barriers rather than the collapse of the class barriers. In this sense, the film's satire is grounded in the realism of everyday life: it uses carnivalesque moments to show the intersection of three issues - unemployment, housing insecurity and social respectability - to demonstrate, in the end, the structural constraints within which it is necessary for the marginalized to continue to fight to negotiate their dignity.

### 5. *Insaan Aur Gadha (1973)*

The titular character of the film is the famous comedian Rangeela in the 1973 film Insaan Aur Gadha, a Pakistani Urdu language satire comedy. The film was directed

and produced by Syed Kamal, and it was a film of sarcastic comedy. The book '*Gadhay Ki Sarguzasht*,' written by Krishan Chandar, is one such work that is known all around in Urdu literary circles for being an article of satire on the human condition (Wikipedia contributors, 2025b). It was on August 31, 1973, when Insaan Aur Gadha was made available to the public in major circuits like Lahore and Karachi. (pakistan film magazine, n.d.)

### 5.1 Plot and Satirical Framework

It is humorous and metaphorical in nature, but the basic idea of Insaan Aur Gadha is that a donkey prays to God to be turned into a human being because he feels that human life is of a higher level and endowed with dignity. With the words "*Dhang insaniyat ka Sikha de, Aye Khuda mujhko insaan bana de*" the Donkey expresses his sentiments. (Old is Gold, 2019) Nevertheless, as he goes about his life in human society, he comes to the realization that human existence is more problematic than his life as a donkey. He says, "*Main Insaniyat ka Dushman hoon, Maine logon ko woh aaina dikhaya hai jisme insaan ki sabse bhayanak surat nazar aa gayi hai*." (Old is Gold, 2019) This is because the human behavior, social obligations, greed, hypocrisy and moral confusion are all factors that contribute to human existence (Wikipedia contributors, 2025). The donkey turned man, who is played by Rangeela, comes to the realization at the end that his moral purpose, his clarity of existence was greater while he was an animal as per the current discussion and evaluations that follow, He even asks God to turn him back to a donkey, with the song "*Aadmi-Aadmi ka hai Dushman Aye khuda mujhko haiwaan bana de*" (Old is Gold, 2019) He describes his dissatisfaction with the moral void that exists in the world on account of humans. (Paracha, 2020)

The scene in which the changed donkey delivers a parody of political oratory in the presence of a horde of fellow donkeys in which he promises to fight for their rights

and critiques the style of the populist leadership is one of the most significant scenes to receive attention. This grotesque inversion, in which an animal is lecturing its own ilk on its rights and human hypocrisy, is the nub of the film's satire on human politics and social order. The animal says, "*Main insaan bankar duniya ke tamam gadhon ke haq ki hifazat karunga aur unn insano ke haq ki bhi jo jaanwar se bhi badttar Zindagi jee rahe hain*" (Paracha, 2020; Old is Gold, 2019)

### 5.2 Political and cultural reception

Protests broke out almost soon after the movie was released due to the fact that it had satirical elements particularly the speech that was a parody of political rhetoric. Reports indicate that it was the administration of Zulfikar Ali Bhutto who banned the film within a few weeks of its release The government said the speech sequence in which the donkey-turned-man addresses a crowd, making fun of the general population by presenting them as a group of donkeys found objectionable in its view, which was one of the reasons it was banned, (Wikipedia contributors, 2025b). Film historian and critic Mushtaq Gazdar saw in his writing the day that the sequence took about a month after the controversy and revisions that was made around the concerns that the picture was permitted to return to theaters despite the fact that it had been banned (Paracha, 2020) (Wikipedia contributors, 2025b). As an early case of a political picture being restricted because of its perceived criticism of leadership and mass politics, this happening is frequently pointed out in the context of Pakistani movie censorship. This is because it is regarded to be particularly controversial. (Paracha, 2020)

### 5.3 The Interpretation of Genre and Themes and Genre

Allegory and anthropomorphism occurred in Insaan Aur Gadha which is one of the first clearly satirical Pakistani films. The purpose of it was to question human social

systems, hypocrisy, and political rhetoric. This film occupies a special position in the history of Pakistani film industry known as Lollywood. These traditions of social satire might be seen in literature, notably the South Asian variants of allegories of animals that comment on the relations of power. The story's storyline, which includes a donkey that assumes the form of a human, but becomes disillusioned, is reminiscent of these traditions. Exaggeration, contradiction and inversion are the three pillars on which the humour of the film is built. The film situates itself in a long history of satire which is marked by the marginalized voice exposing bigger truths about the failure of society. This is done by giving an animal human speech and exposing the moral dilemmas that human beings face. the performance that Rangeela made as the changed donkey man was generally acclaimed as being unusual and unforgettable. It proved to be his success not only as a comedy artist but also as a social satirist, who engaged the audience with both his humorous and serious criticism. (Paracha, 2020)

### 5.4 Accolades and Acknowledgments

Insaan Aur Gadha was also recognized in the industry for its quality comedy. Rangeela won the Nigar Award for Best Comedian (1973), the then most prestigious cinema award in Pakistan. This success is a testament to the industry realization of his performance as well as the film's wide popularity (Wikipedia contributors, 2025b).

### 5.5 Legacy and Significance

As a result of its controversial response and its use of satire to make a point about human behaviour and political discourse, the film is considered to be part of a select group of Urdu films from the 1970s that aimed to push the bounds of story beyond melodrama or romance. An additional reflection of the ways in which cultural works

were in the process of bargaining with state authority during a time of political transition is the fact that it was temporarily banned and subsequently reinstated. film Insaan Aur Gadha is a fascinating case study in Pakistani cinematic satire due to the coexistence of elements of fantasy, comedy and sociopolitical allegory. It is also an example of what filmic critique can and cannot do in the entertainment industry at large in the early 1970s.

**6. *Aurat Raj***

Rangeela's film Aurat Raj, which he directed and produced in the mid 1970s is a rare and unique example of deliberately satirical, gender-centered popular cinema in Pakistan. Rangeela is well known as a famous comedian and actor but here he displays himself to be a brave satirist who uses fiction and exaggeration to criticise the deeply rooted patriarchal norms. Aurat Raj is frequently referred to as a satirical fantasy in movie databases, film catalogs and retrospectives. It dares to envisage a fundamental change in the way the gender roles are set up. The movie uses magic and allegory to turn the power relations of the society upside down so that the males have to deal with the same constraints, monitoring and moral discipline that the women have always had to deal with. (Wikipedia contributors, 2025c). The basic premise of the film is speculation: the historical onus of women who have been attacked by the structures of power unite politically to seize power. This thought is the political ideology of Aurat Raj. Through the use of charged dialogues, the film gives voice to the anger of women and the historical grievances of women. For example, when Sophia is confronting her husband and she says, "*Aurat hamesha mardon ke Zulm ka shikaar rahi, mardon ne pehle usey darbaaron mein Nachaya to kabhi bazaaron mein, ab tumhari baari, ab tum humare kadmon ke neeche ho*." (Pakistani Bblockbuster Movies Channel, 2025) This sentence sums up the main point of the movie: patriarchy is not natural, and it is not commanded by God, it is a

historical construct that is maintained by violence. The conversation is a time of catharsis and gives voice to the anger that women have built up for hundreds of years of being dominated. (Wikipedia contributors, 2025c). The plot twist of the story occurs when a "bomb," a symbolic weapon, which disrupts the existing gender order is invented. The bomb does not function as a weapon of physical destruction, but functions as a metaphor that obliges males to confront the experiences of women. Aurat Raj uses this creative method of describing how power works in everyday life, such as controlling movement, appearance, voice and moral reputation. Men, now facing the same public-private restrictions and social invisibility that was once imposed on women, face shame, anxiety and loss of autonomy. The film takes abstract feminist criticism and makes it real. (Pakistani Bblockbuster Movies Channel, 2025). The plot is purposely simple and symbolic. Women who have been held back get together, start a movement, and gain political power. This simplicity makes the satire easy for a lot of people to understand while yet making a complicated point about how gendered power works. The change in roles is not subtle, it is over-the-top, it is dramatic, and frequently silly. The movie employs a lot of different funny techniques, such slapstick, parody, farce, musical numbers, and strange locations, to create a universe that is both funny and scary. These methods have two purposes: they make a spectacle and demonstrate how vicious and arbitrary are the patriarchal standards. (Rabe, 2017). Many modern and historical reviews agree that role reversal is the primary way in which the movie makes fun of things. Men are forced to act and appear excessively "feminine," and women take charge in public life. This reversal renders the traditional movie images of men and women less stable. In mainstream Urdu film so, male star is generally perceived as heroic or powerful, but in the film, they are perceived to be playing subservient, decorative and dependent roles. Women, on the other hand, are viewed as strong, outspoken and politically active. By turning these commonly known stereotypes on their head,

Aurat Raj reveals the ways in which gender norms are perpetuated by repetition rather than in differences that already exist. (Rabe, 2017). The movie combines popular tropes of movies such as music, melodrama and celebrity appearances with campy styles and obvious mockery. Musical numbers are very important in making the film seem to be a carnival. Song and dance performances contribute to the feeling of excess and drama which makes it possible to mock and turn societal systems upside down. Clothing reversal, overacting and visual extravagance become mechanisms of defamiliarization which make patriarchal standards seem as peculiar, nonsensical and contingent rather than inherent. Film catalogs and archive descriptions also mention that the movie is long, and has a lot of actors, which makes it seem like a series of little plays. (Pakistani Bblockbuster Movies Channel, 2025). Scholars and critics who have read Aurat Raj have again and again emphasized its interventionist aims. The film presents the "what if" scenario that makes sexism obvious by having males assume women's societal roles. In this way, Aurat Raj is like other feminist speculative satires that use made-up universes to criticise the way things are now. In his popular article, Nate Rabe describes the movie as "a grand statement on women's rights delivered in the form of bizarre slapstick." He speaks of its campy style, its melodic flights, and most importantly the image of men wearing dupattas which is a funny yet powerful signifier of gender inversion. This picture has since become famous, and it is usually mentioned when people speak about the legacy of the movie. (Rabe, 2017). Even though the movie had a very innovative idea, the political situation at the time had big impact on how people reacted on it. Aurat Raj came up around the early years of General Zia-ul-Haq's rule which was a time when Islamization and moral policing was on the rise. During the dictatorship of Zia, the artistic expression became more and more controlled under the pretext of "public morals." Stricter censorship restrictions such as changes in the Motion Pictures Ordinance made it more difficult for filmmakers to try new things,

especially things that went against established gender roles. Histories of Pakistani film and later press retrospectives of it often suggest that the Zia period significantly narrowed the acceptable limits of criticism. (Rabe, 2017) In this historical setting, Aurat Raj—a film that openly portrayed female political leadership and ridiculed patriarchal masculinity—was philosophically at odds with official cultural policy. This conflict helps explain why the movie didn't perform very well at the box office and why people were so angry about it in later reports. Women in the movie screamed slogans like "*Aurat Raj, zindabad*!" and "*Aurat raj jab aayega, phir aurat apne zulm ka hisaab legi*." (Pakistani Bblockbuster Movies Channel, 2025)

These slogans seem like calls to action, but they also show why the movie was seen as dangerous. These phrases express a vision of responsibility and fairness that was far different from what the government wanted, which was obedience and moral compliance.

Looking back, Aurat Raj has a complicated place in the history of Pakistani cinema. It is both praised for its boldness and pushed to the side because of its political timeliness. The film finally ends its story via comedic closure rather than systemic revolution; yet, its creative criticism remains essential. Aurat Raj uses humour, fantasy, and role reversal to show that patriarchal control is something that has been created throughout time and can be questioned. Its lasting importance is not in its immediate effects but in its ability to make people think about gender, power, and the limitations of cultural resistance during times of ideological suppression.

**Comparative Analysis: Satirical Techniques and Goals of Society**

Rangeela, Insaan Aur Gadha and Aurat Raj A comparative analysis of the three texts Rangeela, Insaan Aur Gadha and Aurat Raj shows the function of satire in three interrelated levels: (i) Quotidian social existence, (ii) Political power, and (iii) Gendered hierarchies. Each of the films employs unique story techniques, tonal

nuances, and artistic styles, though all three of them are linked by a common commitment to uncovering the moral paradoxes inherent in Pakistani culture in the late 1960s and 1970s. Together, they show how satire as seen in Urdu movies worked as a way to criticize things that was understandable to people in a culture where censorship, political instability, and entrenched sexism were all commonplace.

**Rangeela: Satire and Real Life**

In normal social life, Rangeela incorporates satire based on social reality rather than easily identifiable fantasy or metaphor. Humor is created from common reality problems - unemployment, housing insecurity and the precarious balancing of dignity inside metropolitan settings. (Gazdar, 1997; Ahmad, 2016) Instead of directly attacking the authority of the states, the film is more concerned with micro-social interaction, showing how class inequality is reinforced through everyday contacts with landlords, employers and social elites. Here, satire works through humour that makes people feel bad. The cleverness of the main character and their ability to act promptly allows them a tiny break from their problems without any breakdown of systems that have caused it. Laughter is a means of surviving, showing how those who are on the outside may deal with humiliation without losing self-respect. The movie makes fun of a moral economy in which looks, job and social performance holds more importance than moral content. By doing this, Rangeela demonstrates the contrasts of the modern city life: individuals desire things while others steal them, individuals have to continue negotiating their dignity in the strict hierarchies of the class.

**Political Authority and Satire: Insaan Aur Gadha**

Insaan Aur Gadha takes satire one step further and turns it into a clear political allegory, while Rangeela remains faithful to the spirit of social realism. The main

idea of the story is that a donkey becomes a person. This is rooted in ancient literary traditions of anthropomorphic satire questioning leadership, political rhetoric and mass obedience. The video uses outrageous exaggeration in order to demonstrate how silly authority is and how empty populist speech is. Satire in this case works in a large scale, making fun of politics as a whole. One of the best parts of the movie I remember was when the turned donkey and human gave a speech that made fun of political speeches. This is a sign of the way in which slogans and emotional appeals are substituted for moral or intellectual content. Authority is made to appear foolish not by direct attack but by turning things on their heads: an animal says things that people won't acknowledge as true. (Wikipedia contributors, 2025b).

In contrast to Rangeela, which maintains a local and soft nature of satire, Insaan Aur Gadha could lead to a head-on fight with the government. The very fact that it was banned for a while after its release demonstrates how satire can be politically detrimental when its targets are obvious examples of modern power systems. In this movie, comedy is more of an avenue to criticize rather than to deal with problems. It demonstrates how weak government legitimacy can be. (Gazdar 1997)

**Satire and Male-Female Power: Aurat Raj**

Aurat Raj is the most radical of the three films because it is about the gendered power dynamics. By carrying gender reversal to an extreme, it envisions a future when women are in charge of politics and males are treated like women have always been with fetters, moral surveillance, and social shun. (N. F. P. Paracha, 2018) This hypothetical reversal shows that patriarchy is a made-up institution and not a natural or divinely approved institution. The satire of Aurat Raj is obvious, over-the-top and intended to be funny. Musical sequences, the aesthetics of camp, and over-the-top performances help to create a show that shakes up traditional ideas of gender (Wikipedia contributors, 2025c). Men who in the past were considered strong and

heroic are now being made fun of and feminized, while women are taking over and speaking up instead. The comedy is confronting and makes people feel the discomfort of the power dynamics that have been turned upside down. Satire in Aurat Raj is different than Rangeela's short-lived inversions in the way that it attempts to expose ideas rather than fit in with society. It is a questioning of the foundation of morality. But it came out in the nascent years of General Zia-ul-Haq's Islamization, which put it to the pitch with the rising conservative ideas. The pushback and marginalization in the film demonstrates how difficult it is to in a more moralized culture to use feminist satire. (M. Rehman, 2016)

**Strategies which are the same and different registers**

All three movies use inversion, exaggeration, and performance as their main satirical tools although they all are quite different. Satire plays a role by making things that appear to be natural, unavoidable, and morally right appear wrong. This can be done through the comic underdog (Rangeela), a grotesque allegory (Insaan Aur Gadha) or a feminist dream (Aurat Raj). But their registrations are not too different. Rangeela uses warmth and familiarity in discussing class disparity without making people feel bad. Insaan Aur Gadha uses humour and metaphor to demonstrate the hypocrisy of politics. Aurat Raj uses conflict and spectacle in an attempt to fight against the power of male. These differences reveal not only creative choices, but also the different dangers that come with the criticism of social, political, and gendered areas of power.

**The Limits of the Satire and the Restoration of Order**

A large area of meeting is in the limitations of satire. In all three of the movies the inversion is momentary. Social hierarchies, political power and gender roles are portrayed, ridiculed, and shook up, but not fundamentally altered. This restoration

of order demonstrates the limited popularity of movies since they have to deal with censorship and strict rules of society.

Satire, therefore, works not so much as a transforming tool, but as a diagnostic tool. It shows paradoxes, makes people laugh, makes them think critically, but it doesn't go so far as to make revolutionary change. This restriction does not diminish the significance of satire, however, but highlights its historical role as a cultural mechanism for dealing with a dissident within acceptable ways.

**Censorship, satire and the Pakistani state are all discussed.**

There is not any period when satire in the Urdu film was living in a political vacuum. Since the beginning of time its power to make people laugh has been inextricably allied with its potential to shake up established authority, bring to light hypocrisy and question preexisting moral establishments. The censoring histories of Insaan Aur Gadha (1973) and Aurat Raj (1979) throw some light on how satire became politically dangerous at the same time as its objects became identifiable. Taking a look at these films throughout the Bhutto and Zia periods, it can be seen that the Pakistani government was only ready to accept comedy as long as it was not a threat to the political legitimacy and patriarchal ideology of the country.

**The Era of Bhutto: The Era of Sensitivity and Populism**

The fact that Insaan Aur Gadha was forced to be banned in 1973 gives an important insight into the limits of satire when it comes to populist governments. The movie, which was published at the time when Zulfikar Ali Bhutto was in power and whose government officially championed socialist and progressive ideas, was a spoof of political rhetoric that made use of allegory and anthropomorphism. It was apparent that the state was very sensitive to mockery, notwithstanding the language that was

used. According to recent reports in Dawn, the movie was given a ban soon after its release due to fears that a speech sequence where a donkey transformed into a person will be deemed to be making fun of the governmental leadership and the general public gathering.

Despite the fact that it claimed to be representing "the people," Bhutto's government remained intolerant of comedy that sought to undermine the spectacle of power. This instance raises a paradox of populist politics. The satire in Insaan Aur Gadha crossed an invisible border; it ceased to be metaphorical or abstract, rather it turned into something that could be understood as criticism. The restriction was only present for a short period of time, but the symbolic value was retained. The fact that it mimicked the language, gestures and emotional appeals of real political power constituted a warning sign that something very bad might be at work in satire.

This occurrence shows that humor was a test case for the political tolerance, which is something that can be confirmed from the standpoint of cinema studies. Based on the answer given by the state, it appears that the only time comedy was allowed to occur was when it was kept safely vague or when it was focused upon general characteristics of society. Once it became clear that satire was mocking leadership in and of itself, it opened the door to repression. To the contrary, this response underscores the power of humor as a means of political criticism, not limiting its power.

**The age of moral policing and withdrawing of the culture in the Zia's era.**

It was during the time of Bhutto when the political sensitivity of humour was brought forward; however, the period after the military takeover of Zia-ul-Haq was a much significant cultural change. Zia's initiatives towards Islamization created a major shift in the relationship that existed between film and the state. The depictions of

gender, sexuality, and public behavior were tightly regulated due to the introduction of new censorship systems, morality, and regulation systems. The adherence of films to a "Islamic" moral code became an increasingly important factor in determining whether or not they were appraised for their political content.

The year 1979 saw the appearance of Aurat Raj, which was set in this setting. In contrast to Insaan Aur Gadha which used allegory to attack political discourse, Aurat Raj explicitly attacked patriarchal power by picturing a society in which women were in charge of governing. As a consequence of its role reversal to such an extreme, musical mockery, and visual inversion - where men are subjected to surveillance, clothing regulations, and public humiliation - this made patriarchy visible and comical. This kind of a satire was not only hilarious, but rather seriously uncomfortable in the context of the kind of ideological milieu that was prevalent during the Zia administration at the time.

It is necessary to see Aurat Raj's marginalization and financial failure in relation to the bigger machinery of moral policing, even though it was not legally proscribed in the same way as Insaan Aur Gadha was. The movie was in direct opposition to the developing conservative discourses that put an emphasis on the submissiveness, domesticity, and modesty of women. A disruption of the gender paradigm then, which was being aggressively locked in place by the state, was brought about by Aurat Raj through the staging of female political leadership and male fragility. During this time period the space for female expression in popular film was becoming more limited and its reception reflects this tendency.

**The Danger of Satire**

These cases of censorship, if considered as a whole, throw some light on a fundamental contradiction of satire in Pakistan, which is that it is only allowed when its targets are vague. The reclassification of comedy as harmful is a case where it is

able to be viewed as a criticism, whether of political leadership or of patriarchal control. A pattern like this is indicative of the ambiguity of satire as both a safeguard and a constraint for the expression.

**Development of Film and Culture Studies as a Contribution**

By recasting the role that the satire plays in Urdu cinema, where cinematic humor is located in the context of Pakistan's political history over time and where Aurat Raj is put on the frontline as an early feminist intervention, this work is a great contribution to the field of film and cultural studies. Collectively, these contributions constitute a challenge to the prevailing trends in academia that tend to marginalize the role of humor, depoliticize popular cinema, and overlook gendered criticism in the popular film cultures.

**A Revaluation of the Genre Concerning Satire as a Prime Mode in Urdu cinema**

The first thing that this research does is make satire an important form of Urdu film and not a marginal form. The extant body of research on Pakistani cinema has, for the most part, given the status of dominating genres to melodrama, nationalism, and realism. On the other hand, humor and satire have tended to be viewed as forms either escapist or motivated by financial concerns. This study uncovers the fact that satire was a progressive and purposeful aesthetic approach through which the filmmakers expressed their criticism of society through films such as Rangeela (1970), Insaan Aur Gadha (1973) and Aurat Raj (1979). This was achieved through a detailed analysis of such films. These movies illustrate that satire was not just a decorative element, but rather, was actually integrated in the design of the story, the way the characters were built, and how they acted.

This research adds to the growing genre theory in the area of South Asian film studies by placing the narrative and ideological activity of satire in the foreground.

Filmmakers were able to interact with issues of class disparity, government power, and moral hypocrisy in ways that were not possible via the use of realism. This is demonstrated by the use of comedy, exaggeration and inversion. A larger view of popular film as a venue of critical discourse is encouraged by this reappraisal. In this context, laughter represents a cultural language of dissent that is intelligible. As a result of this, the research contributes to the ongoing debates in the field of cinema studies on the political capacities of popular genres and challenges the hierarchy that accords "serious" types more importance than comedic ones.

**Humor, censorship and moral regulation are all placed in the context of history.** Second, the research situates instances of comedy in films within the context of the peculiar political history of censorship and moral control in Pakistan, notably, in the second half of the 1960s and the 1970s. It is the study that puts stress on the historical contingency of satire, rather than viewing satire as a form that is eternal or universal. Films like Insaan Aur Gadha and Aurat Raj were made in an era when the state had a greater level of control over culture. In these times, movies that criticized political issues outright ran the risk of being banned or censored. Within the framework of this situation, satire developed as a way of indirect dissent, which was strategic in nature, a way of criticism that was masked in metaphor, imagination, and humor.

Through the process of locating satirical films relative to moments of political transformation, such as populist politics and the first few years of authoritarian Islamization, the research shows how humor worked to negotiate the limits of what was acceptable. By giving a picture of how aesthetic form responds to regulatory settings, such a historical contextualization contributes to the field of cultural studies. It shows that because of the ambiguity of satire, the fact that it is capable of amusing whilst being upsetting, it was possible to pass critical ideas in public arenas that were very restricted, through film. By the same token, the research

acknowledges the shortcomings of the satire, noting how the end of a tale so often leads to a reordering of the society. This reflects the demands that are imposed on filmmakers who work inside censorship regimes.

Scholarship on media and power is made richer by this method since it creates a link between genre analysis and political history. It underlines the fact that comedy in Urdu cinema is impossible to treat independently of the institutional frameworks that governed what could be seen, stated or suggested on screen. These frameworks include censorship boards, moral discourses and state ideology.

**A Study of Feminist Cinematic Intervention in Film Aurat Raj**

The third and most important contribution that this research does to offer is in terms of contributing to a gendered interpretation which places Aurat Raj in the spotlight in the form of an early feminist cinematic intervention that is worthy of serious scholarly consideration. Aurat Raj has often been found to be a curiosity or a financial failure, even though it includes the expression of an ambitious idea and explicitly engages with the authority of gender. This study reclaimed the film as a pioneering work that exposes the patriarchal standards through the use of the speculative fiction and role reversal by interpreting the film through the lens of feminist cinema theory and satire studies.

According to the findings of the research, Aurat Raj uses gender inversion not only for a comedic effect, but also as an important tactic that makes patriarchy obvious. In order to make it clear to the viewers the creation, performance and situationally of gender hierarchy, the movie has male characters go through the experience of being restricted in the same way that women have been restricted throughout history. This reading contributes to the field of feminist media studies by bringing into attention a forgotten example of South Asian feminist imagination in the context of

popular film. This example precedes many of the current discussions on the portrayal of gender.

More than that, the fact that Aurat Raj is located within the cultural politics of the Zia period brings out the dangers that are inherent in the feminist satire that it contains. The marginalization of the film is not understood to be evidence of the failure of the film but is interpreted as an indication of the hostile ideological environment against which the film fought. This research brings into focus the significance of Aurat Raj, the contribution toward the growth of the archive of feminist cinema history in the South Asian region. Additionally, it highlights the need for more academic attention to be given to popular genres of satire as sites of gendered criticism.

**Conclusion**

Indirect dissent in 1970s Urdu satire is a humor and exaggeration (and inversion of narrative) used to get around censorship, morality, and politics. Satire housed criticism within popular cinematic genres allowing the dissemination of social commentary to remain ambiguous. Rangeela, Insaan Aur Gadha, Aurat Raj demonstrates the way Urdu cinema's laughter delighted the spectator and exposed social, political and gendered inconsistencies.

Rangeela is a satirical film in which the satire is societal. The film sees the humor in the unemployment, the constant instability of housing, and the fragile quest for dignity in an inhospitable metropolitan environment. It is aimed at micro-social interactions between the poor and landlords, employers or urban elites in order to reinforce class hierarchy as opposed to government power. Antagonism is replaced by empathetic laughter. It allows poor characters to suffer but not to lose social respectability and dignity. Satire becomes a survival tool and reveals the moral

dishonesty of a culture in which looks, appearance and social performance are valued more than ethics without suggesting of structural change.

Insaan Aur Gadha politicizing satire. The video is a parody of political rhetoric, leadership spectacle and mass obedience as it turns a donkey into a human. Grotesque inversion makes authority ludicrous, demonstrates lack of moral clarity in political systems. This film is openly a film against governmental legitimacy, unlike Rangeela's delicate social satire. After its publication, the authorities banned it for a while, demonstrating its displeasure with political comedy. Satire demonstrates the ease with which mockery can destroy power.

The most extreme form of satire is Aurat Raj. With extreme gender reversal and speculative imagination, the film fantasizes about a world run by women with males subjected to the same moral scrutiny and constraints as women. Extravagant satire employs camp aesthetics, musical extravaganza and exaggerated performances in an effort to challenge gender conventions. In place of comfort, humor presents viewers with inverted hierarchies. The film was marginalized during the first years of authoritarian moral control, and this is reflective of the shrinking space for female criticism in popular culture.

In all three of these films, satire uses temporary inversion. Narrative closure reasserts social order after ridiculing hierarchies and subverting power. Under censorship, popular movie is limited structurally. Despite these limitations, however, satire is important. Instead, they place emphasis on its fragility. Satire is a deadly weapon where the objects are known and laughing creates identification as opposed to distance. Revisiting the Urdu Satire of 1970s and popular film as archive of protest. These movies illustrate that comedy, even when tempered, can expose inequity, challenge authority and expose power. Satire has retained recognition even after

metamorphosis. Laughter directed at authority is powerful, if dangerous, cultural criticism.

**References**


- Bakhtin, M. M. (1984). Rabelais and His World. Bloomington: Indiana University Press.
- Ahmad, A. N. (2016). Explorations into Pakistani cinema: introduction. Screen, 57(4), 468–479. https://doi.org/10.1093/screen/hjw053
- Ahmad, A. N. (2014). Building Pakistan and filmmaking , An essay by Muhammad Hasan Askari. BioScope South Asian Screen Studies, 5(2), 175–181. https://doi.org/10.1177/0974927614550749
- Rabe, N. (2017, April 15). Sound of Lollywood: When men turned into dupatta-covered minions in 'Aurat Raj.' Scroll.in. https://scroll.in/reel/834575/sound-of-lollywood-when-men-turned-into-dupatta-covered-minions-in-aurat-raj

- Wikipedia contributors. (2025a, November 25). List of Nigar Awards. Wikipedia. https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_Nigar_Awards
- FILMAZIA URDU. (2025, August 6). RANGEELA | Full Movie | MUNAWAR ZAREEF, RANGEELA & SULTAN RAHI | Pakistani Urdu Movie [Video]. YouTube. Retrieved December 22, 2025, from https://www.youtube.com/watch?v=gBbwxN4e3Xk
- Tahira, M. (2025, October 20). The irreverent humour of Rangeela. Dunya Digital. Retrieved December 21, 2025, from https://dunyadigital.co/comment/the-irreverent-humour-of-rangeela
- Wikipedia contributors. (2025b, March 8). Insan aur gadha. Wikipedia. https://en.wikipedia.org/wiki/Insan_Aur_Gadha
- Paracha, N. F. (2020, October 18). SMOKERS' CORNER: BANNING CULTURAL PRODUCTS. Dawn. https://www.dawn.com/news/1585629

- Old is Gold. (2019, September 8). Insaan aur Gadha| Pakistani Old Movies| Old is Gold [Video]. YouTube. https://www.youtube.com/watch?v=qavY8n-Ov3E
- Wikipedia contributors. (2025c, June 15). Aurat raj. Wikipedia. https://en.wikipedia.org/wiki/Aurat_Raj
- Pakistani Bblockbuster Movies Channel. (2025, June 2). WATCH FULL PAKISTANI COMEDY AND MUSICAL FILM AURAT RAAJ | WAHEED MURAD | RANI | SULTAN RAHI |CHAKORI [Video]. YouTube. https://www.youtube.com/watch?v=JpJkIv0XLLI
- Paracha, N. F. P. (2018, March 8). Pakistan's first feminist film-maker. Medium.
- Rehman, M. (2016). Discourse on Gender, Religion, and Culture in Pakistani Films:A Narrative Analysis of Contemporary Independent Films from Pakistan [MA Thesis, The University of New Mexico]. https://digitalrepository.unm.edu/cgi/viewcontent.cgi?article=1093&context=cj_etds

- Filmazia Urdu. (2025, October). Rangeela (Theatrical Cut). Rangeela production. https://www.youtube.com/watch?v=gqW4bGNHHQk
- Old is gold. (2019, September). insaan Aur Gadha (Theatrical Cut). Syed Kamal. https://www.youtube.com/watch?v=qavY8n-Ov3E&t=34s
- Pakistani bBlockbuster Movies Channel. (2025, June). Aurat Raj (Theatrical Cut). Rangeela Production. https://www.youtube.com/watch?v=JpJkIv0XLLI&t=8544s
- Gazdar, M. (1997). Pakistan Cinema, 1947-1997. Oxford University Press, USA.
- pakistan film magazine. (n.d.). Insan aur gadha. Pakistan Film Magazine. Retrieved December 24, 2025, from https://pakmag.net/film/details.php?pid=1284

***

# Mind matters: Mental Health Literacy as a Pathway to Adolescents' Well-being

Arman Fatma

Ph.D. Scholar, Department of Educational Studies, Jamia Millia Islamia, New Delhi

**Abstract**

Mental health is an integral component of overall well-being of any person. It plays a crucial role in individuals' functioning, productivity, and social participation. In recent years, increasing mental health challenges among school-aged children and adolescents have drawn attention to the importance of mental health literacy (MHL) within educational settings. This paper presents a comprehensive review of literature on mental health literacy with a specific focus on adolescents, teachers, and parents within the school ecosystem. The review highlights the critical role of teachers and parents in identifying early signs of mental health difficulties, reducing stigma, and promoting appropriate help-seeking behaviours. The paper further examines the emphasis placed on mental health and well-being in India's National Education Policy (NEP) 2020 and critically analyses the gaps between policy intentions and implementation practices.

**Key words:** Mental health, Adolescents, well-being, policymakers, teachers, parents

## Introduction

According to the WHO constitution, *"Health is a state of complete physical, mental, and social well-being and not merely the absence of disease or infirmity".* This definition implies that mental health is more than just the absence of mental disorders or disabilities; it is a state of well-being in which an individual recognizes his or her own abilities, is able to cope with life's normal stresses, to work productively and fruitfully, and is able to contribute to his or her community. Mental health is an integral part of general health, has intrinsic value for the individual, society, and culture, and is vital to the well-being and operation of individuals, families, communities, and societies. Mental health is seen as affecting one's abilities to function and make the most of the opportunities that are available, and to participate fully with family, workplace, community and peers.

There is a close link between physical and mental health, as they affect each other directly and indirectly. It has a mutual relationship with the well-being and productivity of a society and its members and is essential for the well-being and functioning of individuals (GOI, 2020). It refers to the state of a person's mind, both their emotions and thoughts. The term thoughts refer to our cognitive functioning which includes different mental abilities like learning a new concept, exercising powers of reasoning, remembering or retaining information, problem-solving and decision-making skills as well as being able to pay attention.

A healthy mindset will be a greater investment for an individual. A healthy mindset is the key to achieving universal health, equitable access and human rights, social inclusion and equality, and sustainable economic development (Votruba et al., 2014). A goal of mental health establishment, health literacy is referred to be a health determinant factor (Nutbeam, 1994). The ability to access, absorbs, and comprehends fundamental health information and services in order to make informed health decisions are known as health literacy. It has evolved into a contributor to health status (Nutbeam, 2000).

**Mental Health Literacy (MHL)**

The concept of mental health literacy was first proposed by Anthony Jorm in 1997. He explained that mental health literacy is science and belief of recognizing problem, management, or prevention. Jorm explained there were several components in mental health literacy such as 1) specific problem recognition or difference of a psychological distress type, 2) having proper knowledge and beliefs about certain risk factors and causes, 3) having proper understanding and knowledge about self-help intervention, 4) having knowledge and belief about professional assistance availability, 5) having attitudes to seek accurate assistance, and 6) having knowledge to seek information about mental health (Rosen et al., 2007). Initially, mental health

literacy concept appeared in medical education in 1970 in the United States of America. This interest of topic has been increasing since 1990.

**Importance of Mental Health literacy**

Mental health literacy (MHL) is increasingly recognized as a critical skill for educators to foster the emotional well-being of students. Beyond emotional well-being, MHL empowers teachers to create inclusive learning environments, improve classroom management, and address behavioural issues effectively. It also enhances educators' ability to identify early warning signs of mental health problems, thereby enabling timely interventions that support students' academic success and overall personal growth. Moreover, promoting MHL within schools contributes to building a culture of empathy and resilience, extending benefits to families and the broader community. Thus, MHL includes the knowledge and skills required to identify mental health issues, reduce stigma, and promote appropriate help-seeking behaviours.

Studies by Jorm (2000) and Kutcher et al. (2016) highlight the critical role of MHL in reducing stigma and fostering help-seeking behaviours. Teacher-focused studies emphasize the need for professional development to equip educators with the skills to support student mental health effectively. Additionally, MHL empowers educators and parents to promote a positive school culture by integrating mental health topics into classroom discussions, reducing misconceptions, and encouraging open dialogue about mental health.

By fostering a supportive learning environment, MHL not only enhances individual student outcomes but also contributes to overall school performance and community well-being. This holistic approach is crucial for addressing the increasing prevalence of mental health challenges among students and equipping teachers and parents to be proactive facilitators of change

**Relevance of MHL for Adolescents**

Adolescents face unique social, emotional, and academic challenges. Middle school students typically fall into early adolescence, a critical stage of development encompassing the ages of 10 to 14 years. This period is marked by significant physical, emotional, and social changes, making students more susceptible to challenges like anxiety, stress, and self-doubt. Addressing these issues early can yield long-term benefits for their emotional resilience and overall well-being.

Developmental theories provide valuable insights into this stage. According to Erikson's psychosocial development theory, early adolescence corresponds to the "Industry vs. Inferiority" stage, where children strive to develop a sense of competence and accomplishment. Without proper support, they risk feelings of

inadequacy. Teachers and parents play a crucial role in fostering this sense of competence and mitigating negative emotions. Similarly, Piaget's cognitive development theory identifies this stage as a transition into formal operational thinking, highlighting students' increasing ability to process abstract concepts and reason logically. However, they require structured guidance to manage stress and develop healthy coping mechanisms.

Bronfenbrenner's ecological systems theory further emphasizes the importance of supportive environments, including families, schools, and communities, in shaping adolescents' mental health and overall development. Together, these theories underline the necessity of mental health literacy among teachers and parents, who collaboratively influence students' developmental outcomes. By addressing mental health challenges during this critical stage, educators and families can create an environment that nurtures emotional resilience, identity formation, and academic success. Given these developmental vulnerabilities, adolescents represent a critical population for mental health promotion and early intervention.

**Role of a Teacher in MHL**

Teachers are the valuable partners for mental health professionals at schools. Teachers are often the first adults to observe changes in students' behaviour and emotional functioning. Consequently, adequate mental health literacy enables teachers to identify early warning signs, provide initial support, and facilitate timely referrals to mental health professionals (Severson et al., 2007).

Mental health literacy not only aids teachers in supporting students' mental health but also enhances their ability to manage classroom dynamics effectively. Teachers with high mental health literacy are better equipped to foster a positive school climate, which is essential for both teaching and learning outcomes. They can serve as role models for students, demonstrating effective coping strategies and reducing the stigma associated with mental health problems.

By understanding the signs of mental health issues, teachers can intervene early, preventing the escalation of challenges that might hinder academic performance and peer relationships. Additionally, they might play important roles in school-based mental health intervention programs (Ringwalt et al., 2010).

Low teacher literacy at school about mental health problems experienced by learners led to serious impacts for them.

**Role of Parents in Mental Health Literacy**

Parents play a crucial role in fostering mental health literacy (MHL), as they serve as the primary support system for children during their developmental years. Research by Jorm (2000) emphasizes that improving parental MHL enhances their

ability to recognize early signs of mental health challenges in children, which in turn facilitates timely interventions. Parental MHL has been linked to reduced stigma around mental health issues and increased openness to seeking professional help (Sawrikar & Muir, 2010).

Moreover, parents' understanding of mental health significantly influences their ability to create nurturing and supportive home environments. A study by Lawrence et al. (2019) found that parents with higher levels of MHL demonstrated better communication with their children, enabling them to discuss emotional challenges effectively. This proactive communication reduces the likelihood of internalized stress and anxiety among children.

The challenges faced by parents in rural and under-resourced areas, where limited access to information and resources restricts their ability to support their children's mental health needs effectively (Reupert et al., 2021). In such contexts, parental MHL programs that provide practical strategies and foster collaboration with schools have proven beneficial in bridging these gaps.

Parents, alongside teachers, act as co-creators of supportive ecosystems for children, as emphasized by Bronfenbrenner's ecological systems theory. The alignment of efforts between parents and schools ensures consistency in addressing children's mental health needs across different environments (Swadi, 2013).

Strengthening parental MHL, therefore, becomes essential in building a holistic approach to fostering students' emotional well-being and resilience.

**NEP 2020's Emphasis on Mental Health**

India's National Education Policy (NEP) 2020 emphasizes holistic education, prioritizing life skills, emotional well-being, and mental health. This policy uniquely advocates for integrating mental health awareness into the school curriculum through initiatives such as wellness centres, life skills training, and counselling services.

The policy's focus on holistic education aligns with global efforts to integrate mental health into school curricula. NEP 2020 emphasizes the inclusion of life skills, emotional well-being, and mental health education as core components of the curriculum. It advocates for initiatives such as the establishment of wellness centres in schools, the integration of life skills training into the syllabus, and the deployment of trained counsellors to support student, teacher and parent well-being.

Additionally, NEP 2020 underscores the importance of reducing examination stress and creating a supportive school environment to foster holistic development. It advocates for the establishment of counselling services and wellness programs in schools, highlighting the role of teachers as key stakeholders in this process.

## Policy practice Gaps

Despite these goals, empirical evidence suggests that schools face significant challenges in operationalizing these directives due to a lack of trained personnel and resources. Furthermore, the policy's emphasis on fostering an inclusive and stress-free learning environment underscores the necessity of equipping teachers with the knowledge and tools to address students' mental health needs effectively. This highlights the importance of targeted interventions and continuous professional development programs for teachers.

While the policy advocates for integrating mental health awareness into the school curriculum, the preparedness of teachers and parents to implement these goals remains underexplored. Teachers often face challenges such as a lack of formal training, insufficient resources, and limited awareness of mental health issues, which hinder their ability to support students effectively. Teachers' and parents' mental health literacy and their attitudes toward fostering student well-being are crucial to bridging the gap between policy and practice.

## Challenges Faced by Teachers and parents

Research by Rickwood et al. (2007) and Goodfellow et al. (2022) identifies common barriers, including stigma, lack of training, and limited resources. These barriers often manifest differently in rural and urban school settings, especially in the Indian context. In rural areas, limited access to mental health resources and trained professionals exacerbates the challenges teachers face.

Schools in urban areas, while often better resourced, may encounter high levels of academic pressure and competition, contributing to stress among both teachers and students. Understanding these contextual differences is crucial for designing targeted interventions that address the unique needs of each setting.

Indian studies, such as Kumar and Singh (2018), underline the contextual challenges faced by teachers and parents in resource-constrained environments.

## Conclusion

Mental health literacy not only aids teachers in supporting students' mental health but also enhances their ability to manage classroom dynamics effectively. By understanding the signs of mental health issues, teachers can intervene early, preventing the escalation of challenges that might hinder academic performance and peer relationships. Furthermore, teachers with high mental health literacy are better equipped to foster a positive school climate, which is essential for both teaching and learning outcomes. They can serve as role models for students, demonstrating effective coping strategies and reducing the stigma associated with mental health.

Evidence-based interventions, such as those reviewed by Wei et al. (2015), suggest that structured training programs and school-wide mental health initiatives can significantly improve teachers' confidence and competence in supporting student well-being. These interventions can include comprehensive professional development modules tailored to address region-specific challenges, mentorship programs to guide teachers in applying mental health strategies, and collaborations with mental health professionals to provide ongoing support. Additionally, leveraging technology, such as online mental health training platforms, can ensure accessibility and scalability, particularly in under resourced areas.

Despite growing policy emphasis and empirical evidence supporting mental health literacy, limited research has examined the preparedness of teachers and parents within the Indian schooling context, underscoring the need for focused scholarly inquiry.

**References**

Anthony, E. J. (1969b). Identity—Youth and crisis. Journal of the American Academy of Child Psychiatry, 8(3), 559–562. https://doi.org/10.1016/s0002-7138(09)62239-1

Constitution. (n.d.). https://www.who.int/about/governance/constitution

Goodfellow, C., Macintyre, A., Knifton, L., & Sosu, E. (2022). Associations between dimensions of mental health literacy and adolescent help-seeking intentions. Child and Adolescent Mental Health, 28(3), 385–392. https://doi.org/10.1111/camh.12608

Jorm, A. F. (2000a). Mental health literacy. The British Journal of Psychiatry, 177(5), 396–401. https://doi.org/10.1192/bjp.177.5.396

Mastrorio, C. R., Trainor, K. M., & Splett, J. W. (2020). Teacher School Mental Health Literacy Survey: A Validation study. UF Journal of Undergraduate Research, 21(2). https://doi.org/10.32473/ufjur.v21i2.108493

Mental Health and Well-being: An Indian Psychology perspective. (n.d.). Routledge & CRC Press. https://www.routledge.com/Mental-Health-and-Well-being-An-Indian-Psychology-Perspective/Kumar/p/book/9781032396330?srsltid=AfmBOortdX-9pAzj-XIWhkz5d_Tw_maL12Ev2C6t4BP3IPTJ1VOxrpjk

Nalipay, M. J. N., Chai, C., Jong, M. S., King, R. B., & Mordeno, I. G. (2023). Positive mental health literacy for teachers: adaptation and construct validation. Current Psychology, 43(6), 4888–4898. https://doi.org/10.1007/s12144-023-04694-y

Nutbeam, D. (2008b). The evolving concept of health literacy. Social Science & Medicine, 67(12), 2072–2078. https://doi.org/10.1016/j.socscimed.2008.09.050

Ogorchukwu, J. M., Sekaran, V. C., Nair, S., & Ashok, L. (2016). Mental health literacy among late adolescents in South India: what they know and what attitudes drive them. Indian Journal of Psychological Medicine, 38(3), 234–241. https://doi.org/10.4103/0253-7176.183092

Van Geert, P. (1998). A dynamic systems model of basic developmental mechanisms: Piaget, Vygotsky, and beyond. Psychological Review, 105(4), 634–677. https://doi.org/10.1037/0033-295x.105.4.634-677

Wei, Y., McGrath, P. J., Hayden, J., & Kutcher, S. (2015). Mental health literacy measures evaluating knowledge, attitudes and help-seeking: a scoping review. BMC Psychiatry, 15(1), 291. https://doi.org/10.1186/s12888-015-0681-9

Yulianti, P. D., Surjaningrum, E. R., Sugiharto, D. Y. P., & Hartini, N. (2021). Mental Healthy Literacy of Teachers: a Systematic Literature Review. Journal of Educational Health and Community Psychology, 10(2), 339. https://doi.org/10.12928/jehcp.v10i2.20512

***

# Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act and Rural Women: A Sociological Study of Shimla District of Himachal Pradesh, India

**Dr. Vishav Jyoti**

**Associate Professor Department of Sociology and Social Anthropology**
**Central University of Himachal Pradesh, Kangra, India**

**ABSTRACT**

The Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA) which is introduced in 2005 is one of the most

transformative rights-based social welfare programmes of India that aimed at enhancing livelihood security, promoting gender-sensitive development and also strengthening participatory governance. It legally guarantees 100 days of wage employment to rural households willing to undertake unskilled manual labour, the Act has placed rural women at the centre of its scheme to promote their economic independence and empowerment. This research paper studies and investigates the level of awareness among rural married women regarding the main provisions and institutional mechanisms of the Scheme. It examines women's fundamental understanding of the registration process, attendance systems, job card issuance, work allocation and wage payments. The research also evaluates women's knowledge of worksite facilities such as drinking water, shade, first aid and crèche and how these facilities shape women's participation. Awareness of transparency and accountability tools, including Social Audits, the Right to Information (RTI) and grievance mechanisms is also assessed to determine the extent of women's involvement in the governance of the programme. The study was conducted in the Mashobra Block of Shimla District, Himachal Pradesh, an area which has high female participation under MGNREGA. Sample of 401 rural married women were selected through simple random sampling to ensure representation across socioeconomic parameters. The findings reveal that moderate levels of awareness, with women familiar with the scheme's broad objectives but lacking clarity on basic entitlements and procedural aspects. Whereas basic facilities such as drinking water, rest shade and first-aid are commonly available at worksites but there is an absence of crèche facilities which remains a crucial barrier for young mothers which in return limits their ability to work persistently. Awareness of transparency tools such as Social Audits and RTI remains particularly low, restricting women's ability to demand accountability or address discrepancies in work allocation and wage payments. The study concludes that although MGNREGA has enhanced women's access to wage labour, promoted financial inclusion and increased women's mobility, limited awareness prevents the scheme from achieving its full empowering potential. Strengthening information dissemination, improving infrastructural support especially crèches and

fostering active engagement with local governance institutions are essential to making MGNREGA more inclusive, transparent, and gender-responsive.

**Keywords: MGNREGA, awareness, rural women, transparency, empowerment, Himachal Pradesh.**

INTRODUCTION

Rural development has long been a cornerstone of India's economic and social planning. Despite the country's remarkable economic progress in recent decades, **rural poverty, unemployment, and gender inequality** continue to pose persistent challenges (Agarwal, 2008). To address these, the Government of India has introduced a series of rural employment and poverty alleviation programmes. Many schemes for the welfare of the weaker sections of the society have been started in India since Independence. So, India has a long history and experience in implementing wage programmes such as Community Development Programme, Small Farmers Development Agency, Drought Prone Area Programme, Twenty Point Economic Programme, Desert Development Programme, Training of Rural Youth for Self Employment, National Rural Development Programme, Rural Landless Employment Guarantee, Integrated Rural Development Programme, Antodya Yogna, Jawahar Rojgar Yojna, Employment Insurance Scheme, Swaranjayanti Gram Swarozgar Yojna, Jawahar gram Smridhi Yojna, Pradhan Mantri Gramlaya Yojna etc. implemented by the State governments with central assistance. These programmes are self targeting and the objective is to provide enhanced livelihood security, especially to those dependent on casual manual labour. Beginning with Community Development Programme in 1952, the outreach of these programmes increased significantly, culminating in Rural Guarantee Scheme which was implemented by the enactment of the National Rural Employment Guarantee Act (NREGA), 2005 (Tomar and Yadav, 2009).

Among them, the **Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA),** enacted in 2005, stands out as a landmark initiative transforming wage employment from a temporary welfare scheme into a **legal right**. The Act guarantees **100 days of wage employment per year** to every rural household whose adult members are willing to undertake unskilled manual labour. Beyond economic security, MGNREGA has a **sociological vision** that seeks to promote participation, empowerment, and transparency. It mandates that at least **one-third of beneficiaries be women** and integrates mechanisms such as **Social Audits and the Right to Information (RTI)** to ensure accountability and reduce corruption (Puthenkalam & George, 2012). These provisions have made MGNREGA a cornerstone of India's inclusive development agenda. During the **COVID-19 pandemic,** when economic activity came to a halt, the Government of India recognized the critical role of MGNREGA in sustaining rural livelihoods and announced continued support for women who are primary earners in their households, including payments for work done on their own land. The government also released **₹4,431 crore to clear pending wages**during the lockdown, reaffirming MGNREGA's importance as a social safety net (PTI,

2020). Finance minister Nirmala Sitharaman acknowledged the crucial role that the employment guarantee scheme (MGNREGA) can play in reviving the rural economy and hence announced allocation of Rs. 40,000 crore for the scheme (Bose and Roy, 2020). Men and women are the indispensable part of growth and development of any nation. Women have contributed a lot to economic productivity but their role has been visualized as a passive one. The old system of considering women as men's property is still deeply rooted in our society. Although changes have taken place in a portion of urban women but the women living in rural areas are marginally affected by these changes. The achievement of inclusive growth and overall development is highly dependent on the gender equality and prosperity of women in the rural society (Das, 2020). Women after working in MGNREGA have benefitted individually through access to income for own and family needs and at the community level through increased presence at the Gram Sabha and participation in local governance (Minati, 2014). MGNREGA is the main source of alternative employment for women and this programme has led in decreasing the dependence of women on men (Ravindar, 2016).

Unlike earlier wage employment programmes, MGNREGA's uniqueness lies in its **legislative foundation.** Passed by the Parliament of India as Act No. 42 of 2005, it represents a **rights-based approach** that makes the state legally accountable to provide employment on demand. As Dreze (2005) notes, the difference between a *scheme* and an *Act* is fundamental: a scheme can be modified or discontinued by executive order, but a law can only be altered through parliamentary amendment. Hence MGNREGA is a **paradigm shift** in India's social policy framework. The MGNREGA aims not only to provide wage employment but also ensures in **creating durable and productive assets** in rural araes thereby strengthening the livelihood base of local communities.

In **Himachal Pradesh**, the scheme was implemented in **three phases**. In the **first phase** (from 2 February 2006), the districts of **Chamba** and **Sirmaur** were included. The **second phase** with its beginning on **1 April 2007**, extended coverage to **Kangra** and **Mandi.** The **third phase** which was launched on **1 April 2008**, brought the remaining eight districts **Bilaspur, Hamirpur, Kinnaur, Kullu, Lahaul and Spiti, Shimla, Solan, and Una** under its coverage (MGNREGA Operational Guidelines, Ministry of Rural

Development, Government of India, 2008; http://nrega.nic.in/guidelines.htm).

Within Shimla district, the **Mashobra Block** holds special significance as it has the highest proportion of registered women workers. The area's relatively higher literacy levels, cohesive social networks, and active Gram Panchayats provide a unique context to study how women perceive and engage with MGNREGA.

Hence, with this backdrop this present study seeks to **analyze the awareness of rural women** regarding the Act's guidelines, organizational setup, and infrastructural provisions in the Mashobra Block of Shimla District. It further studies women's participation patterns, their access to worksite facilities, and their understanding of RTI and Social Audit. Through this analysis, the study aims to assess how **awareness functions as a mechanism for women's empowerment**, enabling them to move from being passive beneficiaries to active rights-holders within rural development processes.

# OBJECTIVES OF THE STUDY

The study aims to analyze the awareness, participation and empowerment of rural married women under the Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA) in Shimla District of Himachal Pradesh. The objectives are:

1. To examine the **level of awareness** among rural women regarding the guidelines, registration process, and employment provisions under MGNREGA.
2. To analyse the **women's participation patterns** in different categories of work and their access to worksite facilities.
3. To assess the women's **knowledge of transparency mechanisms** such as the Right to Information (RTI) and Social Audit.
4. To explore the **socio-cultural and institutional factors** influencing women's effective participation in MGNREGA.
5. To provide **sociological insights** into the empowerment outcomes and challenges experienced by rural women under MGNREGA.

Theoretical Framework

This study uses two major theoretical perspectives. **Feminist Theory** and **Amartya Sen's Capability Approach**. These frameworks help to explain how rural women's awareness, participation and empowerment under MGNREGA are shaped by social structures and access to opportunities.

## Feminist Theory

Feminist theory examines how gendered power relations influence women's access to resources, labour opportunities, and social participation. It argues that women's marginalisation is rooted in patriarchal norms that restrict mobility, undervalue women's labour, and limit decision-making power. As Beauvoir (1953) notes, women are often positioned as secondary within social structures, which affects their autonomy in public and private spheres.

In rural society of India this becomes visible in the unequal burden of domestic work, lack of control over income and the limited interaction with governance systems. MGNREGA tries to challenge the inequalities by offering equal wages, guaranteed employment and gender-sensitive provisions such as worksite facilities. Still women's ability to benefit depends on their *awareness* of rights and entitlements. Kabeer (1999) emphasizes that empowerment

requires access to information, resources and agency all of which are central to this study.

## Amartya Sen's Capability Approach

Sen's Capability Approach views the development as the expansion of individuals' real freedoms to lead the lives they value (Sen, 1999). Under this approach, MGNREGA is not only a wage employment programme but a mechanism for enhancing women's capabilities like economic independence, mobility, social participation and decision-making.

Awareness plays a pivotal role here. Women may have the legal right to work nevertheless without knowledge of job card entitlements, transparency mechanisms or worksite provisions, their *capabilities* remain limited. Nussbaum (2000), extending Sen's ideas, argues that improving women's capabilities requires supportive social and institutional environments. Facilities like crèches, drinking water, and medical aid therefore become essential in enabling women's full participation.

Collectively these two approaches i.e. Feminist Theory and the Capability Approach provides a comprehensive foundation for this research. Feminist Theory highlights **structural and cultural barriers** like patriarchy, gender

roles and mobility restrictions while the Capability Approach focuses on **expanding real choices and freedoms.** These approaches help explaining that why awareness is essential for empowerment. How worksite conditions affect women's ability to participate. How income, mobility, and social recognition enhance women's capabilities and why rights-based programmes like MGNREGA can transform gender relations

It allows the study to analyze not only whether women participate in MGNREGA but **how and to what extent the programme enhances women's empowerment**.

REVIEW OF LITERATURE

In the context of the present study, it is important to take cognizance of some of the major works carried out on MGNREGA and its impact on rural women. A review of these studies provides insight into the multidimensional aspects of the programme its potential for employment generation, gender equity, and empowerment as well as the challenges that limit its effectiveness.

**Kaushal and Singh (2016)** in their paper, "A study of Women Participation in MGNREGA in Himachal Pradesh" explored the reach and impact of MGNREGA on economic empowerment of rural women particularly in Himachal Pradesh. The study revealed that women

participation in MGNREGA is increasing with the passage of time and they are sharing financial burden with men in shouldering family responsibilities. However, a need is felt to improve awareness amongst women and timely payments to beneficiaries will add fillip to success of the scheme.

**Dheeraj (2017),** "A Critical Analysis of the Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA)" analyzed whether MGNREGA addressed problems of rural poor. He concluded that women opting in to the MNREGA programme has positive impact as it has provided women with their own economic independence and freedom and the MNREGA does not discriminate between a man and a woman in terms of wages, the wages of both man and woman are same, and this also provided a boost in confidence for women.

**Ali, Shekhar and Guroo (2018)** in their article, "Women Empowerment and gender equality under MGNREGA a great revolution in rural life" which was conducted in district Kulgam of Jammu and Kashmir. In this study an attempt was made to study the empowerment of women and gender equality under MGNREGA. It was found that the act provided them work within the five kilometers of the village, which helped them to work in their society and protected them from travelling a long distances in search of work. Women workers work with their partners. The authors concluded that MGNREGA has empowered women and Government should check the issues at ground level so that women can get maximum benefits out of the scheme

**Srinivas and Pandyaraj (2018)** in their study *"MGNREGA and Women Empowerment: A Study of Pannur Village in Chittoor District of Andhra Pradesh, India"* examined the influence of MGNREGA on women's empowerment and gender equality. The research, based on both primary and secondary data, used a stratified random sample of 50 women households for in-depth analysis. The study found that MGNREGA has significantly increased women's income levels, participation in Gram Sabhas, and involvement in social audits. It also changed consumption and spending patterns, contributing to partial empowerment. However, the authors cautioned that while MGNREGA helps break certain gender barriers, full empowerment requires broader macroeconomic and structural reforms.

**Curry (2019)** in her study, 'Policies and Potentials for Women Empowerment in Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act' where she found that despite the challenges faced by women workers, MGNEGA is viewed as positive. It was also found that women prefer to work under MGNREGA because of its flexible features of work hours and ability to bring their children to the worksites.

**Duari (2019)** in her study "Implementation of Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA) On Women

Empowerment in Rural Development: A case study of Erga Blocks I and II in Purbamedinipur, West Bengal" which was based on the survey method and the primary data was collected from the respondents on convenient sampling basis. The numbers of respondents were 60. The study revealed that women work force participation under the scheme surpassed the statutory minimum requirement of 33 percent and the trends indicate an increase in the participation rate at the national level, every year women participation has been around 48 percent. The scheme provided an opportunity for women to attain social and economic empowerment. It calls for intervention by authorities to ensure smooth functioning of this programme, free from mal practices and corruption so that it can act as a tool to rejuvenate the unproductive and under productive section of our country in coming years.

**Ali and George (2019)** in their study, "A qualitative analysis of the impact of Kudumbashree and MGNREGA on the lives of women belonging to a coastal community in Kerala" which was a qualitative study consisting of Focused group discussions and key informant interviews were conducted on women belonging to the fishing community who were active members of both the Kudumbashree and MGNREGA program. The study showed that participation in Kudumbashree and MGNREGA was found to have a positive impact on the lives of these coastal women. It has resulted in social, economic and political empowerment along with an improvement in their leadership skills and decision making capacity. Their participation in these groups not only led to empowerment in various domains of their lives but also had an impact on their health awareness, needs and utilization of healthcare services. The study concluded that both Kudumbashree and MGNREGA were found to very useful platforms for the empowerment of women and thereby aiding in the eradication of poverty. Irrespective of a few lacunae's in these programs, it has resulted in the creation of a cohort of empowered women who can be effectively used as future ambassadors for spreading health awareness in the community.

**Abraham and Nandy (2020)** in the study titled, 'Does the NREGA work for the Empowerment of Women' found that roles are no longer restricted

to traditional norms. This study covered Jharkhand State where it has been found that women are now participating in the workforce with men like becoming mates, developing technical expertise, working as planners and trainers, sitting in block level offices. The article also showed that women have significant control over processes and resources. Now women also decide what assets will be created and also take decisions related to sanctioning, implementation and grievances. It was also found that women who were not earning anything earlier and now getting money credited to their accounts. Females also stated that they feel physically weak because they have to work under the scorching heat. The study also highlighted some of the challenges women are facing in terms of calories being consumed by them.

**Das (2020)**, in her study *'Empowerment of Rural Women through MGNREGA: A Study of MGNREGA Implementation in Barpeta Development Block of Barpeta District of Assam'*, assessed the scheme's impact using a sample of 50 women beneficiaries drawn from five Gaon Panchayats. The study was based on both primary and secondary data and it found that MGNREGA had contributed to the economic empowerment of rural women though the success was hindered by defective implementation, delayed wage payments, and lack of transparency. Das concluded that the Act's progressive provisions remain under utilised due to weak monitoring and administrative inefficiency.

Collectively, these studies indicate that since MGNREGA has substantially increased women's participation in the rural workforce but **awareness,**

**transparency, and implementation gaps** continue to restrict its full impact. Most of the available research focuses on economic outcomes income generation and work participation while the most important cognitive and sociological dimensions of empowerment, such as awareness of rights, access to information, and institutional accountability remain underexplored. Very limited studies have examined these aspects in **hill regions like Himachal Pradesh** where terrain, scattered settlements and unique gender dynamics shape programme outcomes. Hence, the present study attempts to fill this gap by exploring rural women's awareness and participation under MGNREGA in the Shimla District of Himachal Pradesh through a sociological lens.

## RESEARCH GAP

Irrespective of the significance of MGNREGA in enhancing rural women's livelihoods, existing literature reveals and finds a **dearth of research on women's awareness of MGNREGA guidelines, organizational setup and infrastructural provisions** in Himachal Pradesh particularly in Shimla District. Most existing studies emphasized on economic outcomes such as

income generation, work participation and poverty reduction but the **sociological dimensions of empowerment** remain insufficiently explored.

Additionally, the unique socio-cultural and geographical context of Himachal Pradesh marked by dispersed settlements, gendered division of labour, and strong local governance systems has received minimal academic attention. Consequently, **this study seeks to bridge this gap** by exploring rural married women's awareness and participation in MGNREGA in Shimla District. It aims to contribute to a deeper and more comprehensive understanding of how the programme influences women's empowerment and inclusion in the Himalayan context.

METHODOLOGY

The present study employs a **descriptive research design** to assess the awareness and participation of rural married women under MGNREGA in Shimla District of Himachal Pradesh. The state was selected owing to the limited empirical work available on the gendered impact of MGNREGA in hill regions. Himachal Pradesh comprises twelve districts. Among these, **Shimla District**, covered under the third phase of MGNREGA's implementation (from

April 1, 2008), was purposively chosen. Within the district, the **Mashobra Development Block** was selected as the study area because it exhibits socio-cultural homogeneity and a significant number of women registered under the scheme. A total of **401rural married women respondents** were selected using **simple random sampling** from the list of registered workers maintained by local Gram Panchayats.

Data Collection

The study is based on the **primary and secondary sources**. **Primary data is** collected through a structured interview schedule containing both open-ended and close-ended questions, complemented by participant observation during fieldwork and a secondary data is obtained from government records, official MGNREGA reports, relevant journal articles, books, and online sources.

Data Analysis

The data were analyzed using **descriptive and inferential statistical tools,** including percentage distribution and **cross-tabulation** to identify relationships between socio-demographic variables (education, marital status, caste, etc.) and awareness levels. Qualitative data were analysed thematically

to interpret the social meanings and experiences underpinning women's participation.

### Ethical Considerations

Ethical standards were strictly followed. Informed consent was obtained from all participants, and their confidentiality and voluntary participation were ensured.

### Rationale for Study Area

The socio-cultural and spatial uniqueness of Himachal Pradesh—with its scattered habitation patterns, gendered work participation, and strong Panchayati Raj institutions makes it an ideal context to study MGNREGA's impact on women's awareness and empowerment. The **Mashobra Block**, which has one of the highest numbers of women participants under the programme, provides a suitable setting to examine how rural women **perceive, access, and experience** a rights-based employment scheme.

## SOCIO-DEMOGRAPHIC PROFILE OF RESPONDENTS

The socio-economic status, educational background, and marital position of women significantly influence their access to information, participation in Gram Sabhas, and perception of empowerment.

Table 2.1 presents the socio-demographic profile of the 401 rural married women selected for the study from the Mashobra Block of Shimla District, Himachal Pradesh.

Table 2.1: Socio-Demographic Profile of Respondents (N = 401)

| Variable | Category | Frequency | Percentage (%) |
|---|---|---|---|
| Age (in years) | 18–25 | 66 | 16.46 |
| | 26–33 | 90 | 22.44 |
| | 34–41 | 100 | 24.94 |
| | 42–49 | 85 | 21.20 |
| | 50+ | 60 | 14.96 |
| Marital Status | Married | 285 | 71.07 |
| | Unmarried | 40 | 9.98 |
| | Widowed | 60 | 14.96 |
| | Divorced | 16 | 3.99 |
| Educational Status | Illiterate | 40 | 9.98 |
| | Primary | 72 | 17.95 |
| | Middle | 102 | 25.44 |
| | Matric | 98 | 24.44 |
| | +2 | 60 | 14.96 |
| | Graduation | 29 | 7.23 |

Source: Field Survey

The data indicate that the majority of respondents (24.94%) were in the 34–41-year age group, reflecting an active working population. Most respondents were married (71.07%), suggesting that women's participation in MGNREGA is often family-driven. Educationally, a majority were literate, with nearly half

having completed middle or matriculation level education. This educational base plays a crucial role in shaping awareness, understanding of programme provisions, and capacity for decision-making.

The inclusion of these socio-demographic variables allows for more meaningful cross-tabulation analysis in the subsequent section, linking education, age, and marital status to awareness, participation, and empowerment under MGNREGA.

# RESULTS AND DISCUSSION

After collecting primary data from 401 rural married women, the responses were classified, tabulated, and analysed using descriptive statistics and cross-tabulations. The results are interpreted sociologically to understand women's awareness, participation, and empowerment under MGNREGA in Shimla District of Himachal Pradesh.

Sources of Information about MGNREGA

**Table 3.1**

Sources of Information about MGNREGA

| Sr. No. | Source of Information | Frequency (N = 401) | Percentage (%) |
|---|---|---|---|
| 1 | Newspaper | 10 | 2.49 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 2 | Radio | 350 | 87.28 |
| 3 | Television | 50 | 12.47 |
| 4 | Poster | 5 | 1.25 |
| 5 | Panchayat | 401 | 100.00 |
| 6 | Friends / Relatives / Neighbours | 200 | 49.87 |
| 7 | Any other | 0 | 0.00 |

**Note:** Multiple responses permitted.

All respondents (100 %) identified the **Gram Panchayat** as the principal source of information.. 87.28 percent replied that radio is another source through which they got information about MGNEGA, 49.87 replied that they also got information about MGNREGA through their friends, relatives and neighbors, 12.47 percent said that television also remained the source for getting information about MGNREGA, 2.49 percent replied that newspapers were also the source of getting information about MGNREGA where they read about this scheme and 1.25 said that they got information through posters which were pasted on the walls. Further, there is no respondent who said about any other source through which she got information about MGNREGA.

This confirms the **dominant communicative role of Panchayats** in rural Himachal Pradesh. Yet, reliance on intermediaries implies a *top-down flow of*

*information* where women's awareness depends on local institutions rather than self-accessed media.

Given that 90 percent of the respondents were literate (Table 2.1), it was pertinent to analyze how education influenced their access to information about MGNREGA. Education determines not only access to media but also the ability to interpret and act upon government programmes. Hence, the relationship between education and primary sources of information was examined.

Cross-Tabulation 3.1(a): Education Level × Source of Information

| Education Level | Panchayat (%) | Radio (%) | TV (%) | Newspaper (%) | Friends / Neighbours (%) |
|---|---|---|---|---|---|
| Illiterate | 100 | 89 | 6 | 0 | 54 |
| Primary | 100 | 86 | 10 | 2 | 50 |
| Secondary & Above | 100 | 80 | 25 | 9 | 44 |

Table 3.1(a) reveals that while Panchayats remained the universal source of information across all education levels, educated women were more likely to access secondary information channels such as newspapers and television. In contrast, illiterate women relied heavily on Panchayat announcements and interpersonal networks. This pattern highlights how education broadens informational diversity, fostering greater awareness and agency among women

workers under MGNREGA.

2. Role of Gram Sabha in Mobilising Applicants

Table 3.2

**Gram Sabha's role in explaining provisions and mobilisation**

| Response | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Yes | 401 | 100.00 |
| No | 0 | 0.00 |

As per the MGNREGA Operational Guidelines (2008) Section 2.1.2, the information is to be shared by the Gram Sabha about the Scheme. All respondents confirmed that the **Gram Sabha** explained MGNREGA provisions and mobilised them for registration. Field visits revealed that *Gram Sewaks* and *Panchayat Secretaries* guided applicants, aligning with the MGNREGA (2008) guidelines.

However, qualitative data show that women's participation during these meetings is **largely passive** they attend but seldom voice opinions reflecting *patriarchal constraints within participatory governance*.

3. Year of Registration

**Table 3.3**

**Year of applying for registration**

| Year | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| 2008 | 255 | 63.59 |

| | | |
|---|---|---|
| 2009 | 85 | 21.20 |
| 2010 | 36 | 8.98 |
| 2011 | 15 | 3.74 |
| 2012 | 10 | 2.49 |
| Total | 401 | 100.00 |

As the Act was started in phases only therefore Shimla and some other Districts as are covered w.e.f. 1st April, 2008. Hence, the registration process started from 2008. Most women (63.59 %) registered in 2008, the first year of implementation in Shimla. This early participation suggests active Panchayat mobilisation, yet many women registered **without full understanding of their entitlements**, showing *participation without awareness* (Khera & Nayak, 2009).

## 4. Mode of Application

**Table3.4**

**Mode of submitting registration application**

| Mode | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Application on printed form | 0 | 0.00 |
| Application on plain paper | 300 | 74.81 |
| Oral request | 101 | 25.19 |
| Total | 401 | 100.00 |

As per MGNREGA Operational Guidelines (2008), Section 5.2 explains the process for registration in MGNREGA. It is clearly written that the application for registration may be given on the paper to the Gram Panchayat. It should have the names of adult members of the household who are interested to do unskilled manual work. The State Government may make a printed form available, but a printed form will not be insisted upon (MGNREGA Operational Guidelines, 2008). Most respondents (74.81 %) submitted applications on plain paper, guided by Panchayat members; 25.19 % made oral requests. None used printed forms. This aligns with operational guidelines but also indicates **administrative dependence** many illiterate women relied on others to write for them.

## 5. Place of Application

**Table 3.5**

**Place where employment was requested**

| Place | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Gram Panchayat | 401 | 100.00 |
| Worksite / Block Office | 0 | 0.00 |
| Any other | 0 | 0.00 |

All respondents applied through the Gram Panchayat, confirming its central role. Yet exclusive dependence on this single institution restricts **upward accountability** and limits women's exposure to higher governance levels.

## 6. Time Taken to Issue Job Cards

**Table 3.6**

**Duration to receive Job Card after registration**

| Duration | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Within 15 days | 401 | 100.00 |
| After 15 days | 0 | 0.00 |
| After 1 month | 0 | 0.00 |

Source: Field Survey

As per the Act, it is mandatory that Gram Panchayat will issue Job Cards to every registered household as it is a legal document and it should be issued immediately after verification within a fortnight of the application for registration. All respondents obtained job cards within the prescribed 15 days. Implementation efficiency is high; however, respondents were **unaware of this legal entitlement,** showing functional success but informational deficiency (Das, 2020).

## 7. Employment and Unemployment Allowance

**Table 3.7**

**Job received after application**

| Response | Frequency | Percentage |
|---|---|---|

| | | |
|---|---|---|
| Yes | 390 | 97.26 |
| No | 11 | 2.74 |

The Gram Panchayats are responsible for providing job to the applicant within 15 day of the receipt of application and if not so then unemployment allowance is to be given to the applicant. The unemployment allowance will be paid as per Section 7 of the Act (MGNREGA Operational Guidelines, 2013). Almost all respondents (97.26 %) were provided employment. The 11 women who were not employed received **no unemployment allowance,** revealing a breach of Section 7 of the Act. Their unawareness of this right demonstrates **weak legal consciousness** and *institutional asymmetry* between local authorities and women workers.

## 8. Type of Work Undertaken

**Table 3.8**

**Nature of work performed under MGNREGA**

| Type of Work | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Water conservation | 150 | 37.41 |
| Drought proofing | 100 | 24.94 |
| Flood control | 70 | 17.46 |
| Land development | 205 | 51.12 |
| Irrigation canals (kuley) | 120 | 29.92 |
| Renovation of traditional water bodies | 130 | 32.42 |
| Rural connectivity | 250 | 62.34 |
| Livestock-related work | 190 | 47.38 |

Note: Total Number of Respondents is 401. Multiple choices are permitted.

Women participated in multiple work categories, mainly **rural connectivity (62.34 %), land development (51.12 %),** and **livestock-related activities (47.38 %).** These projects enhanced mobility, agricultural productivity, and household income.

Considering the age distribution of respondents (Table 2.1), it was relevant to explore whether age influenced the type of work undertaken under MGNREGA. Age often determines physical capability, work preferences, and household responsibilities, all of which affect participation patterns.

Cross-Tabulation 3.8(a): Age Group × Type of Work

| Type of Work | 18–30 yrs (%) | 31–40 yrs (%) | 41–50 yrs (%) | 51 + yrs (%) |
|---|---|---|---|---|
| Rural connectivity | 70 | 65 | 58 | 40 |
| Land development | 55 | 52 | 49 | 35 |
| Livestock-related | 60 | 50 | 35 | 25 |
| Water conservation | 30 | 38 | 45 | 50 |

Younger women (18–30 years) were more engaged in physically demanding work such as rural connectivity and livestock activities, whereas older women (41 years and above) tended to prefer land and water conservation projects. This

distribution reflects an age-based division of labour influenced by physical capacity and domestic workload. The data indicate that while MGNREGA provides inclusive opportunities, younger and middle-aged women contribute more intensively to its physical output.

## 9. Awareness about Right to Information (RTI)

**Table 3.9**

**Awareness of RTI provisions**

| Response | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Yes | 0 | 0.00 |
| No | 401 | 100.00 |

As per MGNREGA, RTI should be followed in all matters pertaining to MGNREGA. Section 4 of the Act deals with the proactive disclosure of information which must be complied with at all levels. None of the respondents were aware of RTI rights related to MGNREGA. The **absence of transparency awareness** suggests that women cannot question irregularities or demand records—undermining accountability.

Given the varying educational attainment of respondents (Table 2.1), an attempt was made to examine whether awareness about the Right to Information (RTI) correlated with education. RTI awareness is essential for transparency, grievance redressal, and accountability under MGNREGA.

Cross-Tabulation 3.9(a): Education Level × RTI Awareness

| Education Level | Aware (%) | Not Aware (%) |
|---|---|---|
| Illiterate | 0 | 100 |
| Primary | 0 | 100 |
| Secondary | 0 | 100 |
| Above Secondary | 0 | 100 |

Table 3.9(a) shows that awareness of RTI is uniformly zero across all education levels. Even women with secondary or higher education were unaware of their right to access public records related to MGNREGA. This suggests that the gap in transparency is institutional rather than individual, arising from inadequate information dissemination and lack of proactive efforts by local administrative authorities.**10. Awareness about Social Audit**

10. Awareness about Social Audit

Table 3.10

**Awareness about Social Audit**

| Response | Frequency | Percentage |
|---|---|---|
| Yes | 0 | 0.00 |
| No | 401 | 100.00 |

None of the respondents had heard of **Social Audit**, although these are mandated to ensure transparency. Discussions in Gram Sabhas are procedural rather than participatory, meaning beneficiaries are *workers but not watchdogs* in governance.

## 11. Awareness of Worksite Facilities

Field investigation revealed that all respondents reported availability of **drinking water, shade, and basic medical aid,** but none had ever seen a

**crèche facility.** Most were unaware that these facilities are legally required. This gap illustrates a **gendered neglect** while women contribute significantly to MGNREGA's workforce, their care giving responsibilities are not institutionally supported. Awareness campaigns about gender-specific provisions are urgently required.

## 12. Overall Interpretation

The quantitative and qualitative findings together indicate that **Panchayats are pivotal yet paternalistic** in information dissemination. Women's participation is extensive but **passive and dependency-driven.** Transparency mechanisms such as RTI and Social Audit are *non-functional* at the grassroots, and awareness of rights is critically low.

While MGNREGA has successfully provided work opportunities and community assets, its **empowerment potential is under-realised** because awareness has not translated into autonomy or voice. True empowerment requires combining *economic participation with informational capability and collective agency*.

# FINDINGS

**Panchayats** are the most dominant and trusted sources of information about MGNREGA. **Gram Sabhas** mobilize the applicants effectively, yet women's participation remains passive. A majority of the respondents registered in 2008, showing early enthusiasm but limited comprehension of rights. Most of them applied on **plain paper** with Panchayat assistance, demonstrating low administrative literacy. All respondents received **Job Cards within 15 days,** though unaware of this entitlement.97.26 % obtained employment; none of those left without work received **unemployment allowance.** Women participated in **multiple work categories**, mainly connectivity and land development. **Awareness of RTI and Social Audit is zero,** exposing a complete transparency gap. **Worksite facilities** (water, shade, medical aid) exist but **crèche provision is absent**. **Awareness deficit** remains the main barrier to translating economic inclusion into social empowerment.

## Sociological Implication of the Study

The findings underscore that **information is power and fundamental requirement for survival**. Rural women's economic engagement under MGNREGA has not been matched by cognitive and institutional empowerment. Awareness mediated by education, gender norms and local

governance is the missing link that must be addressed through participatory training, social audits and inclusive Panchayat interventions.

## CONCLUSION

The Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA) was envisioned not merely as an employment programme but as a *rights-based social contract* aimed at promoting livelihood security, gender equity and participatory governance. The present study conducted among 401 rural married women in the Mashobra Block of Shimla District, Himachal Pradesh sought to assess women's awareness of the Act's guidelines, organizational structure and infrastructural provisions as well as women's level of participation and knowledge of transparency mechanisms such as the Right to Information (RTI) and Social Audit. The findings reveal that while MGNREGA has achieved significant success in terms of **coverage, timely job card issuance, and regular work opportunities** still **empowerment dimension remains weak**. Panchayats have emerged as the central channels of information and mobilization, yet this has fostered *dependency rather than autonomy*. Women's participation in the programme is extensive but largely

passive, shaped by economic necessity rather than informed awareness of rights or entitlements.

A critical observation is the **near-total absence of awareness** about RTI and Social Audit which is the two key instruments intended to ensure transparency and accountability. The lack of knowledge regarding unemployment allowance and worksite entitlements such as crèches further underscores the limited dissemination of information. While the programme has succeeded administratively, it falls short sociologically, as women remain beneficiaries rather than empowered citizens asserting their rights.

From a sociological view point, the findings highlight that **economic inclusion without informational empowerment** reinforces dependency rather than autonomy. True empowerment requires that women not only access work but also understand and exercise their rights within the programme's governance framework. Strengthening awareness, enhancing literacy and ensuring gender-sensitive implementation such as crèche facilities and active involvement in Gram Sabhas are essential for translating MGNREGA's rights-based promise into genuine social transformation.

## POLICY IMPLICATIONS

To enhance MGNREGA's transformative potential, policy efforts must move beyond wage provision toward **awareness-based empowerment**. Regular *Gram Sabha sensitization drives*, women-led *social audits*, and integration of *rights education* within Panchayat activities are important and crucial. The government should ensure gender-responsive infrastructure at worksites especially **crèche facilities and flexible work timings** to sustain women's participation. Strengthening collaboration between Panchayats, SHGs and local NGOs can further ensure that rural women become **active rights-holders** rather than passive beneficiaries, fostering accountability and inclusive development in the Himalayan context.

## REFERENCES

Abraham, B., & Nandy, D. (2020, March 27). *Does the NREGA work for the empowerment of women?* Feminism in India. https://feminisminindia.com/2020/03/27/nrega-work-empowerment-women/

Aggarwal, M. (2008). *Economic reforms, unemployment and poverty*. New Century Publications.

Ali, A. A., Shekhar, T. S., & Guroo, T. A. (2018). Women empowerment and gender equality under MGNREGA: A great revolution in rural life. *International Journal of Advance Research, Ideas and Innovations in Technology, 3*(3). https://www.ijarnd.com/manuscript/women-empowerment-and-gender-equality-under-mgnrega-a-great-revolution-in-rural-life/

Ali, H. M., & George, L. S. (2019). A qualitative analysis of the impact of Kudumbashree and MGNREGA on the lives of women belonging to a coastal community in Kerala. *Journal of Family Medicine and Primary Care, 8*(9), 2832–2836. https://doi.org/10.4103/jfmpc.jfmpc_672_19

Beauvoir, S. de. (1953). *The second sex*. Vintage Books.

Bose, M., & Roy, D. S. (2020, June 11). Four ways that MGNREGA can be expanded to help India's rural economy. *The Wire*. https://thewire.in/labour

Curry, A. (2019, October 15). *Policies and potentials for women empowerment in Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act*. Social Protection.org. https://socialprotection.org/discover/blog/policies-and-potentials-women-empowerment-mgnrega

Das, D. (2020). Empowerment of rural women through MGNREGA: A study of MGNREGA implementation in Barpeta Development Block of Barpeta District of Assam. *Journal of Critical Reviews, 7*(7), 334–339. https://doi.org/10.31838/jcr.07.07.54

Dheeraj, R. P. (2017). A critical analysis of the Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act (MGNREGA). *Global Journal of Interdisciplinary Social Sciences, 6*, 8–12.

Dreze, J. (2005). Employment guarantee: Promise and demise. *Yojana, 49*(11), 4–8.

Drèze, J., & Sen, A. (2013). *An uncertain glory: India and its contradictions*. Princeton University Press.

Duari, B. (2019). Implementation of Mahatma Gandhi National Rural Employment Guarantee Act on women empowerment: A case study of Purba Medinipur District, West Bengal. *International Journal of Research in Social Sciences, 9*(1).

Hirway, I. (2005). *Unpaid work and the economy: Gender, poverty and Millennium Development Goa*. Levy Economics Institute. https://www.levyinstitute.org/pubs/wp_838.pdf

Kaushal, S. L., & Singh, B. (2016). A study of women participation in MGNREGA in Himachal Pradesh. *Productivity, 56*, 382–391.

Kabeer, N. (1999). Resources, agency, achievements: Reflections on the measurement of women's empowerment. *Development and Change, 30*(3), 435–464.

Khera, R., & Nayak, N. (2009). Women workers and perceptions of the National Rural Employment Guarantee Act. *Economic and Political Weekly, 44*(43), 49–57. https://doi.org/10.2307/25663707

Minati, S. (2014). Impact of MGNREGA on women empowerment: A case study of Cuttack district in Odisha. *Journal of Organisation and Human Behaviour, 3*, 44–50.

Ministry of Rural Development, Government of India. (2008). *MGNREGA operational guidelines* (3rd ed.). Government of India. http://nrega.nic.in/guidelines.htm

Nussbaum, M. C. (2000). *Women and human development: The capabilities approach*. Cambridge University Press.

Puthenkalam, J. J., & George, M. K. (2012). *Human development strategy of MGNREGA*. Indian Social Institute/Rawat Publications.

PTI. (2020, March 27). Centre releases ₹4,431 crore to clear pending wages under MGNREGA. *The Economic Times*. https://economictimes.indiatimes.com/news/economy/finance/centre-releases-rs-4431-crore-to-clear-pending-wages-under-mgnrega/articleshow/74849430.cms

Ravindar, M. (2016). Empowerment of women through MGNREGS: A study in Warangal District of Telangana State. *International Journal of Multidisciplinary Research and Modern Education, 2*, 309–321.

Sen, A. (1999). *Development as freedom*. Oxford University Press.

Sharma, A. (2017). Gender, labour and empowerment: A study of MGNREGA in North India. *Indian Journal of Labour Economics, 60*(2), 287–304.

Srinivas, P., & Pandyaraj, K. (2018). MGNREGA and women empowerment: A study of Pannur village in Chittoor District of Andhra Pradesh, India.

*Journal of Agricultural Economics and Rural Development, 4*(3), 436–453.

Tomar, M. S., & Yadav, B. S. (2009). Need to sharpen NREGA. *Kurukshetra, 58*, 11–14.

***

[xxiii] Stuart Walton, *Out of it: A Cultural History of Intoxication*, London: Hamish Hamilton, 2001.P .7.

[xxiii] D.N Jha, ed., *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol Use in Ancient India* , New Delhi: Manohar, 2020.

[xxiii] James McHugh, *An Unholy Brew: Alcohol in Indian History and Religions,* New York: Oxford University press,2021.

[xxiii] Cited in Hassan B, *The Drink and Drug Evil in India*, Madras: Ganesh, 1922.

[xxiii] Peter Burke, What is cultural history?, United Kingdom: Wiley, 2008.

[xxiii] *Mānava-Dharmåsātra*, ed. and tr. Patrick Olivelle. New Delhi: Oxford University Press, 2005.11.91.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra* .9.80.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra* .11.93.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra*.11.212.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra.* 8.11.

[xxiii] Kane, history of Dharmasastras,vol 2 part 1,60.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra.* 5.50.

[xxiii] Karl Spracklen, *Constructing Leisure Historical and Philosophical Debates*, (New York, Palgrave Macmillan,2011. P.1-6.

[xxiii] Wendy Doniger & Sudhir Kakar, "Introduction" in *The Kāmasūtra of Vātsyāyana,* trans. Wendy Doniger and Sudhir Kakar, Oxford, Oxford University Press, 2002. P. xlix.

[xxiii] Shalini Shah, Love, Erotism and Female Sexuality in Classical Sanskrit Literature: Seventh -Thirteenth century New Delhi: Manohar,2009. Pp. 78-79.

[xxiii] *Kāmasūtra* of Vātsyāyana, ed. and tr. Wendy Doniger and Sudhir Kakar, New York: Oxford University Press, 2002. Book 1. 4. 22-24.

[xxiii] *K.S,* IV. 1. 35.
[xxiii] *K.S,* IV. 2 .36; IV,2.24.
[xxiii] *K.S,* III. 5-25.
[xxiii] *K.S,* VI.1.9.
[xxiii] *K.S,* VI. 1.12.
[xxiii] *Carakasaṁhitā* ed. and tr. P.V. Sharma, 2 vols., Varansasi: Chowkhamba, 1981-5. *Chikitsāsthāna*.24.66-67
[xxiii] Ibid. 61-63
[xxiii] Stanzas 1 and 2 of the Kadambarasvıkaranakarikamañjarı which is given in Kamakuñjalata , ed. P. Dhundirajsastrı, Varanasi: Chowlhamba Sanskrit Series Office, 1967,cited in James Mchugh, "Alcohol in pre-modern South Asia,".p. 38.
[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 1, *Bālkāṇḍa*, introduction and trans. Robert P. Goldman, Princeton: Princeton University Press, 1984. sarga 52,verse 1-2.
[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 7, *Uttarakāṇḍa*, Introduction, Translation and Annotation by Robert P. Goldman and Sally J. Sutherland Goldman, Princeton, Princeton University Press, 2017.sarga 41,11-15.
[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 5, *Sundarakāṇḍa,* Introduction, Translation and Annotation by Robert P. Goldman and Sally J. Sutherland Goldman, Princeton, Princeton University Press, 1976.sarga 22,verse 41.
[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* Vol. 4, *Kiṣkindhākāṇḍa,* introduction, translation and annotation by Rosalind Lefeber, ed. Robert P. Goldman, Princeton, Princeton University Press, 1984.sarga 24, verse 38.
[xxiii] *Mahābhārata*, *Khandava-daha Parva*,transated by Bibek Debroy, (New Delhi, Ppenguin Books,2010),216
[xxiii] *Aśvaghoṣa*, *Life of the Buddha*, trans. P. Olivelle, New York: New York University Press: J.J.C. Foundation, 2007, Canto 4, verse 25-30
[xxiii] Cited in Hadap, Nitin and Hadap, Shilpa. "Intoxicating Drinks and Drunkards in Ancient Indian Art, Literature and Archaeology." in *Food and Drink in Archaeology 3* Edited by Dave Collard, Jim Morris and Elisa Perego, Devon: Prospect Books, 2012.
[xxiii] *Raghuvańsam of Kālidāsa,* trans. A.N.D. Haksar. New Delhi: Penguin Books, 2016.*Raghuvańsam*,canto 4,verse 65.
[xxiii] Ibid. canto 18, verse 42.
[xxiii] Dhirendra Krishna Bose, Wine in Ancient India, Calcutta, London Library & Press,1922. pp.39
[xxiii] Martha L. Carter,Dionsyaic aspects of kushana art in *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol in Ancient India*, edited by D.N Jha, 251-273. New Delhi: Manohar, 2020.pp. 197-250.
[xxiii] Harry Falk, "Making Wine in Gandhara under Buddhist Monastic Supervision," *Bulletin of the Asia Institute*,vol. 26 (2009): 75
[xxiii] Cited in Bose, *Wine in Ancient India*, pp17
[xxiii] Lorenzen, David N. "A Parody of Kāpālikas in the Mattavilāsa" in *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol in Ancient India*, edited by D.N Jha. New Delhi: Manohar, 2020. pp.251-273.

[xxiii] CS. *Chikitsāsthāna.24.1.*
[xxiii] CS. *Chikitsāsthāna.24.26-28*

***

# Raj Darbhanga and the National Movement: Elite Power, Colonial Policy, and the Politics of Recognition

Dr. Ajeet Kumar
Associate professor Department of History
Kirori Mal College University of Delhi

## Abstract

Raj Darbhanga was one of the largest and most powerful zamindaris in colonial India, exercising immense economic and cultural influence across north Bihar. Yet, despite its scale, wealth, and aristocratic authority, the estate remained outside the fold of recognised princely states. This paper examines the role of Raj Darbhanga in the national movement, focusing on the shifting relationship between zamindari power, colonial governance, and Indian nationalism. Drawing upon estate records, administrative reports, and recent historiography, it traces how successive rulers of Darbhanga engaged in a politics of both collaboration and opposition. Their patronage of education, culture, and nationalist organisations complicates the conventional view of zamindars as collaborators. At the same time, the denial of princely status, despite Darbhanga's princely stature in practice, illustrates the colonial state's suspicion of estates that leaned towards nationalist politics. By situating Darbhanga within wider debates on feudalism, elite politics, and anti-colonial struggle, this paper argues for a more nuanced understanding of the role of landed elites in India's transition to independence.

**Keywords:** Raj Darbhanga, National Movement, Colonialism.

## Introduction

The history of zamindars in colonial India has often been narrated in terms of loyalty to the Raj. Large estates were seen as pillars of colonial authority, their wealth and prestige secured under the Permanent Settlement, and their political role largely one of collaboration. Yet such generalisations obscure important exceptions. Among them, the case of Raj Darbhanga stands out. One of the largest zamindaris in northern India, Darbhanga commanded immense landed wealth, patronised learning and culture, and exercised significant influence in colonial Bihar. At the same time, its rulers became associated with reformist politics, public causes, and strands of the national movement.

This paradox, that a great landed estate could simultaneously embody the privileges of colonial order and articulate elements of nationalist dissent, raises important questions about the nature of elite politics in late colonial India. Maharaja Lakshmishwar Singh, who inherited the estate after its management under the Court of Wards, became an important patron of education and a supporter of moderate nationalist organisations in the late nineteenth century. His successors continued to fund cultural and political initiatives, complicating the image of zamindars as mere collaborators.[xxiii]

Equally striking is the colonial state's attitude toward Raj Darbhanga. Despite its wealth and aristocratic stature, it was never accorded princely recognition, unlike smaller states with far less influence. This denial was not simply a matter of legal distinction between zamindari tenure and princely sovereignty. It also reflected the colonial government's unease with Darbhanga's association with reformist and nationalist causes, which made it an unreliable partner in the architecture of indirect rule.[xxiii]

By tracing the economic base, political engagements, and cultural patronage of Raj Darbhanga, this paper re-examines the role of zamindari elites in the national movement. Rather than reinforcing a binary of collaboration versus opposition, it shows how the estate occupied a liminal space, both indispensable to colonial governance and increasingly entangled with nationalist politics.

## The Economic and Cultural Power of Raj Darbhanga

The Darbhanga estate was among the most powerful landed properties in colonial India. By the mid-nineteenth century, it encompassed vast tracts

of north Bihar, with revenues rivalling those of recognised princely states. The Court of Wards' management from 1860, following the minority of Lakshmishwar Singh, not only stabilised the estate's finances but also consolidated its administrative machinery. By the 1870s, Darbhanga had emerged as a major political and economic force in the region.[xxiii]

The estate's influence, however, extended well beyond land and revenue. Darbhanga became a hub of cultural patronage. The Raj invested heavily in Sanskrit learning, established schools, and later supported institutions such as the Sanskrit College at Darbhanga and, eventually, the Darbhanga Sanskrit University.[xxiii] This patronage reinforced both a regional Maithili identity and a broader Hindu cultural revival. As Pankaj Jha has argued, the Raj's cultural investments functioned as a 'hegemonic project' that sought to bind the peasantry to elite authority through cultural legitimacy.[xxiii]

At the same time, Darbhanga's economic base underpinned its political importance. The estate's immense landholdings provided not only rents but also a network of dependent tenants and local officials whose allegiance enhanced the Maharaja's authority.[xxiii] Such influence enabled Darbhanga to intervene in both colonial and nationalist politics, making it indispensable to the political history of Bihar.

## Darbhanga and Colonial Governance

The relationship between Raj Darbhanga and the colonial state was mediated above all by the Court of Wards. Following the death of Maharaja Maheshwar Singh in 1860, the estate passed under the Court of Wards administration because his heir, Lakshmishwar Singh, was a minor. During this period, detailed reports recorded both the scale of indebtedness, which stood at seventy lakhs of rupees in 1860, and the subsequent recovery, with revenues reaching twenty lakhs annually by the mid-1870s.[xxiii] These reports, preserved in the *Proceedings of the Bengal Government* and cited in later estate histories, underscore the degree of bureaucratic oversight under which Darbhanga operated.

The Court of Wards management also illustrates the ambiguous status of the estate. On the one hand, its finances were stabilised and its authority reinforced through colonial supervision. On the other hand, such

supervision constrained the Maharaja's autonomy, binding the estate closely to the bureaucracy.[xxiii] As Jha notes, the Darbhanga rulers often clashed with officials over revenue collection, jurisdiction, and estate management, reflecting the tension between colonial control and landlord power.[xxiii]

This tension was visible in public controversies as well. For instance, when Maharaja Lakshmishwar Singh emerged as a patron of reformist causes in the 1880s, colonial officials privately expressed concern about his 'political reliability.' Reports in the *Bengal District Gazetteers* noted both his philanthropy and his political associations, a combination that marked him out as distinct from other zamindars.[xxiii]

Thus, while Darbhanga was indispensable to colonial administration in Bihar, its rulers occupied a liminal space: empowered by colonial law, yet treated with suspicion whenever they aligned with Indian nationalist politics.

## Raj Darbhanga and the National Movement

The stereotype of zamindars has often overshadowed the role of Raj Darbhanga in the Indian national movement as loyalists of the colonial state. Yet, from the late nineteenth century onward, the Darbhanga rulers demonstrated a strikingly different trajectory. The most prominent figure was Maharaja Lakshmishwar Singh (1858–1898), whose brief but influential reign symbolised a new kind of landlord politics: one that combined cultural patronage, philanthropy, and cautious but explicit support for nationalist causes.

Lakshmishwar Singh's political engagements must be situated against his personal background. Educated under the supervision of the Court of Wards, he inherited a financially stabilised estate in 1879. Unlike many of his contemporaries, however, he used his wealth for extensive public benefactions. He funded the establishment of schools, hospitals, and libraries, earning him recognition not only in Bihar but also in Bengal's intellectual circles.[xxiii] In 1888, the *Indian Mirror* described him as 'the most enlightened landlord in India,' a title reflecting his growing prominence in public life.[xxiii]

Equally significant was his association with the Indian National Congress and other reformist organisations. Lakshmishwar Singh contributed funds to the Indian Association and was an early supporter of Congress meetings in the late 1880s. His correspondence with Surendranath Banerjee and Anand Mohan Bose reveals a sympathy for moderate constitutional reforms, even as he remained careful not to openly antagonise the colonial government.[xxiii] During the famine of 1896–97, he provided large-scale relief to peasants, acts that were widely reported in the nationalist press as evidence of his alignment with public welfare rather than narrow zamindari interests.[xxiii]

Darbhanga's involvement did not end with Lakshmishwar Singh. His successors, particularly Maharaja Rameshwar Singh (1898–1929), continued this dual policy of cautious engagement with nationalist causes. Rameshwar Singh was a member of the Indian Legislative Council and, while maintaining loyalty to the Raj, often spoke in favour of reforms. His speeches in the Council reveal an insistence on the rights of Indian landlords to participate in governance, a position that implicitly aligned him with broader nationalist demands for Indian representation.[xxiii] By the 1920s, members of the Darbhanga family were active patrons of educational institutions that became important bases for nationalist mobilisation in north Bihar.[xxiii]

Beyond elite correspondence and legislative presence, archival newspapers and local reports document more concrete forms of Darbhanga's engagement with public politics, as well as the limits of the widespread embrace of that engagement. Contemporary Calcutta and Patna press coverage shows the Raj making repeated, public donations to nationalist causes and hosting delegations of reformers; for example, Maharaja Lakshmishwar Singh's recorded subsidies to the Indian Association and his public role in arranging provincial meetings were reported in the nationalist press of the 1880s and 1890s, giving visible form to elite support for constitutional reform.[xxiii] Primary newspapers also recorded the Raj's large-scale famine relief efforts during the 1896–97 crisis, an act that was viewed by many contemporaries as public-spirited nationalism rather than mere paternalism.[xxiii]

However, the Darbhanga story in the 1920s shows how elite patronage could generate contestation on the ground. P. K. Jha's archival study of the Non-Cooperation period documents local peasant agitation around Darbhanga: itinerant leaders (for example, the movement associated with Swami Vidyanand) mobilised tenant grievances against rental demands and estate punishments, and these protests sometimes framed the Raj as a target even while national politics sought a unified anti-colonial front.[xxiii] District-level reports and contemporary peasant press extracts preserved in provincial archives record instances where Darbhanga's police or estate agents intervened to suppress agitations, and other documents show negotiations in which the estate offered limited concessions to avert wider unrest.[xxiii]

These primary traces complicate the image of Darbhanga as simply a 'friend' of the national movement: to urban nationalists and cultural patrons, the Raj appeared as an ally and benefactor, but to many rural tenants, it remained a coercive landlord. This dual reception explains a crucial aspect of Darbhanga's political identity in the twentieth century , an estate that projected national and political influence through public benefaction and institutional patronage, while simultaneously being contested by social movements emerging from below.[xxiii]

Colonial officials, however, remained uneasy about this trajectory. A confidential report of the Bihar and Orissa Government in 1922 described the Darbhanga Raj as 'politically restless' and noted its 'encouragement of vernacular associations.'[xxiii] Unlike smaller zamindars who remained confined to agrarian dominance, Darbhanga positioned itself within the arena of public politics, thereby attracting suspicion.

At the grassroots level, the estate's role was more ambivalent. While nationalist leaders invoked Darbhanga's philanthropy, many tenants and peasants viewed the estate as an exploitative landlord. Peasant associations in the 1920s and 1930s often targeted the Raj in their protests, demanding rent reductions and relief.[xxiii] Thus, while Darbhanga enjoyed prestige among nationalist elites, it also faced contestation from below. This duality captures the complexity of zamindar politics in late colonial Bihar: both patrons of nationalist causes and objects of peasant resistance.

Under the reign of Maharajadhiraja Kameshwar Singh (1929–1962), the Raj Darbhanga entered its most explicitly political phase in relation to India's independence and constitutional transition. At the age of 22, Singh was elected President of the Bengal Landholders' Association in 1929, a position that connected him with a network of zamindari elites who were increasingly vocal in their views. He was invited to participate in the Round Table Conferences, thereby engaging directly with the British government's deliberations over India's political future.[xxiii] As a member of the Constituent Assembly from Bihar, Singh took a special interest in issues concerning zamindari rights and land reform. In assembly debates, he defended the need for just compensation for landlords affected by land reform legislation, arguing that agrarian justice must be balanced with the protection of vested property rights.[xxiii] Beyond legal-constitutional arenas, Singh's contributions also included educational and cultural patronage tied to nationalist identity: he donated Anand Bagh Palace and its grounds for establishing a state Sanskrit University; he supported vernacular literatures, particularly Maithili, and pursued inclusion of Maithili as a subject in universities, helping cultural nationalism in Mithila gain institutional recognition. Singh also made substantial philanthropic gestures to nationalist educational institutions beyond Bihar, such as contributions to Aligarh Muslim University in 1945, which were reported in contemporary press coverage as signaling his commitment to the broader nationalist movement.[xxiii] Through these actions, Kameshwar Singh combined the prerogatives of landed authority with modern political responsibilities; his leadership illustrates how powerful zamindars could adapt to changing nationalist pressures, negotiating legal status, public legitimacy, and the demands of constitutional politics.

Darbhanga Raj's involvement in the national movement was neither accidental nor peripheral. Through philanthropy, educational patronage, and cautious political interventions, it carved out a distinctive position for itself within the nationalist discourse. Yet, this very involvement also made it suspect in the eyes of colonial administrators, reinforcing its ambiguous status as a landlord estate that was too powerful to ignore but too unreliable to elevate to the rank of princely.

## The Question of Recognition and Denial of Princely Status

Despite its immense wealth and influence, Raj Darbhanga never attained recognition as a princely state under the British Indian system. This omission is striking, given that the estate's annual revenues and territorial expanse exceeded those of many minor princely states in the subcontinent.[xxiii] By the late nineteenth century, Darbhanga controlled tens of thousands of tenants, maintained quasi-bureaucratic institutions, and patronised cultural projects of regional and national significance.[xxiii]

Historians have debated the reasons for this denial. On one hand, colonial administrators consistently classified Darbhanga as a *zamindari* under the Permanent Settlement, thereby rendering it a landed estate rather than a sovereign polity.[xxiii] The administrative logic was that recognition of zamindaris as princely states would undermine the carefully constructed legal hierarchy of colonial property rights. On the other hand, archival evidence suggests that political factors also mattered. Darbhanga's visible sympathy with nationalist organizations, its support for educational institutions associated with Indian reformers, and its willingness to intervene in legislative debates raised suspicions about its loyalty.

Confidential correspondence in the India Office records reveals that as early as 1919, officials in London worried that granting princely recognition to Darbhanga would 'enhance the political pretensions of an estate already inclined to nationalist sympathies.'[xxiii] The fact that the estate's rulers, unlike many Rajput or Maratha princes, did not seek active military collaboration with the British further weakened their case.[xxiii]

Thus, the denial of princely status cannot be explained merely by administrative precedent. Rather, it reflected the colonial state's determination to restrict political recognition to landlords whose loyalty was unquestionable. In this sense, Darbhanga's ambiguous position, too powerful to ignore but too politically entangled to be trusted, became emblematic of the contradictions of colonial governance in Bihar.

## Conclusion: Raj Darbhanga and the Paradoxes of Colonial Power

The history of Raj Darbhanga illuminates the paradoxical position of India's great zamindaris within the colonial order. As one of the largest

estates in the subcontinent, Darbhanga commanded revenues and social authority that rivalled the princely states. It acted as a cultural patron, an economic powerhouse, and, unlike most landed estates, a visible participant in nationalist politics. Yet, despite its immense influence, it was denied princely recognition, confined legally to the category of a landed estate under the Permanent Settlement.

This paradox reflected the deeper contradictions of colonial governance. The British sought to stabilize their rule in Bihar through the zamindari system, which created a loyal class of intermediaries. Yet the very success of Darbhanga in mobilizing its resources for education, philanthropy, and political engagement rendered it an ambiguous ally. Its support for the Indian National Congress, its sponsorship of vernacular cultural revival, and its interventions in legislative debates meant that it could not be counted among the unquestioning collaborators that the Raj preferred. Colonial suspicion was therefore not incidental: it was structurally bound to the ways in which Darbhanga transcended the expected limits of a landlord estate.

The estate's role in the national movement further complicates the simplistic binary of 'feudal landlord versus nationalist elite.' Lakshmishwar Singh's philanthropy and Congress sympathies in the late nineteenth century, Rameshwar Singh's legislative interventions, and the continued patronage of nationalist-leaning educational institutions reveal a distinctive mode of elite politics. Darbhanga's rulers combined their feudal authority with modern forms of public engagement, seeking to anchor their legitimacy in both traditional patronage and emergent nationalist discourse. This duality explains why they were celebrated by sections of the nationalist press even as they were targeted by peasant mobilizations from below.

The denial of princely status is therefore best read not simply as a bureaucratic decision, but as a political judgment. By refusing to elevate Darbhanga, the colonial state drew a boundary between 'feudal collaborators' deserving recognition and 'politically unreliable landlords' to be contained within the zamindari framework. Darbhanga's fate thus underscores the degree to which colonial classifications of status were not neutral legal categories but politically charged strategies of control.

More broadly, the case of Raj Darbhanga invites us to rethink the role of landed elites in India's nationalist trajectory. The tendency to treat zamindars as uniformly reactionary obscures the diversity of their responses to colonialism and nationalism. In Darbhanga we find a landlord estate that not only exercised immense local dominance but also projected itself into the public sphere, shaping debates on education, famine relief, and constitutional reform. Its rulers may not have been radical nationalists, but their actions widened the field of nationalist politics and complicated the colonial state's efforts to draw neat lines between loyalty and resistance.

In conclusion, Raj Darbhanga demonstrates that the national movement was not only the preserve of professional politicians, urban middle classes, or militant peasants. It also drew in segments of the landed aristocracy, whose ambiguous position as both beneficiaries of colonialism and aspirants for wider legitimacy compelled them into nationalist spaces. Darbhanga's story is thus not a marginal footnote but a central episode in the social history of Indian nationalism, revealing how power, culture, and politics intersected in ways that unsettled both colonial classifications and nationalist orthodoxies.

## References:

[xxiii] Pankaj Kumar Jha, "Lakshmishwar Singh and the Indian National Congress," *Proceedings of the Indian History Congress* 66 (2005–2006): 1050–1060.; Bimanbehari Majumdar, "Contribution of the Darbhanga Raj Family to the National Movement in India," unpublished paper (PDF, Darbhanga Raj _ National Movement_text.pdf).

[xxiii] Stephen Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India: Darbhanga, 1860–1942* (Delhi: Oxford University Press, 1990), 112–18.

[xxiii] Stephen Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India: Darbhanga, 1860–1942* (Delhi: Oxford University Press, 1990), 41–68.

[xxiii] Bimanbehari Majumdar, "Contribution of the Darbhanga Raj Family to the National Movement in India," unpublished paper (Darbhanga Raj _ National Movement_text.pdf).

[xxiii] Pankaj Kumar Jha, "Feudalism from Above: The Culture of Sotipura and the Problem of Identity-Formation in Mithila," *Proceedings of the Indian History Congress* 67 (2006–2007): 574–578.

[xxiii] Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India*, 112–18.

[xxiii] *Proceedings of the Bengal Government, Revenue Department (Court of Wards), 1860–1875*, cited in Bimanbehari Majumdar, "Contribution of the Darbhanga Raj Family to the National Movement in India," unpublished paper (Darbhanga Raj _ National Movement_text.pdf).

[xxiii] Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India*,

[xxiii] Pankaj Kumar Jha, "'Court of Wards' in Tirhut: An Instrument of Colonialism," *Proceedings of the Indian History Congress*, 2009–2010, vol. 70 (2009–2010), 438–450.

[xxiii] *Bengal District Gazetteers: Muzaffarpur* (Calcutta: Bengal Secretariat Press, 1911), 214–20.

[xxiii] Bimanbehari Majumdar, "Contribution of the Darbhanga Raj Family to the National Movement in India," unpublished paper (Darbhanga Raj _ National Movement_text.pdf).
[xxiii] *Indian Mirror* (Calcutta), editorial, March 12, 1888.

[xxiii] Pankaj Kumar Jha, "Lakshmishwar Singh and the Indian National Congress," *Proceedings of the Indian History Congress* 66 (2005–2006): 1050–1060
[xxiii] "Relief in Bihar," *The Bengalee* (Calcutta), April 1897, cited in Rameshwar Prasad Mishra, *Indian National Movement and Bihar Zamindars* (New Delhi: Manohar, 2008), 142.
[xxiii] Maharaja Rameshwar Singh, Speech in the Imperial Legislative Council, *Proceedings of the Legislative Council of India*, February 1913, 212–15.
[xxiii] Pankaj Kumar Jha, "Economic Roots of Nationalism in Mithila," *Proceedings of the Indian History Congress*, 2000–2001, vol. 61, part one: Millennium (2000–2001), 888–893, https://www.jstor.org/stable/44148162.

[xxiii] *Indian Mirror* (Calcutta), editorial and reports on provincial meetings, March 1888.
[xxiii] "Relief in Bihar," *The Bengalee* (Calcutta), April 1897,
[xxiii] P. K. Jha, "Collaboration and Opposition :Darbhanga Raj's Response to the Non-Cooperation Movement (1920–22)," *Proceedings of the Indian History Congress*, vol. 60 (1999):690-700.
[xxiii] District and provincial reports on peasant unrest around Darbhanga, 1920–22, summarized in "Peasants' response towards Non-Cooperation" , which draws on local police reports and district gazetteer extracts. See also contemporaneous pamphlets preserved in Bihar archives cited in P. K. Jha Darbhanga Raj's Response to the Non-Cooperation Movement (1920–22)," *Proceedings of the Indian History Congress*, vol. 60 (1999).
[xxiii] Ibid
[xxiii] Bihar and Orissa Government, *Confidential Political Reports, 1922*, Bihar State Archives, Patna.

[xxiii] P. K. Jha, "Collaboration and Opposition :Darbhanga Raj's Response to the Non-Cooperation Movement (1920–22)," *Proceedings of the Indian History Congress*, vol. 60 (1999):690-700
[xxiii] *Constitution of India – Kameshwar Singh Profile*, Constitution of India website, accessed [today's date], https://www.constitutionofindia.net/members/kameshwar-singh
[xxiii] Ibid
[xxiii] AMU Professor Speaks On Darbhanga Raj At A Book Release In Patna," India Education Diary Bureau, October 5, 2023; Prof. Mohammad Sajjad, Department of History, Aligarh Muslim University.
[xxiii] Stephen Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India: Darbhanga, 1860–1942* (Delhi: Oxford University Press, 1990), 23–27.
[xxiii] Stephen Henningham, *Peasant Movements in Colonial India: North Bihar, 1917–1942* (Canberra: Australian National University Press, 1982), 21–24.
[xxiii] Permanent Settlement Regulations, 1793, cited in Ranajit Guha, *A Rule of Property for Bengal: An Essay on the Idea of Permanent Settlement* (Durham: Duke University Press, 1996), 141–44.
[xxiii] India Office Records, Political Department Confidential Correspondence, IOR/L/PS/10/273 (London: British Library), 1919.
[xxiii] Henningham, *A Great Estate and Its Landlords in Colonial India*.

***

# INTOXICATION AS SIN AND PLEASURE IN CLASSICAL SANSKRIT LITERATURE

**Sumit Kumar**
**Research Scholar**
**Department of History University of Delhi**

**Abstract:**
**This paper examines the complex and often contradictory representations of intoxication in classical Sanskrit literature, where drinking is situated simultaneously within the moral discourse of sin and the experiential domain of pleasure. Rather than treating intoxication merely as a pathological or ethical deviation, the study approaches it as a culturally embedded practice shaped by social hierarchy, ritual norms, leisure practices, and textual genres. Drawing upon a wide range of sources, Dharmaśāstras, Vedic and post-Vedic texts, the Kāma-sūtra, Ayurvedic literature, epics such as the Rāmāyaṇa and Mahābhārata, and classical kāvya, the paper highlights the plurality of attitudes towards alcohol and other intoxicants in ancient India. The analysis demonstrates that**

**normative texts, especially the Dharmaśāstras, largely frame intoxication as a moral transgression, closely linked to varṇa order, gender discipline, and social control. At the same time, literary, medical, and erotic texts present a more nuanced picture in which intoxication appears as a source of pleasure, sociability, aesthetic refinement, ritual efficacy, and even therapeutic benefit when consumed in moderation. The paper argues that this tension reflects a deeper discrepancy between prescriptive ideals and lived practices, suggesting the coexistence of multiple drinking cultures within the same society. By engaging with concepts such as plural culture, leisure, and the distinction between ritual, recreational, and excessive consumption, the study challenges any monolithic understanding of ancient Indian attitudes towards alcohol. Ultimately, the paper situates intoxication as a lens through which broader questions of morality, pleasure, social order, and cultural negotiation in classical Sanskrit literature can be critically understood.**

**Keywords:**
**Intoxication; Sanskrit Literature; Sin and Pleasure; Cultural History**

Intoxication is state of alteration of mind or consciousness through psychoactive substances (natural as well as synthetic).[xxiii] Even before advent of agriculture, almost all human cultures had discovered and used substances that altered the state of human consciousness. Intoxicants, which are psychoactive substances, are and have always been a part of every human culture. Because the effects of these substances have caused moral panic in many modern cultures, it has gained enormous popularity in some academic fields, particularly psychology and clinical studies. Nonetheless these disciplines have treated intoxication as a case of individual pathology ignoring the various historical and cultural forces that shape intake of intoxicants by human. The modern state has always used clinical studies in its favor to control and regulate people's life. Very few historical studies of pre-modern societies have been done in this field. There is a significant dearth of scholarship on the history of drunkenness in ancient India. It is only recently that some of the most thorough research on alcohol usage in ancient India has been brought to the forefront of

historical studies. Whether it's D. N. Jha's newly edited volume *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol Use in Ancient India*(2020)[xxiii] or James McHugh's *An Unholy Brew: Alcohol in Indian History and Religions* (2021).[xxiii] Prior to these books, there was no monograph devoted entirely to the history of intoxication in ancient India. However, we do have specific discussions on these subjects in which Soma takes centre stage, dating all the way back to the nineteenth century.

According to Max Mueller, there was no common root for wine or liquor in the Aryan languages, as a result, he concluded that the Aryans, "if not entirely unaware of the use of alcohol, surely used it sparingly" in their ancestral homelands. According to Mueller, however, drinking (liquors) became the Aryan race's greatest sin, second only to gambling.[xxiii] But should the discourse around intoxication be limited only in context of sin in ancient India. Sin and pleasure are very well connected. Pleasure is always in suspicion of becoming a sin. Both coexist simultaneously in same cultural framework. Peter Burke argument about the existence of sub-cultures or plural culture in a society is very important in this regard. He argues that cultures are interdependent on each other and exist in the same society. This argument can be extended to culture of drinking as there is no homogeneous culture but plural culture of drinking at any point of time.[xxiii] Another important issue to be considered is the question of discrepancies between discourse and practice i.e., discrepancy between the idealized version of life envisioned in normative texts and life as lived in practice.

Intoxication is depicted in a variety of ways in *Dharmaśāstra*. One way to look at it is as the process of social identity formation around intoxicating substances. *Surā*, an alcoholic beverage prepared from fermented grains or sugarcane, is one of the beverages described in the *Dharmaśāstra*s. *Surā*'s origins as an intoxicating alcoholic beverage may be traced all the way back to the *Ṛgveda*, where it is contrasted with *Soma*, a drink enjoyed primarily by Brahmins. According to the *Ṛgveda*, *Surā* was consumed by the other three *Varna*, namely *Kṣhatriyas*, vaisyas, and *Śūdra*. In later vedic literature, Brahmins are permitted to take *surā* only once, following the *Sautrāmaṇi* ceremony. *Surā* appears to have been a

generic name for all types of alcoholic beverages in the later Vedic period. Even in *Kauṭilya's Arthaśâtra*, the superintendent of all sorts of liquor is referred to as *surādhayksha*. However, the *surā*'s use in *Dharmaśāstric* literature has shifted dramatically. To begin, it was not used as a generic term for all alcoholic beverages, and to further confine its use to *Śūdra*. *Surā* was not permitted to the upper three *varnas* called as *dvija* (twice born). The manufacture, sale, or consumption of *surā* by *dvija* or twice born men was classified as *Mahapātaka* (great sin).[xxiii] Intoxication was strongly denounced in the case of women. Manu presents a variety of grounds for replacing a wife: 'A wife who consumes alcohol, is dishonest, or is rebellious, unwell, violent, or frivolous with money may be replaced at any moment.[xxiii] However, emphasis was placed on the fact that the conduct was committed purposefully or not. If the act of drinking was deliberate or habitual, punitive measures such as drinking hot cow urine till death or drinking hot liquor until death are advised.[xxiii] However, if the deed was inadvertent, it could be expiated via appropriate *Prāyaścitta* (penance).[xxiii] Similarly, these writings place a premium on whether an act was committed in secret or in public. Secret acts of crime were prescribed secret penances to atone for the transgression that were not excessively severe. And openly committed crimes were punished with public penance, which were extremely severe and were prescribed by an assembly of knowledgeable Brahmins (*parsad)*.[xxiii] This demonstrates the Brahmin community's fear of publicly breaching a law. Even *Śūdras* who abstained from drinking were dignified. A phrase that appears in later *Smṛtis* is *saccsudra*, which Kane translates as well-behaved *Śūdra* who served *dvija*s and had abstained from meat consumption, drinking, and selling liquor.[xxiii]

One of the verses from the *Mānava Dharmaśāstra* demonstrates how Manu admits the propriety of liquor consumption while demonstrating that moral superiority is demonstrated by abstaining from it. The stanza reads as follows: "There is no wrong in eating meat, drinking liquor, or having sex; these are all natural behaviors of creatures." However, abstaining from such action reaps enormous rewards."[xxiii] This verse is strange because a scripture that states that people have inborn proclivities, or (*svabhava)*, according to the *varna* into which they are born is alluding

to a natural tendency or prakriti that is shared by all beings. This demonstrates unequivocally that their literature served as a model for religious law, not as the law itself.

Jurgen Habermas argues that leisure behaviours can help us understand the conflicting pressures of instrumental control and individual will.[xxiii] The question of will or conscience in context of leisure remains a valid issue even in ancient times. One cannot consider every act of consumption as a pleasurable experience. The use of intoxicants in a ritual is very different from recreation, which is again very different from excessive consumption or alcoholism. The *nágaraka* in the *Kāma-sūtra* seems to be ideal for this analysis of pleasurable experience.

*Yashodhara's Jayamangala* a commentary on *Vātsyāyana Kāma-sūtra* states that The two types of sexual activity are primary and secondary. Female bodies form its foundation with wine, ornaments and other decorative items as its auxiliary limbs.[xxiii] The god of erotic love *kāma-deva* is called *madana* (intoxicator) in the *Purāṇic* literature.[xxiii] The *Kāma-sūtra* deals with duties daily routine of a (*nágaraka*) man about town; some are his daily duties, and some his occasional duties. *nágaraka*, is defined as one who lives in a city who has finished his education, and follows a profession, or has some independent means of livelihood. Among his daily duties, wine finds no place, but we find among his occasional duties, he indulged sometime with his friends in drinking. The drinking party, met in each other's houses or gardens. They drank various kinds of alcoholic liquor viz., *Madhvi*, *Maireya Surā*, *Āsava*; etc. These wines, were mixed with various kinds of salts, fruits, vegetables and condiments of bitter, hot, sour tastes, offering these to one another.[xxiii] In the gardens, in addition to drinking, they indulged in various kinds of games, such as cock or ram fight or gambling, or game of chance. Often they drank wine freely. They enjoyed life fully, of course in their own way, is evident from the 11 different kinds of games mentioned here. *Vātsyāyana* a deals exhaustively about this too. In book IV we find a chapter on the duties of a wife. We see the daily routine of a faithful wife, from early dawn to late in the night, how she took care of the household,

her behaviour towards her elders, her equals, what she should avoid, her toilette, her dress and her duties in the kitchen . Among the duties we find, preserving of pots of *Surā* and *Āsava* and their proper use, She is responsible for the stocking and usage of pots of wines and liquors, as well as for their sale and purchase, and she keeps account of their revenue and spending. Probably these liquors were intended for the occasional festivities as mentioned before.[xxiii] But there is no evidence in this book that the wife used wine, but the mistress or second-hand wife did, with the assistance of her relatives, she convinces the man to contribute sufficient money to meet the costs of drinking parties, picnics, religious offerings, and gifts to honour friends.[xxiii] There is mention of liquor, used to intoxicate virgins, and then get them married against their will; her foster-sister gives her an intoxicating drink and, on the pretext of something that she herself has to do, brings her to the man in an accessible place. There, when the drink has made her unconscious, he takes her maidenhead[xxiii] also, courtesans sought the help of wine-sellers for their profession.[xxiii] Among the qualifications of an accomplished person, we find among other, he must not be addicted to drink and this was one of the qualities of a proper lover.[xxiii]

The *Caraka Saṃhitā* also highlights some pleasurable effects of wine when wine is utilised appropriately, it provides a resting place for those who are suffering from great sorrow and sadness.[xxiii] It also goes into detail on how the drinking session is set up. If you've taken care of your body (both externally and internally), you're pure, perfumed, wearing clean clothes that are powerfully fragrant according to season, wearing a variety of appealing garlands and jewellery, having worshipped gods and brahmanas, and having touched good auspicious tiles. If you're going to worship the gods, chant blessing hymns and pour wine on the gods, then you should always consume the best wine you can get along with a variety of tasty fruits, healthy green vegetables, salted, and seasoned seasonal food items. based on what Caraka says When wine is taken in moderation, it promotes feelings of euphoria, vigour, contentment, corpulence, health, and power of sexual desire. It goes on to say that Wine improves taste and appetite, is cordial, helps with voice and complexion, is saturating, bulk-promoting,

strength-promoting, and relieves fear, sadness, and exertion. It also says that Wine is hypnotic for the sleepless, elevates the voice of the dumb, awakens those who oversleep, and eliminates constipation in those who suffer from it.[xxiii] Stimulating beverage promotes happiness and increases virility (*pauruṣam*) alcohol plays a significant role: sensual pleasure and erotica. One Sanskrit text on drinking and erotica begins: 'The nectar-like fluid extracted from grapes. It is known as *kadambara*, and it stimulates the penis. It is also incredibly beneficial to the arts [found] in erotica works, it is appropriate for stimulating Mara [that is to say, *kāma*, the god of love], and eminently bestows talent.'[xxiii]

In *Rāmāyana* too we find evidence of alcoholic consumption as a source of pleasure . We see the great hermits and sage, Vasiṣṭha honouring Viśvā-mitra, with many kinds of foods and alcoholic drinks. Sabala, the wish-fulfilling cow, produced as much as anyone desired.. "She produced sugar cane and sweets, as well as dried grain and wines "outstanding liquors, expensive beverages, and a wide variety of meals.[xxiii] Rāma momentarily withdraws from public life at the court in order to pursue more personal interests. In the backdrop of *Uttarakāṇḍa* , the image is particularly remarkable. Rāma is now enjoying the pleasures of wedded life. With its intricate design description of the *aśoka* grove, wine, and dancing women.[xxiii] We locate a lengthy description of the *Rākṣasa*' drinking garden and select a few passages—"Here golden jars, there crystal and ruby goblets full of wine, females are laying dishevelled by wine."[xxiii] In one section when drinking is condemned in the book which echoes *Dharmaśāstra* position , Lakṣmaṇa admonishes Sugrīva, the monkey king, as follows: "Those who are inebriated should not partake in it.In search of religion(or duty greater than wealth) or love for all of these are destroyed by alcohol" [xxiii] Almost all the chief characters in the *Mahābhārata* were addicted to strong drinks. Ladies of high families too consumed intoxicating bevrages.it mentions about a pleasure ground where both Subhadrā and Draupadī lose their senses and gave their expensive ornaments to other womens. This place was filled up with beautiful music, drums and flute.[xxiii]

Drinking intoxicants, an activity connected with sensual pleasure and leisure sociability is also mentioned in literary and artistic literature. For example, in the *Buddhacharita*, an early lyrical work by *Aśvaghoṣa* recounting the Buddha's life, there is a scene in which the Buddha visits a pleasure garden. His father thinks that the sensual dalliances of the women in that location would distract him from his newfound awareness of old age, disease, and death. The women in the pleasure garden are inebriated, flirtatious, and perplexed.[xxiii] Kālidāsa too described the drinking of wine by women in his poems, suggesting that intoxication lends them a special charm for instance in his play *Mālavikāgnimitram* Queen Irāvatī comes to see the King having drunk wine, which was believed to give her added beauty.[xxiii] In the *Raghuvańsam* to the soldiers are relieved from the fatigue of victory through the use of wine.[xxiii] In the same text the youth of king sudarṣana is described as "Thereafter, he entered youth, the age of luxury and pleasure, a wine enjoyable with women, a flower on the tree of passion which does bud and bloom with love, and the whole body pervades.*"[xxiii]*

All Greek historians mention Dionysus, their wine God, visiting India at some point in the past. He subdued the people, constructed towns, and established rules for them. He introduced wine to the Indians, as he had done to the Greeks, and taught them how to sow the soil. He provided the seeds. He began by yoking the oxen to the plough. According to Magasthenes, "Men of great learning among the Indians inform us that in the farthest reaches of the country, Dionysus visited India during the remote time period ".[xxiii] This has been supported by the studies of Martha L Carter on *Dinosyaic* aspects of *Kuṣāṇa* art.[xxiii] This can be particularly seen in north-western part of the subcontinent. Harry Falk has shown its impact on Buddhist monastaries of that regionand has also argued that the consumption of young wine was associated with the adoration of *Pāñcika* and *Hārītī*, which is present asstatues inside the monastery, which were displayed As well as drinking or holding a grape. Almost all panellists from the wine-making or wine-drinking industries. There is also one moment in which a man approaches a woman in a sensual mood the age-old and non-Buddhist wine-making celebration was so appealing that Buddhists took over the

organisation monasteries. Buddhist communities further east, like Sanghol and Mathura, also embraced it.[xxiii]

There are numerous examples of alcoholism in the Sanskrit literature.one of the most famous one is from *Mahābhārata*. The legendary tribe of *Yadavas* was so hooked to alcohol that their chief had to declare that anyone producing wine within the city shall face the death penalty. However, the precaution did not save them, and the entire tribe was decimated by a family feud sparked by drinking. This resulted in the deaths of approximately 500,000 *Yadavas*. [xxiii]Similarly, in the *Mattavilasa* of Someśvara we see the Kāpālika was out of his senses due to intoxication.[xxiii] It seems that the issue of alcoholism was taken seriously both by dharma literature as well as *ayurvedic* literature from a physiological point of view. While the dharma texts characterized it as a kind of sin, the *ayurvedic* treaties dealt it with it from a practical scientific approach.

The 24th chapter from *Chikitsāsthāna* of *Caraka Saṃhitā* consist a detailed discussion on alcoholism and its cure. The term used for alcoholism is *madatyaya.*[xxiii] It talks about both merits and demerits of drinking which depends upon time and quantity of drinking.

> Wine made of many ingredients possessed of many properties and actions and characterised by intoxication has both merits and demerits. It is like nectar for that who drinks according to prescribed method, in proper quantity, in proper time, with wholesome food, according to strength and with exhilaration. On the contrary, it acts like poison for that who indulges in drinking unwholesome wine whatever is presented obseiving rough regimens and physical exertion constantly.[xxiii]

These Classical Sanskrit texts demonstrate a variety of intoxicating tendencies. While some texts, such as the *Dharmaśāstras*, emphasise complete abstinence, others, such as the *Rāmāyana* and *Mahābhārata*, are ambivalent about intoxication. On the other hand, some texts, such as *Arhtśāstra* the and the *Caraka-Saṃhitā*, can be considered semi-

permissive (allowable with certain conditions) when it comes to the consumption of alcoholic beverages.

## NOTES AND REFERENCES:

[xxiii] Stuart Walton, *Out of it: A Cultural History of Intoxication*, London: Hamish Hamilton, 2001.P .7.

[xxiii] D.N Jha, ed., *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol Use in Ancient India* , New Delhi: Manohar, 2020.

[xxiii] James McHugh, *An Unholy Brew: Alcohol in Indian History and Religions,* New York: Oxford University press,2021.

[xxiii] Cited in Hassan B, *The Drink and Drug Evil in India*, Madras: Ganesh, 1922.

[xxiii] Peter Burke, What is cultural history?, United Kingdom: Wiley, 2008.

[xxiii] *Mānava-Dharmåsātra*, ed. and tr. Patrick Olivelle. New Delhi: Oxford University Press, 2005.11.91.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra* .9.80.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra* .11.93.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra*.11.212.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra.* 8.11.

[xxiii] Kane, history of Dharmasastras,vol 2 part 1,60.

[xxiii] *Mānava Dharmaśāstra.* 5.50.

[xxiii] Karl Spracklen*, Constructing Leisure Historical and Philosophical Debates*, (New York, Palgrave Macmillan,2011. P.1-6.

[xxiii] Wendy Doniger & Sudhir Kakar, "Introduction" in *The Kāmasūtra of Vātsyāyana,* trans. Wendy Doniger and Sudhir Kakar, Oxford, Oxford University Press, 2002. P. xlix.

[xxiii] Shalini Shah, Love, Erotism and Female Sexuality in Classical Sanskrit Literature: Seventh -Thirteenth century New Delhi: Manohar,2009. Pp. 78-79.

[xxiii] *Kāmasūtra* of Vātsyāyana, ed. and tr. Wendy Doniger and Sudhir Kakar, New York: Oxford University Press, 2002. Book I. 4. 22-24

[xxiii] *K.S,* IV. 1. 35.

[xxiii] *K.S,* IV. 2 .36; IV,2.24.

[xxiii] *K.S,* III. 5-25.

[xxiii] *K.S,* VI.1.9.

[xxiii] *K.S,* VI. 1.12.

[xxiii] *Carakasaṁhitā* ed. and tr. P.V. Sharma, 2 vols., Varansasi: Chowkhamba, 1981-5. *Chikitsāsthāna*.24.66-67

[xxiii] Ibid. 61-63

[xxiii] Stanzas 1 and 2 of the Kadambarasvıkaranakarikamañjarı which is given in Kamakuñjalata , ed. P. Dhundirajsastrı, Varanasi: Chowlhamba Sanskrit Series Office, 1967,cited in James Mchugh, "Alcohol in pre-modern South Asia," p. 38.

[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 1, *Bālkāṇḍa*, introduction and trans. Robert P. Goldman, Princeton: Princeton University Press, 1984. sarga 52,verse 1-2.

[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 7, *Uttarakāṇḍa*, Introduction, Translation and Annotation by Robert P. Goldman and Sally J. Sutherland Goldman, Princeton, Princeton University Press, 2017.sarga 41,11-15.

[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* vol. 5, *Sundarakāṇḍa,* Introduction, Translation and Annotation by Robert P. Goldman and Sally J. Sutherland Goldman, Princeton, Princeton University Press, 1976.sarga 22,verse 41.

[xxiii] *Rāmāyana of Vālmīki,* Vol. 4, *Kiṣkindhākāṇḍa,* introduction, translation and annotation by Rosalind Lefeber, ed. Robert P. Goldman, Princeton, Princeton University Press, 1984.sarga 24, verse 38.

[xxiii] *Mahābhārata*, *Khandava-daha Parva*,transated by Bibek Debroy, (New Delhi, Ppenguin Books,2010),216

[xxiii] *Aśvaghoṣa*, *Life of the Buddha*, trans. P. Olivelle, New York: New York University Press: J.J.C. Foundation, 2007, Canto 4, verse 25-30

[xxiii] Cited in Hadap, Nitin and Hadap, Shilpa. "Intoxicating Drinks and Drunkards in Ancient Indian Art, Literature and Archaeology." in *Food and Drink in Archaeology 3* Edited by Dave Collard, Jim Morris and Elisa Perego, Devon: Prospect Books, 2012.

[xxiii] *Raghuvaṅsam of Kālidāsa,* trans. A.N.D. Haksar. New Delhi: Penguin Books, 2016.*Raghuvaṅsam*,canto 4,verse 65.

[xxiii] Ibid. canto 18, verse 42.

[xxiii] Dhirendra Krishna Bose, Wine in Ancient India, Calcutta, London Library & Press,1922. pp.39

[xxiii] Martha L. Carter,Dionsyaic aspects of kushana art in *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol in Ancient India*, edited by D.N Jha, 251-273. New Delhi: Manohar, 2020.pp. 197-250.

[xxiii] Harry Falk, "Making Wine in Gandhara under Buddhist Monastic Supervision," *Bulletin of the Asia Institute*,vol. 26 (2009): 75

[xxiii] Cited in Bose, *Wine in Ancient India*, pp17

[xxiii] Lorenzen, David N. "A Parody of Kāpālikas in the Mattavilāsa" in *Drink of Immortality: Essays on Distillation and Alcohol in Ancient India*, edited by D.N Jha. New Delhi: Manohar, 2020. pp.251-273.

[xxiii] CS. *Chikitsāsthāna.24.1.*

[xxiii] CS. *Chikitsāsthāna.24.26-28.*

***

# आज़ाद हिन्द फौज (आई.एन.ए.) और सुभाष चंद्र बोस

अजय कुमार

**दीनदयाल उपाध्याय अध्ययन केंद्र, हिमाचल प्रदेश केंद्रीय विश्वविद्यालय, धर्मशाला)**

**सरांश - द्वितीय विश्व युद्ध के दौरान भारत को ब्रिटिश साम्राज्यवादी गुलामी से मुक्त कराने हेतु 'आजाद हिन्द फौज' द्वारा किया गया सैन्य अभियान निः सन्देह साहसिक कदम था। भारतीय राष्ट्रीय सेना (INA) का गठन, जापानी सरकार का सहयोग और इसके असफल होने आदि बिन्दुओ पर केंद्रित यह संक्षेप लेख 'आज़ाद हिन्द फौज' के इतिहास और सुभाष चन्द्र बोस के नेतृत्व आदि का आकलन करेगा। खासकर इसकी असफलता मे कांग्रेस पार्टी की असहयोग की भूमिका को उजागर किया जाऐगा।**

**परिचय**

आजाद हिंद फौज, जिसे Indian National Army (INA) के नाम से भी जाना जाता है, ने ब्रिटिश शासन से भारत कि आज़ादी के लिए संघर्ष में एक महत्वपूर्ण और प्रेरक भूमिका निभाई। द्वितीय विश्व युद्ध के उथल-पुथल भरे दौर में गठित, आजाद हिंद फौज में मुख्य रूप से वे भारतीय सैनिक शामिल थे, जो दक्षिण-पूर्व एशिया में अंग्रेजों के लिए लड़ रहे थे और बाद में जापानी सेना द्वारा युद्ध बंदी बना लिए गए थे। ये भारतीय सैनिक, जो पहले ब्रिटिश साम्राज्य के अधीन सेवा कर रहे थे, उन्हें लड़ने का एक नया अवसर दिया गया - औपनिवेशिक स्वामियों के लिए नहीं, बल्कि अपने देश की स्वतंत्रता के लिए। आजाद हिंद फौज "इंडियन इंडिपेंडेंस लीग" (Indian Independence League) से उभरा, जिसका गठन टोक्यो समझौते के तहत मेजर फुजिवारा, एक जापानी सैन्य अधिकारी और कैप्टन मोहन सिंह, जो भारतीय युद्धबंदियों का प्रतिनिधित्व करते थे, के बीच हुआ था। इस संगठन का उद्देश्य सशस्त्र प्रतिरोध के माध्यम से भारत को ब्रिटिश शासन से मुक्त कराना था, इसके सदस्य एक स्वतंत्र और स्वतंत्र भारत के दृष्टिकोण से प्रेरित थे।

सुभाष चंद्र बोस के नेतृत्व में, आई.एन.ए. ने ब्रिटिश सेनाओं के खिलाफ एक सैन्य अभियान शुरू किया, जिसमें महत्वपूर्ण लड़ाइयाँ लड़ी गईं, जो कि उनकी अंतिम सैन्य विफलता के बावजूद, भारत की स्वतंत्रता के लिए बहादुर प्रतिरोध और बलिदान के प्रतीक के रूप में याद की जाती हैं। आज़ाद हिंद फ़ौज की विरासत और भारतीय स्वतंत्रता के लिए इसकी लड़ाई, औपनिवेशिक शासन के खिलाफ भारत के संघर्ष के इतिहास में एक गौरवपूर्ण अध्याय बनी हुई है।

**आई.एन.ए. की स्थापना** - आई.एन.ए की स्थापना द्वितीय विश्व युद्ध के दौरान हुई थी, जब जापानी सेना ने दक्षिण-पूर्व एशिया में आगे बढ़ते हुए इस क्षेत्र में ब्रिटिश, डच और फ्रांसीसी औपनिवेशिक शक्तियों को कुशलतापूर्वक उखाड़ फेंका था। तब जापानी सेना ने ब्रिटिश भारतीय सेना में सेवारत बड़ी संख्या में भारतीय सैनिकों को पकड़ लिया, तो उन्होंने इन युद्धबंदियों को ब्रिटिश शासन से भारत को आज़ाद कराने के उद्देश्य से एक आंदोलन में भर्ती करने का अवसर देखा। जापानी सरकार की ओर से, मेजर फुजिवारा (जिसे मेजर मुजी के नाम से भी जाना जाता है) ने भारतीय युद्धबंदियों से एक प्रस्ताव के साथ संपर्क किया: जापानी सेना के साथ भाड़े के सैनिकों के रूप में नहीं, बल्कि भारत की स्वतंत्रता के लिए लड़ना। इस पहल ने इंडियन इंडिपेंडेंस लीग के गठन को जन्म दिया, एक संगठन जिसकी अवधारणा शुरू में रास बिहारी बोस द्वारा की गई थी, जो एक लंबे समय से भारतीय क्रांतिकारी थे, जो सालों पहले जापान चले गए थे।[xxiii] लीग को कैप्टन मोहन सिंह से सहयोग मिला, जो पकड़े गए भारतीय सैनिकों में एक प्रमुख नेता थे, और निरंजन सिंह गिल, आंदोलन में एक और प्रभावशाली व्यक्ति थे।

आज़ाद हिंद फ़ौज की पहली डिवीज़न की औपचारिक स्थापना 1 दिसंबर 1942 को कैप्टन मोहन सिंह के नेतृत्व में की गई थी। इस डिवीज़न में 16,000 से ज़्यादा सैनिक स्वेच्छा से आई.एन.ए में भर्ती हुए थे, यह संख्या आंदोलन के ज़ोर पकड़ने के साथ-साथ काफ़ी बढ़ गई। इस शुरुआती चरण के अंत तक, आई.एन.ए में 60 ,000 भारतीय युद्ध बंदी शामिल हो गए थे, जो अपनी मातृभूमि की मुक्ति के लिए अंग्रेजों के खिलाफ़ हथियार उठाने को तैयार थे। आई.एन.ए के विकास का दूसरा और ज़्यादा महत्वपूर्ण चरण जुलाई 1943 में सिंगापुर में सुभाष चंद्र बोस के आगमन के साथ शुरू हुआ। बोस, जो 1941 से जर्मनी के बर्लिन में "फ्री इंडिया सेंटर" का नेतृत्व कर रहे थे, ने द्वितीय विश्व युद्ध के दौरान जर्मनी के रूस पर हमले के बाद अपने प्रयासों को दक्षिण-पूर्व एशिया में स्थानांतरित करने का अवसर देखा।[xxiii] यह समझते हुए कि जापानी सेनाएँ इस क्षेत्र में उपनिवेश-विरोधी आंदोलनों का सक्रिय रूप से समर्थन कर रही थीं, बोस ने स्थानांतरित होने का रणनीतिक निर्णय लिया। सिंगापुर पहुंचने पर, बोस ने इंडियन इंडिपेंडेंस लीग और

आज़ाद हिंद फ़ौज दोनों का नेतृत्व संभाला और उन्हें एक शक्तिशाली सैन्य और राजनीतिक संगठन में एकीकृत किया। उनके नेतृत्व  मे आज़ाद हिंद फ़ौज का पुनर्गठन किया गया और इसने भारतीय स्वतंत्रता की लड़ाई के लिए अधिक संगठित, गतिशील दृष्टिकोण अपनाया। नेताजी सुभाष चंद्र बोस के नेतृत्व में इस नए चरण में आई.एन.ए  को व्यापक मान्यता मिली और भारतीय स्वतंत्रता संग्राम में एक प्रमुख शक्ति के रूप में इसकी स्थिति मजबूत हुई।

**सुभाष चंद्र बोस का जीवन परिचय**

सुभाष चंद्र बोस भारतीय स्वतंत्रता संग्राम के सबसे प्रमुख और गतिशील नेताओं में से एक थे, जो अपनी अटूट देशभक्ति और भारत को ब्रिटिश शासन से मुक्त कराने के दृढ़ संकल्प के लिए जाने जाते थे। उनका जन्म 23 जनवरी, 1897 को उड़ीसा के कटक शहर में हुआ था। उनकी प्रारंभिक शिक्षा कटक के रेवेनशॉ कॉलेजिएट स्कूल में हुई, जिसके बाद उन्होंने कलकत्ता के प्रेसीडेंसी कॉलेज में दाखिला लिया और बाद में इंग्लैंड के कैम्ब्रिज विश्वविद्यालय में उच्च शिक्षा प्राप्त की।[xxiii] बोस एक असाधारण छात्र थे और उन्होंने 1920 में प्रतिष्ठित भारतीय सिविल सेवा (ICS) परीक्षा उत्तीर्ण करके अपनी शैक्षणिक योग्यता साबित की, जिसमें उन्होंने चौथा स्थान प्राप्त किया। हालाँकि, उनका दिल ब्रिटिश सरकार की सेवा करने में नहीं था। अप्रैल 1921 में, बढ़ते राष्ट्रवादी जोश और महात्मा गांधी के नेतृत्व से प्रेरित होकर, बोस ने भारतीय सिविल सेवा से इस्तीफा दे दिया और स्वतंत्रता संग्राम में कूद पड़े। उस समय, भारत असहयोग आंदोलन के बीच में था, जो ब्रिटिश वस्तुओं, संस्थानों का बहिष्कार करने और आत्मनिर्भरता को बढ़ावा देने के उद्देश्य से एक विशाल राष्ट्रव्यापी अभियान था। इस आंदोलन ने पूरे देश में स्वतंत्रता की भावना को जगाया और सुभाष चंद्र बोस पर इसका गहरा प्रभाव पड़ा।

आंदोलन के कारण बढ़ती अशांति का सामना कर रही ब्रिटिश सरकार ने 1919 में सेक्रेटरी ऑफ इण्डिया, मोंटेग्यू-चेम्सफोर्ड (वाइसराय) द्वारा संस्तुत संवैधानिक सुधारों को लागू करके असंतोष को दबाने का प्रयास किया, जिसमें सीमित स्वशासन का वादा किया गया था। हालाँकि, भारतीय नेता इन आधे-अधूरे उपायों से बहुत असंतुष्ट थे। नवंबर 1921 में, जब प्रिंस ऑफ वेल्स भारत आए, तो भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस ने उनके आगमन का विरोध करने के लिए पूर्ण हड़ताल का आह्वान किया। इस आह्वान के जवाब में कलकत्ता, अन्य भारतीय शहरों की तरह, बड़े पैमाने पर हड़ताल का गवाह बना। उस समय, कलकत्ता में कांग्रेस कमेटी के अध्यक्ष चित्तरंजन दास थे, जो एक प्रमुख स्वतंत्रता सेनानी और सुभाष चंद्र बोस के गुरु थे। दास ने कलकत्ता में आंदोलन को संगठित करने की जिम्मेदारी बोस को सौंपी और उनके नेतृत्व में आंदोलन ने महत्वपूर्ण गति पकड़ी।[xxiii] दिसंबर 1921 में, देशबंधु चित्तरंजन दास और सुभाष चंद्र बोस, कई अन्य नेताओं के साथ, ब्रिटिश विरोधी गतिविधियों में शामिल होने के आरोप में गिरफ्तार किए गए। बोस को छह महीने के कारावास की सजा सुनाई गई, जिसके साथ ही भारतीय स्वतंत्रता संग्राम के साथ उनके लम्बे जुड़ाव की शुरुआत हुई।

सुभाष चंद्र बोस भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस के नेताओ  में लगातार आगे बढ़ते रहे। वे पार्टी के भीतर युवा और वामपंथी गुटों की एक प्रमुख आवाज़ बन गए। पंडित मोतीलाल नेहरू की अध्यक्षता में कलकत्ता में आयोजित कांग्रेस के 1928 के वार्षिक अधिवेशन में, बोस इन समूहों के एक प्रमुख प्रवक्ता के रूप में उभरे, जिन्होंने स्वतंत्रता प्राप्त करने के लिए अधिक कट्टरपंथी और तत्काल कार्रवाई की वकालत की। अगले वर्ष, 31 दिसम्बर 1929 में, जब जवाहरलाल नेहरू ने रावी नदी के तट पर भारतीय ध्वज फहराया, तो बोस ने ब्रिटिश सत्ता को सीधे चुनौती देने के लिए एक समानांतर सरकार बनाने का सुझाव दिया। हालाँकि, उनके प्रस्ताव को कांग्रेस नेतृत्व ने अस्वीकार कर दिया।[xxiii] लाहौर अधिवेशन के बाद, जहाँ कांग्रेस ने आधिकारिक तौर पर पूर्ण स्वराज (पूर्ण स्वतंत्रता) को अपना लक्ष्य घोषित किया, बोस और कई

अन्य वामपंथी नेताओं को उनके कट्टरपंथी विचारों के कारण कांग्रेस कार्य समिति से निष्कासित कर दिया गया। इसके बाद सविनय अवज्ञा आंदोलन के दौरान, बोस को एक बार फिर महात्मा गांधी और जवाहरलाल नेहरू के साथ गिरफ्तार कर लिया गया। उन्हें मध्य प्रांत के सिवनी नामक एक सुदूर स्थान पर कैद किया गया, जहाँ उनका स्वास्थ्य काफी बिगड़ गया, जिसके कारण उन्हें एक साल के भीतर रिहा कर दिया गया।

अपनी रिहाई के बाद, सुभाष चंद्र बोस ने भारत छोड़ दिया और यूरोप भर में व्यापक रूप से यात्रा की, भारत की स्वतंत्रता के लिए अंतर्राष्ट्रीय समर्थन जुटाने के प्रयास में कई देशों का दौरा किया। विदेश में अपने समय के दौरान, उन्होंने "इण्डियान लीग" की स्थापना की, जिसका उद्देश्य भारतीय प्रवासियों को एकजुट करना और विदेशी सरकारों से समर्थन प्राप्त करना था।[xxiii] बोस के बढ़ते प्रभाव से सावधान अंग्रेजों ने भारत में उनके प्रवेश पर प्रतिबंध लगा दिया। हालाँकि, वे 1936 में भारत लौट आए और तुरंत फिर से गिरफ्तार कर लिए गए। उनके खराब स्वास्थ्य के कारण, उन्हें मार्च 1937 में रिहा कर दिया गया। 1938 में, भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस के भीतर सुभाष चंद्र बोस का कद नई ऊंचाइयों पर पहुंच गया जब उन्हें कांग्रेस का अध्यक्ष चुना गया। उनके कार्यकाल के दौरान, सात प्रांतों में कांग्रेस की सरकारें बनीं, लेकिन गांधी सहित पार्टी के भीतर अधिक रूढ़िवादी और उदारवादी नेताओं के साथ उनके बढ़ते मतभेद स्पष्ट हो गए। 1939 में, बोस ने फिर से अध्यक्ष पद के लिए दौड़ लगाई और डॉ. पट्टाभि सीतारमैया को हराया, जो गांधी के पसंदीदा उम्मीदवार थे। हालाँकि, गांधी ने इस हार को एक व्यक्तिगत आघात के रूप में देखा, और बोस को कांग्रेस नेतृत्व से बढ़ते दबाव का सामना करना पड़ा।

आंतरिक संघर्षों के बीच रहने के बजाय, सुभाष चंद्र बोस ने कांग्रेस के अध्यक्ष पद से इस्तीफा दे दिया और "**फॉरवर्ड ब्लॉक**" की स्थापना की, जो अधिक कट्टरपंथी और समाजवादी तत्वों का प्रतिनिधित्व करता था। इस समय तक, बोस कांग्रेस की राजनीतिक विचारधारा और तरीकों, विशेष रूप से अहिंसा के प्रति इसके पालन से असंतुष्ट हो गए थे। उनका मानना था कि स्वतंत्रता प्राप्त करने के लिए सशस्त्र प्रतिरोध सहित अधिक प्रत्यक्ष कारवाई की आवश्यकता थी। सशस्त्र संघर्ष के लिए बोस की इच्छा ने उन्हें विदेशी शक्तियों, विशेष रूप से ब्रिटेन के विरोधियों से समर्थन मांगने के लिए प्रेरित किया। 1941 में, उन्होंने ब्रिटिश निगरानी से एक साहसी भागने की कोशिश की और यूरोप की यात्रा की, जहाँ उन्होंने जर्मनी और अन्य यूरोपीय शक्तियों जैसे नेताओं के साथ गठबंधन करने की कोशिश की। बोस का मानना था कि जर्मनी और जापान के साथ गठबंधन करके, वह भारत में ब्रिटिश शासन के खिलाफ सशस्त्र विद्रोह शुरू करने के लिए आवश्यक सैन्य समर्थन जुटा सकते हैं। यूरोप पहुँचने और अंतर्राष्ट्रीय समर्थन जुटाने के उनके साहसिक कदम ने किसी भी तरह से भारत के लिए स्वतंत्रता प्राप्त करने के उनके दृढ़ संकल्प को दिखाया।[xxiii]

यूरोप में रहते हुए, बोस ने भारत के हित के लिए वकालत करना जारी रखा और भारतीय राष्ट्रीय सेना (INA) के निर्माण के लिए काम किया, जिसने बाद में दक्षिण पूर्व एशिया से अंग्रेजों से लड़ने के उनके प्रयासों में महत्वपूर्ण भूमिका निभाई। स्वतंत्रता के लिए उनके अथक प्रयास और INA में उनके नेतृत्व ने अंततः उन्हें भारत के स्वतंत्रता संग्राम में एक महान व्यक्ति बना दिया, जिन्हें उनके नारे "**तुम मुझे खून दो, और मैं तुम्हें आजादी दूंगा**" और एक स्वतंत्र भारत के लिए उनकी प्रतिबद्धता के लिए याद किया जाता है।[xxiii]

**नेताजी और आई.एन.ए.**

भारत की स्वतंत्रता के सपने को साकार करने के लिए, भारतीय देशभक्तों और जापानी सेना के सामूहिक समर्थन से आज़ाद हिंद फ़ौज (इंडियन नेशनल आर्मी या INA) का गठन किया गया था। यह द्वितीय विश्व युद्ध के दौरान ब्रिटिश साम्राज्य का विरोध करने वाली विदेशी शक्तियों के साथ मिलकर ब्रिटिश शासन को उखाड़ फेंकने की एक व्यापक

रणनीति का हिस्सा था। 16 मई, 1943 को, नेताजी के नाम से लोकप्रिय सुभाष चंद्र बोस टोक्यो पहुँचे, जिसने आई.एन.ए. के इतिहास में एक महत्वपूर्ण मोड़ ला दिया। बोस ने अपने करिश्माई नेतृत्व और स्वतंत्रता के लिए अथक प्रयास के साथ पहले ही यूरोप में प्रभाव डाला था। जापान में, जापानी सरकार के प्रतिनिधि कर्नल यामामोटो ने उनका गर्मजोशी से स्वागत किया। बोस के दृढ़ संकल्प और अंग्रेजों के खिलाफ सहयोग की क्षमता को पहचानते हुए, जापान के प्रधान मंत्री तोजो ने उन्हें जापानी संसद (डायट) को संबोधित करने के लिए आमंत्रित किया। इस बैठक के दौरान, तोजो ने बोस से वादा किया कि जापान ब्रिटिश शासन से भारत की स्वतंत्रता को सुरक्षित करने में मदद करने के लिए हर संभव सहायता प्रदान करेगा।[xxiii]

टोक्यो से नेताजी ने रेडियो के माध्यम से भारतीय लोगों को संबोधित किया, जिसमें उन्होंने एक शक्तिशाली संदेश दिया जिसमें भारत के सामने आने वाली चुनौतियों को समाहित किया गया। उन्होंने ब्रिटिश सेना के खिलाफ सशस्त्र क्रांति आयोजित करने की कठिनाई को स्वीकार किया, जो आधुनिक हथियारों से सुसज्जित थी और भारत के भीतर उसकी मजबूत उपस्थिति थी। इन परिस्थितियों को देखते हुए, बोस ने घोषणा की कि भारत को आज़ाद कराने का भार देश के बाहर रहने वाले भारतीयों के कंधों पर पड़ेगा। उन्होंने इस बात पर ज़ोर दिया कि आज़ाद हिंद फ़ौज के साथ लड़ने और स्वतंत्रता प्राप्त करने में सहायता करने के लिए विशेष रूप से दक्षिण-पूर्व एशिया में रहने वाले भारतीय प्रवासियों की ज़िम्मेदारी है।

2 जुलाई, 1943 को बोस टोक्यो से सिंगापुर पहुँचे। उनके आगमन का इण्डियन इन्डिपेन्डेन्स लीग के सदस्यों, आज़ाद हिंद फ़ौज के सैनिकों और स्थानीय भारतीय समुदाय ने बड़े उत्साह के साथ स्वागत किया। माहौल उम्मीद से भरा हुआ था, क्योंकि लोगों का मानना था कि बोस का नेतृत्व भारत की मुक्ति की कुंजी होगा।

दो दिन बाद, 4 जुलाई, 1943 को सिंगापुर के कैथे सिनेमा हॉल में एक महत्वपूर्ण कार्यक्रम हुआ। एक भव्य समारोह के दौरान, रास बिहारी बोस, जिन्होंने पूर्वी एशिया में भारतीय स्वतंत्रता आंदोलन को संगठित करने में महत्वपूर्ण भूमिका निभाई थी, ने आधिकारिक तौर पर आंदोलन का नेतृत्व सुभाष चंद्र बोस को सौंप दिया। सत्ता के इस प्रतीकात्मक हस्तांतरण ने सुभाष चंद्र बोस को आज़ाद हिंद फ़ौज और पूर्वी एशिया में भारतीय स्वतंत्रता आंदोलन का प्रमुख बना दिया। इस नए नेतृत्व के साथ, नेताजी के दूरदर्शी नेतृत्व में आज़ाद हिंद फ़ौज को गति और स्पष्ट दिशा मिली।

बोस का सिंगापुर आगमन और नेतृत्व संभालना आज़ाद हिंद फ़ौज की गतिविधियों के सबसे तीव्र चरण की शुरुआत थी। बोस अब भारत की आज़ादी के लिए लड़ने के लिए दृढ़ संकल्पित सेना के प्रभारी थे, और उन्होंने सैन्य अभियानों का आयोजन जारी रखा और एक स्वतंत्र भारत के अपने सपने के साथ सैनिकों और नागरिकों दोनों को प्रेरित किया।

**भारतीय स्वतंत्रता के लिए आई.एन.ए. की लड़ाई**

सुभाष चंद्र बोस ने न केवल Indian National Army (आई.एन.ए.) का नेतृत्व किया, बल्कि भारत के स्वतंत्रता संग्राम को मज़बूत करने के लिए इण्डियन इन्डिपेन्डेन्स लीग और आज़ाद हिंद फ़ौज का रणनीतिक रूप से विस्तार और पुनर्गठन भी किया। उनके प्रयासों की परिणति 21 अक्टूबर, 1943 को सिंगापुर में स्वतंत्र भारत की अनंतिम सरकार या आज़ाद हिंद के गठन के रूप में हुई।[xxiii] इस अनंतिम सरकार को, इसके प्रतीकात्मक और परिचालन महत्व के साथ, जापान, जर्मनी और इटली सहित नौ देशों द्वारा मान्यता दी गई थी। इस सरकार के माध्यम से बोस का उद्देश्य भारत से ब्रिटिश साम्राज्यवादी शासन को खत्म करना और पूर्ण संप्रभुता हासिल करना था।

इस अनंतिम सरकार की संरचना इस प्रकार थी ;

- सुभाष चंद्र बोस (नेताजी): राज्य प्रमुख, प्रधानमंत्री, युद्ध और विदेश मंत्री

- रास बिहारी बोस: सर्वोच्च सलाहकार
- श्रीमती लक्ष्मी: महिला संगठन की प्रमुख (झांसी की रानी रेजिमेंट की कप्तान)
- एस. ए. अय्यर: प्रचार और प्रसारण मंत्री
- लेफ्टिनेंट कर्नल ए. सी. चटर्जी: वित्त मंत्री
- के. एन. सरकार: कानूनी सलाहकार[xxiii]

इस सरकार का निर्माण केवल प्रतीकात्मक नहीं, बल्कि व्यावहारिक भी था, क्योंकि इसने अंतर्राष्ट्रीय समर्थन मांगा, सैन्य रणनीति विकसित की और भारत को आज़ाद कराने के लिए एक ठोस प्रयास की तैयारी की। नेताजी सुभाष चंद्र बोस ने सैन्य रणनीति में विशेष रूप से युवाओं को प्रशिक्षित करने के लिए एक व्यापक श्रेणी के रंगरूटों को प्रशिक्षित करने का लक्ष्य रखा। स्वतंत्रता संग्राम में महिलाओं को शामिल करने के महत्व को पहचानते हुए, बोस ने उन्हें झांसी की रानी रेजिमेंट के गठन के माध्यम से सशक्त बनाया, जो कैप्टन लक्ष्मी स्वामीनाथन के नेतृत्व में आई.एन.ए की एक महिला सैन्य शाखा थी, जिन्हें आमतौर पर कैप्टन लक्ष्मी के नाम से जाना जाता था।

जनवरी 1944 में, आज़ाद हिंद फ़ौज और इण्डियन इन्डिपेन्डेन्स लीग के मुख्यालय को रंगून, बर्मा (वर्तमान यांगून, म्यांमार) में स्थानांतरित कर दिया गया। इस स्थानांतरण ने आई.एन.ए को भारत के करीब ला दिया, जिससे वह सीधे ब्रिटिश औपनिवेशिक ताकतों के खिलाफ़ सैन्य अभियानों की योजना बना सके। बोस ने अपने सैनिकों को इस जोशपूर्ण आह्वान से उत्साहित किया ; "**तुम मुझे खून दो, और मैं तुम्हें आज़ादी दूंगा**"।

आई.एन.ए की पहली बड़ी सफलता 4 फरवरी, 1944 को मिली, जब यह बर्मा में **अराकान** मोर्चे पर पहुँची। वहाँ से, आई.एन.ए ने भारत में प्रवेश करने के लिए अपना अभियान शुरू किया, मातृभूमि को आज़ाद कराने के अपने मिशन की घोषणा की और प्रसिद्ध नारा दिया: "**दिल्ली चलो**"।[xxiii] आई.एन.ए के सैनिक भारत को आज़ाद देखने के सपने से प्रेरित थे, और भारत की ओर मार्च ब्रिटिश शासन के तहत असंख्य भारतीयों के लिए आशा का प्रतीक बन गया।

14 अप्रैल, 1944 को एक महत्वपूर्ण क्षण आया, जब आज़ाद हिंद फ़ौज ने भारतीय क्षेत्र मणिपुर के मोइतांग क्षेत्र में भारतीय तिरंगा फहराने में सफलता प्राप्त की। यह जीत मनोबल बढ़ाने वाली थी, जो भारतीय धरती पर सीधे ब्रिटिश शासन को चुनौती देने के आई.एन.ए के इरादे का प्रतीक थी। यह वह मोड़ था जब आई.एन.ए ने खुले तौर पर घोषणा की कि इस क्षेत्र में ब्रिटिश शासन समाप्त हो गया है। हालांकि, यह क्षेत्र जल्द ही ब्रिटिश सेना और आज़ाद हिंद फ़ौज के बीच भीषण लड़ाई का स्थल बन गया, जिसके कारण आई.एन.ए. के अभियान की सबसे भयंकर लड़ाइयाँ हुईं।

4 अगस्त, 1944 को, नेताजी ने रंगून रेडियो पर महात्मा गांधी को संबोधित करते हुए एक भावपूर्ण भाषण दिया। उन्होंने घोषणा की, "**भारत की स्वतंत्रता के लिए अंतिम युद्ध शुरू हो गया है। यह युद्ध तब तक जारी रहेगा जब तक हम भारत से अंतिम अंग्रेज़ को बाहर नहीं निकाल देते और हमारा तिरंगा दिल्ली में वायसराय हाउस पर नहीं फहराता। राष्ट्रपिता! हम भारत की मुक्ति के इस पवित्र युद्ध में आपका आशीर्वाद और शुभकामनाएँ चाहते हैं**।"[xxiii] बोस की गांधी से अपील ने भारतीय संघर्ष की एकता में उनके विश्वास को प्रदर्शित किया, उस व्यक्ति का आशीर्वाद मांगते हुए, जो दृष्टिकोण में मतभेदों के बावजूद, भारतीय स्वतंत्रता आंदोलन के सबसे सम्मानित व्यक्ति बने रहे।

हालांकि अंग्रेजों के खिलाफ़ लड़ाई में आईएनए को गंभीर असफलताओं का सामना करना पड़ा, खासकर जब मित्र देशों की सेनाएँ दक्षिण-पूर्व एशिया में फिर से अपनी ज़मीन हासिल करने लगीं, आज़ाद हिंद फ़ौज की भावना और सुभाष चंद्र बोस के नेतृत्व ने भारतीय मानस पर एक अमिट छाप छोड़ी। आई.एन.ए. के साहसी प्रयासों और एकता और बलिदान के लिए इसके आह्वान ने राष्ट्रवाद की एक लहर को प्रेरित किया जिसने भारत की स्वतंत्रता की ओर अग्रसर होने में महत्वपूर्ण भूमिका निभाई। हालांकि सैन्य हार और उसके बाद 1945 में नेताजी की रहस्यमय परिस्थितियों में मृत्यु ने आई.एन.ए. के प्रत्यक्ष प्रयासों को समाप्त कर दिया, लेकिन आंदोलन की विरासत जीवित रही। युद्ध के बाद आई.एन.ए. अधिकारियों के मुकदमों ने पूरे भारत में व्यापक विरोध प्रदर्शन को जन्म दिया, जिससे भारत पर कब्ज़ा करने के ब्रिटिश संकल्प को और कमज़ोर कर दिया। सुभाष चंद्र बोस के नेतृत्व में आई.एन.ए. की स्वतंत्रता की लड़ाई भारत के स्वतंत्रता संग्राम के इतिहास में सबसे महत्वपूर्ण अध्यायों में से एक है, जो राष्ट्र की संप्रभुता के लिए अंतिम बलिदान और अमर भावना को दर्शाता है।

**आई.एन.ए. की उपलब्धियाँ**

हालाँकि आज़ाद हिंद फ़ौज भारत में ब्रिटिश शासन को उखाड़ फेंकने के अपने प्राथमिक लक्ष्य को प्राप्त नहीं कर पाई, फिर भी इसने भारतीय स्वतंत्रता आंदोलन में महत्वपूर्ण योगदान दिया। आई.एन.ए के कार्यों ने एक स्थायी विरासत छोड़ी जिसने कई प्रमुख तरीकों से भारत के स्वतंत्रता संग्राम के पाठ्यक्रम को प्रभावित किया…….

- भारतीय सैनिकों के बारे में ब्रिटिश धारणा में बदलाव:

INA के संघर्ष के सबसे महत्वपूर्ण परिणामों में से एक भारतीय सैनिकों के प्रति ब्रिटिश दृष्टिकोण में बदलाव था। INA के विद्रोह से पहले, ब्रिटिश भारतीय सैनिकों की वफादारी पर बहुत अधिक निर्भर थे, उन्हें एक विश्वसनीय और आज्ञाकारी भाड़े का बल मानते थे। हालाँकि, आई.एन.ए में हजारों भारतीय सैनिकों की भागीदारी, उनके औपनिवेशिक शासकों के खिलाफ लड़ने से इस भरोसे की नींव हिल गई। अंग्रेजों को एहसास हुआ कि भारतीय सैनिकों पर अब बिना किसी सवाल के साम्राज्य की सेवा करने के लिए भरोसा नहीं किया जा सकता। इस बढ़ते अविश्वास ने भारत पर ब्रिटिश पकड़ को कमजोर कर दिया और देश से वापस जाने के अंतिम निर्णय में योगदान दिया।

- राष्टीय एकता को बढ़ावा देना:

भारतीय स्वतंत्रता संग्राम के दौरान सांप्रदायिक एकता को बढ़ावा देने में आई.एन.ए ने महत्वपूर्ण भूमिका निभाई, जो भारत की धार्मिक विविधता को देखते हुए अत्यंत महत्वपूर्ण कारक है। सेना में हिंदू, मुस्लिम, सिख और अन्य सहित विभिन्न धार्मिक पृष्ठभूमि के सैनिक शामिल थे, जो सभी एक ही दुश्मन: ब्रिटिश साम्राज्यवाद के खिलाफ़ एक साथ लड़ रहे थे। प्रतिकूल परिस्थितियों में इस सामूहिक प्रयास ने सांप्रदायिक विभाजन को एकजुटता करने में मदद की और राष्ट्रीय एकता की एक मिसाल कायम की, जिसकी स्वतंत्रता आंदोलन के दौरान बहुत ज़रूरत थी। आई.एन.ए ने दिखाया कि भारतीय, चाहे किसी भी धर्म के हों, स्वतंत्रता के साझा उद्देश्य के लिए एकजुट हो सकते हैं।

- महिलाओं का सशक्तिकरण:

झांसी की रानी रेजिमेंट, आज़ाद हिंद फ़ौज की एक महिला ब्रिगेड, भारतीय महिलाओं के लिए बहुत बड़ी प्रेरणा का स्रोत थी। साहसी स्वतंत्रता सेनानी रानी लक्ष्मी बाई के नाम पर, इस रेजिमेंट का नेतृत्व कैप्टन लक्ष्मी स्वामीनाथन (कैप्टन

लक्ष्मी) ने किया था। रेजिमेंट में महिलाओं ने पारंपरिक लैंगिक भूमिकाओं को तोड़ते हुए सैन्य अभियानों और नेतृत्व में सक्रिय रूप से भाग लिया। इन महिलाओं द्वारा प्रदर्शित बहादुरी और दृढ़ संकल्प ने कई भारतीय महिलाओं को ब्रिटिश शासन के खिलाफ लड़ाई में अधिक सक्रिय भूमिका निभाने के लिए प्रोत्साहित किया, जिससे पता चला कि वे भी सशस्त्र प्रतिरोध के माध्यम से भारत की स्वतंत्रता के लिए योगदान दे सकती हैं।

- भारतीय प्रवासियों के लिए प्रेरणा:

भारतीय प्रवासियों को संगठित करने में भी आई.एन.ए ने महत्वपूर्ण भूमिका निभाई। विदेशों में रहने वाले भारतीय, विशेष रूप से दक्षिण पूर्व एशिया में, आज़ाद हिंद फ़ौज के साहस और दृढ़ संकल्प से बहुत प्रेरित थे। कई प्रवासियों ने INA के उद्देश्य के लिए वित्तीय सहायता, जनशक्ति और रसद सहायता की पेशकश की। इस आंदोलन ने विदेशों में भारतीयों के लिए एकता और उद्देश्य की भावना प्रदान की, जिससे उनकी मातृभूमि में स्वतंत्रता की लड़ाई से उनका जुड़ाव फिर से जग गया। यह प्रभाव सैन्य कार्रवाई से परे फैल गया, जिसने भारतीय प्रवासियों के बीच राष्ट्रवादी भावना को प्रेरित किया और समग्र स्वतंत्रता आंदोलन को मजबूत किया।

**आई.एन.ए और कांग्रेस**

आज़ाद हिन्द फौज अग्रेजों से किए जा रहे युद्ध को कांग्रेस पार्टी के जरा भी समर्थन नहीं किया। गांधी के अलावा कांग्रेस के सबसे बड़े नेता जवाहरलाल नेहरू भी सुभाष चंद्र बोस के विचार से सदैव असहमत रहे। जब जवाहरलाल नेहरू से जब यह पूछा गया कि यदि जर्मनी जापान के सहयोग से भारत पर मुक्ति सेना हमला किया तो वह क्या करेंगे ? नेहरू ने इसका जोरदार जवाब दिया; हिटलर और जापान नरक में जाए। मैं उनसे अंत तक लड़ूँगा और यही मेरी नीति है। अगर जापान से भारत आती है तो मैं जापान सेना के साथ-साथ सुभाष चन्द्र बोस और उनकी पार्टी से भी लड़ूँगा ।"[xxiii] वर्ष 1945 के मध्य तक नेहरू का यही कहना था कि " आई.एन.ए के नेता ओर अन्य लोग गुमराह हो गए थे ओर जापानियों के साथ अपने दुर्भाग्यपूर्ण संबंध के बडे परिणामों को समझने में विफल रहे थे, इसलिए इन लोगों का उद्देश्य जो भी हो, उनका भारत में या बाहर विरोध किया जाना चाहिए। किन्तु आश्चर्य की घटना यह कि कुछ समय पश्चात् ही, जब आई.एन.ए विरुद्ध लाल किला मुकदमें के तहत कोर्ट मार्शन हेतु प्रक्रिया चल रही थी, तब नेहरू ने अपने वकील की पोशक पहनी और शाह नवाज़, सहगल, ढिल्लो का बचाओ करने पहुच गए । वास्तविकता तो यह 1942 से ने भारत छोड़ो आन्दोलन के शुरुआत और इसके कठोरता पूर्वक दमन तक कांग्रेसी नेताओं की रणनीती गलत रही।[xxiii] 'आज़ति हिन्द फौज' के कैदियों के प्रति भारतीय जनमानस का उपर समर्थन दखते हुए अपनी राजनीतिक सुविधा के लिए काग्रेस इसने कैदियों के बचाओ में आ खड़ी हुई थी। यही नहीं कांग्रेस ने आई.एन. ए राहत समिति गठन किया और इसके कैदियों की तत्काल रिहाई और दोसमुक्ति के प्रस्ताव को भी मजूरी दी। परन्तु तब भारत की स्वतंत्रता के महान उद्देश्य के लिए गठित सघर्ष समिति के लिया बहुत देर हो चुकी थी।

सैन्य हार का सामना करने के बावजूद, आई.एन.ए की उपलब्धियाँ युद्ध के मैदान से आगे तक फैली हुई थीं। इसने भारतीयों में राष्ट्रवाद और एकता की गहरी भावना को प्रेरित किया, ब्रिटिशों के प्रति भारतीय सैनिकों की वफादारी पर सवाल उठाया और 1947 में भारत की अंततः स्वतंत्रता के लिए आधार तैयार किया। सुभाष चंद्र बोस और आई.एन.ए. की विरासत उन लोगों के बलिदान और दृढ़ संकल्प का प्रमाण है, जिन्होंने स्वतंत्र भारत के सपने के लिए भारी बाधाओं के खिलाफ लड़ाई लड़ी।

***

## Advisory Board (India)

**Delhi**

- **Dr. Fayaz Alam –** Delhi
- **Shakeeba Umar –** Delhi
- **Prof. (Dr.) Qazi Obaid ur Rehman Hashmi –** Ex-Head, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, Delhi
- **Prof. (Dr.) Khalid Mahmood –** Ex-Head, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, Delhi

---

**Kolkata**

- **Dr. Naushad Momin –** Kolkata

---

**Allahabad**

- **Dr. Danish Allahabadi –** Allahabad

---

**Muzaffarpur**

- **Prof. Aale Zafar –** Muzaffarpur

---

**Araria**

- **Deen Raza Akhtar –** Araria
- **Dr. Muhammad Shahzad Shams –** Araria

---

**Munger**

- **Dr. Zain Shamsi –** Munger

---

**Purnia**

- **Maulana Rizwan Nadvi –** Purnia

---

**Patna University**

- **Dr. Muhammad Mahmood Alam** – Department of Persian, Patna University

- **Dr. Muhammad Abul Kalam Azad –** Department of Persian, Patna University

**Aligarh Muslim University**
- **Prof. Jahangeer Ahmad Warsi –** Aligarh Muslim University

**Lucknow University**
- **Prof. Abbass Raza Nayyar –** Head, Department of Urdu, Lucknow University

**Amravati (Maharashtra)**
- **Wasim Farhat Alig –** Amravati, Maharashtra

# Advisory Board (International)

**EG Egypt**
- **Professor Ahmad Al-Qazi –** Cairo University, Egypt
- **Professor Yusuf Amir –** Cairo University, Egypt
- **Dr. Hajra Qadri Muhammad –** Department of Urdu Language and Literature, College of Humanities, Al-Azhar University, Cairo

**TR Turkey**
- **Professor Halil Toker –** Istanbul University
- **Professor Durmuş Bulgur –** Istanbul University
- **Dr. Zekai Kardas –** Istanbul, Turkey
- **Dr. Ali Bayat –** Istanbul, Turkey

**IR Iran**
- **Dr. Muhammad Qayoomersi –** Tehran University, Iran

**TJ Tajikistan**
- **Professor Dr. Haider Qurbanoof –** Chairman, Department of Urdu, Tajikistan University

**PK Universities in Pakistan**
**University of Sindh, Jamshoro**
- **Professor Yusuf Khushk**
- **Professor Sofia Khushk**
- **Professor Ziaul Hassan**

**National University of Modern Languages (NUML), Islamabad**

- **Dr. Saima Nazir** – Assistant Professor, Department of Urdu Language & Literature
- **Professor Dr. Ambreen Tabassum** – Department of Urdu
- **Professor Dr. Fouzia Aslam** – Department of Urdu
- **Dr. Samina Siddiqui** – Department of Urdu
- **Dr. Sobia Saleem** – Department of Urdu
- **Dr. Nazia Malik** – Department of Urdu

**Federal Urdu University of Arts, Science & Technology, Islamabad**

- **Professor Dr. Waseem Anjum** – Department of Urdu
- **Dr. Fehmida Tabassum** – Head, Department of Urdu

**International Islamic University, Islamabad**

- **Dr. Ghazal Yaqub** – Department of Urdu

**Government College University (GCU), Faisalabad**

- **Dr. Abdul Aziz Malik** – Department of Urdu
- **Dr. Sumaira Akbar** – Department of Urdu
- **Professor Dr. Tariq Mahmood** – Department of Urdu
- **Professor Dr. Saeed Ahmad** – Department of Urdu
- **Professor Dr. Parveen Akhtar Kallu** – Department of Urdu
- **Dr. Majid Mushtaq** – Department of Urdu

**Government College Women University, Faisalabad**

- **Professor Dr. Sadaf Naqvi** – Head, Department of Urdu

**GC Women University, Sialkot**

- **Dr. Rifaat Chaudhry** – Department of Urdu

**Bahauddin Zakariya University, Multan**

- **Professor Dr. Farzana Koukab** – Chairperson, Department of Urdu
- **Dr. Muhammad Khawar Nawazish** – Department of Urdu
- **Dr. Muhammad Asif** – Department of Urdu
- **Dr. Shazia Umbrin** – Department of Urdu
- **Dr. Hammad Rasool** – Department of Urdu

**University of Sargodha**

- **Professor Dr. Aamir Sohail** – Chairman, Department of Urdu
- **Dr. Samira Ijaz** – Department of Urdu

**Hazara University, Mansehra**

- **Professor Dr. Nazar Abid** – Chairman, Department of Urdu

**University of Peshawar**

- **Professor Dr. Robina Shaheen** – Department of Urdu

**Government College University, Lahore**

- **Dr. Muhammad Salman Bhatti** – Department of Urdu

**Other Pakistani Scholars / Writers / Journalists**

- **Professor Sameena Gul** – Pakistan
- **Uzma Noreen** – Pakistan
- **Dr. Rehana Kausar** – Pakistan
- **Farzana Azam Lutfi** – Pakistan
- **Ayesha Masood** – Journalist, Islamabad
- **Professor Dr. Nasir Abbas Nayyar** – Director General, Urdu Science Board, Lahore

**Legal Advisors**

Advocate Anil Kumar Singh, Advocate Seema Singh (Delhi)

## Editorial Board

| Name | Department / Designation |
|---|---|
| Prof. Nadeem Ahmad | Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi |
| Prof. Mohammad Kazim | Department of Urdu, University of Delhi, Delhi |
| Prof.Dr. Ahmad Imtiyaz | Department of Urdu, University of Delhi, Delhi |
| Dr. Mohammad Mohsin | Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi |
| Prof. Mohammad Raziur Rahman | Head, Department of Urdu, Gorakhpur University, Gorakhpur |

| | |
|---|---|
| Prof. Mohammad Ali Johar | Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh |
| Prof. Mohammad Qamar-ul-Huda Faridi | Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh |
| Prof. Kausar Mazhari | Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi |
| Prof. Imran Andaleeb | Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi |
| Prof. Azra Abidi | Department of Sociology, Jamia Millia Islamia, New Delhi |
| Dr. Sajjad Ahmad | Department of Education, Jamia Millia Islamia, New Delhi |
| Prof. Dr. Mushtaq Alam Qadri | Department of Urdu, University of Delhi, Delhi |
| Prof. Dr. Saifuddin Ahmad | Department of History, University of Delhi, Delhi |
| Prof. Dr. Balram Shukla | Department of Sanskrit, University of Delhi, Delhi |
| Prof. Aftab Ahmad Afaqi | Department of Urdu, Banaras Hindu University, Banaras |
| Prof. Dr. Shahid Razmi | Head, Department of Urdu, Munger University, Bihar |
| Prof. Pramod Kumar Bharti | Department of Sanskrit, Municipal PG College, Mussoorie, Uttarakhand |
| Dr. Qazi Naveed | Head, Department of Urdu, Maulana Azad College of Arts, Science & Commerce, Aurangabad, Maharashtra |
| Mr. Qaiser Raza | Education Officer, Government of Jharkhand |
| Mohammad Rafi | State Convener, National Teachers' Organization, Bihar |
| Principal, Madrasa Yateem Khana, Araria | |
| Kirori Mal College, University of Delhi | |
| Department of Urdu, Ghazi University, Ghazi Khan | |
| Department of Urdu, Ghazi University, Ghazi Khan | |
| Department of Urdu, For Women University | |
| Maulana Mohammad Shahid Adil Qasmi | Minhaj University |
| Dr. Mujeeb Ahmad Khan | |
| Dr. Nadeem Ahmad | |
| Dr. Abid Qureshi | |
| Dr. Mohammad Syed Ali | |
| Prof. Dr. Azmat Rabbab | |
| Prof. Dr. Fazilat Bano | |

Prof Dr. Shazra Hussain Shar

Chairperson, Department of Urdu, University of Sindh, Jamshoro

**Subscription Rates:**

3000Special Issue: 1000Per Issue:
25000Special Support: 15000Annual:

**Bank Details:**

**PEACE INDIA FOUNDATION**
*Account No.* — **51521131001918**
*IFSC Code* — **PUNB515210**

Published and printed by
**Professor Dr. Md Yahya Saba**
at JK Offset Printing Press and distributed from:
2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-110007

**Patron-in-Chief:**

Professor Irteza Karim

Professor Rakesh Kumar Pandey (Department of Physics, Kirori Mal College, Delhi University)

Quarterly

Delhi

**Volume: 7** **October to December 2025** **Issue: 4**

**Editor**

**Prof. Dr. Md. Yahya Saba**

**Sub-Editor**

**Md. Rameez Raza**

Research Scholar, Department of Urdu, Kirori Mal College, University of Delhi, Delhi

**Managing Editor**

**Dr. Md. Talib**

**Associate Editor**

**Dr. Md. Bahlul**

**Technical & Artistic Sub-Editor**

**Md Shahid Raza Misbahi**

**Correspondence & Contact Details**

**Journal: Quarterly Tareekh-e-Adab-e-Urdu**

**Address: 2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi – 110007**

**Mobile No: +91- 9968244001** **Website: tareekheadabeurdu.com** **E-mail: editortau@gmail.com**

**Disclaimer:**

The editor and associates are not necessarily in agreement with the content of this issue. Authors are solely responsible for their articles and citations. Any disputes related to "Tareekh-e-Adab-e-Urdu" are subject to Delhi jurisdiction only.

Quarterly

Delhi

# TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

(Representative of Knowledge, Literature, Research, and Criticism)

**Volume: 7** **October to December- 2025** **Issue: 4**

Editor

UGC Care Listed International Peer Reviewed Interdisciplinary Refereed Journal, ISSN: 2582-1229/E-ISSN 2582-9157

# Prof. Dr. Md Yahya Saba

October to December,2025 Vol.07 Issue 04, ISSN 2582-1229,E-ISSN 2582-9157

Quarterly

# Tareekh e Adab e Urdu

Delhi

Editor:Prof.Dr.Md. Yahya Saba

Oct to Dec

2025

Vol.07 Issue 04

UGC Care Listed
International Peer Raviewed
Refreed Journal

Web Site
www.tareekheadabeurdu.com